میرے قبیلے کے لوگ

(انٹرویوز / مضامین)

خالد سہیل

میرے قبیلے کے لوگ

(انٹرویوز اور مضامین)

میرے قبیلے کے لوگ

(انٹرویوز اور مضامین)

خالد سہیل

کریٹیو لِنکس
کینیڈا

مصنف : خالد سہیل

کتاب : میرے قبیلے کے لوگ

اشاعت : ۱۹۹۸

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۲۰۰ روپے

کمپوزنگ : شیخ محمد یوسف
کہکشاں گرافکس، دہلی

مطبع : ایرانین آرٹ پرنٹرس، دہلی

ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج، دہلی۔ ۲

MERE QABEELE KE LOG *(Interviews and essays)* **1998**

Dr. KHALID SOHAIL Rs.200/-

P-6, 100 white Oaks Crt Whitby

Ontario Canada LIP 1B7

مہاجر پرندوں

کے

نام

میرے قبیلے کے لوگ ۔ ۱

انٹرویوز

میرے قبیلے کے لوگ ۔ ۲

مضامین

تخلیقی عمل
اور
مہاجر ادیب

literary Encounters کا دیباچہ

تخلیق : خالد سہیل

تلخیص و ترجمہ : عطیہ جعفری/خالد سہیل

تعارف

تخلیقی عمل اور تخلیقی شخصیتیں ہمیشہ سے ماہرینِ نفسیات اور ماہرینِ عمرانیات کے لیے دلچسپی کا باعث رہی ہیں۔ ایک مشہور مؤرخ -Arnold Toyn bee اپنے مضمون ''کیا امریکہ اپنی تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والی اقلیت کو نظر انداز کر رہا ہے؟'' میں لکھتا ہے ''کسی بھی معاشرے کے لیے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما کرنا زندگی اور موت کا سوال ہے اور یہ عمل تخلیقی شخصیتیں سرانجام دیتی ہیں جن پر پوری انسانیت کے مستقبل کا دارومدار ہے''

ایک انسانی نفسیات اور ادب کے طالب علم اور ایک مہاجر ہونے کی حیثیت سے میں بھی تخلیقی عمل اور تخلیقی صفات کے حامل انسانوں پر ان کے ماحول اور ہجرت کے اثرات کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ شمالی امریکہ میں آبسنے کے بعد جہاں ایک طرف میری ایسے مہاجروں سے ملاقات ہوئی ہے جنہیں ہجرت کے تجربے نے تنہا اور دکھی بنا دیا ہے تو دوسری طرف میرا واسطہ ایسے مہاجروں

سے بھی پڑا ہے جن کی ذاتی، خاندانی، معاشرتی اور فنکارانہ زندگیاں ہجرت کے بعد سنور گئی ہیں۔ پچھلے چند سالوں سے میں یہ سوچتا رہا ہوں کہ عین ممکن ہے کہ مہاجر ادیبوں کے انٹرویوز تخلیقی عمل اور ہجرت کے سفر کے باہمی رشتوں کے خفیہ گوشوں پر روشنی ڈالیں اور ہمارا ان پہلوؤں سے تعارف کروائیں جواب تک ہماری نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ اسی خیال سے میں نے ایک سوالنامہ تیار کیا اور جنوب میں بسنے والے اردو کے بہت سے ادیبوں کو بھیج دیا۔ کئی مہینوں کے انتظار کے بعد جب صرف حمیرا رحمان اور عرفانہ عزیز کے جواب موصول ہوئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرا تجربہ ناکام رہا ہے لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور فیصلہ کیا کہ میں خود ان ادیبوں کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور ان کے انٹرویو لوں گا۔

چنانچہ جون ۱۹۹۰ء میں جب میں یورپ کا سفر کر رہا تھا تو میں نے فرانس میں ابرار الحسن اور جرمنی میں منیر الدین احمد کے تفصیلی انٹرویو ٹیپ کر لیے اور خوشی خوشی انہیں واپس کینڈا لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ ان انٹرویوز کو ٹیپ سے کاغذ پر اتارنا بہت آسان ہو گا لیکن جب میری کینڈین سیکرٹری نے مجھے وہ انٹرویوز ٹائپ کر کے دکھائے تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اردو ادیبوں اور کتابوں کے ناموں سے بالکل ناواقف تھی۔ چنانچہ ان دو انٹرویوز کو تیار کرنے میں مجھے دو مہینے لگ گئے اور مجھے اپنے مسائل اور وسائل کا اندازہ ہو گیا۔ اس پہلے مرحلے کو سر کرنے کے بعد میں نے ان ادیبوں کے انٹرویوز لینے شروع کیے جو ٹورانٹو، کنگسٹن، آٹوا، مونٹریال اور نیویارک میں رہتے تھے کیونکہ ان تک میری رسائی آسان تھی۔ جب میں حمیرا رحمان کا انٹرویو لینے نیویارک گیا تو خوش قسمتی سے انہی دنوں افتخار عارف لندن سے آئے ہوئے تھے چنانچہ انہیں بھی انٹرویو کرنے کا موقع مل گیا۔

جب میں نے انٹرویو لینے شروع کیے تھے تو میرے پاس ادیبوں کی

فہرست طویل تھی لیکن ایک سال کی محنت اور بارہ انٹرویوز کی مشقت کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر میں نے اس سلسلے کو وہیں نہ روکا تو میں اس پروجیکٹ کو کبھی بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکوں گا۔ چنانچہ میں کینڈا کے عبدالقوی ضیاء اور عرفانہ عزیز، امریکہ کے سلمان اختر، طلعت اشارت اور محمد عمر میمن، انگلینڈ کے ساقی فاروقی، قیصر تمکین اور مشتاق احمد یوسفی اور بہت سے دیگر اہم ادیبوں کے انٹرویو نہ لے سکا۔ ان انٹرویوز کی عدم موجودگی میری کم ہمتی اور محدود وسائل کی آئینہ دار ہے نہ کہ ان کی ادبی خدمات کی جن سے میں بہت متاثر ہوں۔

میں نے ہر انٹرویو میں یہ کوشش کی ہے کہ پڑھنے والوں کا ادیب سے بھرپور تعارف ہو سکے اور اس ادیب کے اپنے تخلیقی سفر کے ساتھ ساتھ ہجرت کے سفر کے بارے میں بھی خیالات واضح ہو سکیں۔ ویسے تو ان ادیبوں نے زندگی، ادب اور ہجرت کے بیسیوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لیکن میں نے ان کے تجربات اور مشاہدات کو مندرجہ ذیل موضوعات تلے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے:

ا۔ تخلیقی عمل کی ماہیت

ب۔ تخلیقی عمل اور ادب

ج۔ تخلیقی عمل اور ادیب کی ذاتی زندگی

د۔ تخلیقی شخصیت

س۔ تخلیقی عمل اور ادیب کی معاشرتی زندگی

ک۔ تخلیقی عمل اور ہجرت کا سفر

و۔ تخلیقی عمل اور عورتیں

۱۔ تخلیقی عمل کی ماہیت

تعریف :۔ تخلیقی عمل کی چند الفاظ میں تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ ڈکشنری میں تو "بنانے کا عمل یا وجود میں لانے کا عمل" لکھا ہے لیکن جب ہم مختلف ماہرین کی تحریریں پڑھتے ہیں تو ہم پر اس پیچیدہ عمل کے مختلف پرت واضح ہوتے ہیں۔

کارل روجرز (Carl Rogers) لکھتے ہیں "تخلیقی عمل کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسی چیز معرضِ وجود میں آئے جسے ہم اپنے حواس سے چھو سکیں۔ ہمارے خواب اور خیال اس وقت تک تخلیقی عمل نہیں بنتے جب تک وہ نظم، موسیقی، تصویر یا مجسمے کا روپ نہ دھار لیں (۲)

گرین ایکر (Greenacre) لکھتی ہیں "میرے لیے تخلیقی عمل ایک نئی اور متنوع چیز کو وجود میں لانے کا عمل ہے" (۳)

رولو مے (Rollo May) کہتے ہیں "تخلیقی عمل انسانوں کی حیاتِ جاوید حاصل کرنے کی کوشش کا مظہر ہے جس میں بچپن کی معصومیت اور جوانی کا جوش اور جذبہ آپس میں بغلگیر ہو جاتے ہیں اور موت کے بعد بھی زندہ رہنے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں" (۴)

تخلیقی عمل کے بارے میں نظریات

پچھلی ایک صدی میں مختلف ماہرین نے تخلیقی عمل کے بارے میں مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ جوزف وَالس (Joseph Wallace) نے جو نظریہ 1926 میں پیش کیا تھا وہ کافی مقبول ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ تخلیقی عمل چار مراحل پر مشتمل ہے۔

پہلا مرحلہ : تیاری

دوسرا مرحلہ : داخلی ارتقا

تیسرا مرحلہ : بصیرت

چوتھا مرحلہ : نظر ثانی

کیتھرین پیٹرک (Catherine Patrick) نے اپنی کتاب What is Creative Thinking میں ان مراحل کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ پہلے مرحلے میں فنکار اپنے موضوع کے بارے میں تحقیق کرتا ہے اور جو مواد پہلے سے موجود ہے اسے جمع کرتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں وہ داخلی طور پر اس موضوع پر غور و خوض کرتا ہے اور اپنے خیال کی نشوونما کرتا ہے تیسرے مرحلے میں اسے اچانک ایک نئی بصیرت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کا تخلیقی اظہار کرتا ہے اور چوتھے مرحلے میں وہ اپنی تخلیق پر اس وقت تک نظر ثانی کرتا رہتا ہے جب تک کہ وہ دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار نہیں ہو جاتی۔ کیتھرین کا کہنا ہے کہ اکثر اوقات یہ چاروں مراحل آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔"(۵)

فرائڈ (Freud) اپنی تحریروں میں تخلیقی عمل کا تصوراتی زندگی اور دن کو خواب دیکھنے کے عمل سے مقابلہ کرتا ہے وہ تخلیقی شہ پارے میں فنکار کی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل ہوتے دیکھتا ہے اور تخلیقی سوچ کا لاشعور کی جبلی سوچ (Primary Process Thinking) سے گہرا رشتہ جوڑتا ہے۔ فرائڈ کے خیال میں تخلیقی سوچ کا نیورس (Neurosis) سے بھی گہرا تعلق ہے کیونکہ دونوں انسان کی جبلی خواہشات کی تکمیل اور نفسیاتی تضادات کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرائڈ کے نظریے کے مطابق تخلیقی سوچ کا جبلی خواہشات اور لاشعور سے گہرا رشتہ ہے۔(۴)

ایریٹی (Arieti) کے خیال میں تخلیقی عمل میں لاشعور کی جبلی سوچ (Pri-

(Secondary Pro- اور شعور کی منطقی سوچ (Primary Process Thinking)
cess Thinking) آپس میں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور ان کے
ساحرانہ امتزاج (Magic Synthesis) سے ایک نئی سوچ ابھرتی ہے جسے وہ
(Tertiary Process Thinking) کا نام دیتا ہے۔

پرنکاس نوئے (Princhas Noy) کا کہنا ہے کہ تخلیقی سوچ میں انسانی ذات کے جذباتی تجربات خارج کے معروضی حقائق سے مل کر فنونِ لطیفہ کو جنم دیتے ہیں اس طرح حقیقت اور خواب ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔
(Ref. 6, P. 743)

ابرار حسن نے اپنے انٹرویو میں اپنے ذاتی تضادات اور تخلیقی اظہار کے رشتے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں "میرے خیال میں تخلیقی عمل اور تضادات میں گہرا رشتہ ہے۔ جب میں کینڈا آیا تو میری زندگی میں مشرقی نظریات اور مغربی انداز میں تضادات پیدا ہوئے اور جب بھی میرے ذہن اور قلب نے ان تضادات کا حل تلاش کیا تو اس عمل نے شاعری کے روپ میں اپنا اظہار کیا۔ میری شاعری نے میری ذہنی اور جذباتی زندگیوں میں ایک رشتہ قائم کر رکھا ہے اور میرے فن نے میرے تضادات سے استفادہ کیا ہے۔

کرس (Kris) کا خیال تھا کہ تخلیقی عمل کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے جس کا نفسیاتی تضادات سے کوئی تعلق نہیں اس کا کہنا تھا کہ فنونِ لطیفہ تخلیقی اظہار کا صرف ایک رخ ہیں انسان کی تخلیقی صلاحیتیں سائنس کی ایجادات کا روپ بھی دھار سکتی ہیں، زندگی کے مسائل کا حل بھی تلاش کر سکتی ہیں اور ایک بہتر زندگی گزارنے میں مدد بھی کر سکتی ہیں۔ (Ref. 1, P. 25)

ینگ (Jung) جب تخلیقی عمل کا ذکر کرتا ہے تو وہ جمالیات پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے۔ وہ تخلیقی عمل کا انسانی شخصیت اور ذات کے اس حصے سے رشتہ

تلاش کرتا ہے جسے وہ اجتماعی لاشعور (Collective Unconscious) کا نام دیتا ہے۔ وہ آرکی ٹائپز (Archetypes) کا بھی ذکر کرتا ہے جو اس کی نگاہ میں زندگی میں معنی پیدا کرنے کے لیے مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔

فلس گرین ایکر (Phyllis Greenacre) نے فنکار کی شخصیت کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے ان کا خیال ہے کہ فنکار مادی اشیاء اور انفرادی رشتوں سے قطع تعلق کر کے پوری دنیا سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے اس کے لیے اپنے دوستوں، محبوبوں اور رشتہ داروں کی نسبت اجتماعی سامعین، قارئین اور ناظرین زیادہ اہم ہو جاتے ہیں اس لیے اس کی وفاداریاں ذاتی رشتوں کی نسبت بنی نوع انسان کے ساتھ زیادہ ہوتی ہیں۔ (Ref 1, P 25)

ایڈلر (Alder) کا خیال تھا کہ تخلیقی عمل کا تعلق احساسِ کمتری سے ہے۔ فنکار اپنی کم مائگی کے احساس کو فنونِ لطیفہ اور سائنسی ایجادات میں ڈھال دیتا ہے اور اس طرح اپنی کمزوریوں پر فتح حاصل کر لیتا ہے۔ (Ref 11, P 34)

ماہرین کی ان آرا سے صاف واضح ہے کہ تخلیقی عمل انسان کی داخلی اور خارجی زندگیوں کے درمیان ایک پل کا کام کرتا ہے۔

ب۔ تخلیقی عمل اور ادب

مختلف ادیبوں سے انٹرویو لیتے ہوئے اور ان کے تخلیقی تجربات کی روداد سنتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا تخلیقی ریاض ان کی شخصیات کے ساتھ ساتھ ان اصناف کا بھی آئینہ دار تھا جن میں وہ اپنا تخلیقی اظہار کرتے ہیں۔ شعر لکھنے والوں، افسانے، ڈرامے اور ناول تخلیق کرنے والوں اور تراجم کرنے والوں کے تجربات ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ ان کی کہانیاں سن کر مجھے اپنی نانی اماں یاد آ گئیں جو کہا کرتی تھیں کہ گاؤں کے لوگوں کے لیے پانی حاصل کرنے کے تین طریقے ہیں۔

بعض لوگ اپنے گھر کے صحن میں کنواں کھودتے ہیں۔ وہ ہفتوں کی محنت اور کھدائی کے بعد پانی کی سطح پر پہنچتے ہیں اور پھر انہیں ہر روز رسی اور بالٹی کے ذریعے پانی نکالنا پڑتا ہے۔

بعض لوگ کنواں کھودنے کی بجائے اپنی بالٹی لے کر کئی میل کا سفر طے کرتے ہیں اور دریا سے پانی لے کر آتے ہیں۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو نہ تو کنواں کھودتے ہیں اور نہ ہی دریا تک جاتے ہیں۔ وہ بارش کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ انہیں محنت سے زیادہ انتظار کرنا پڑتا ہے ان کا موسم پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ مہینوں بارش نہیں ہوتی اور جب ہوتی ہے تو طوفان آجاتا ہے۔

میری نگاہ میں شاعر وہ فنکار ہیں جو بارش کا انتظار کرتے ہیں، افسانہ نگار دریا سے جاکر پانی لاتے ہیں اور ناول نگار اپنے صحن میں کنواں کھودتے ہیں۔

بعض شاعر خوش قسمت ہیں ان کے ہاں اکثر بارش ہوتی رہتی ہے لیکن فاروق حسن اور حمیرا رحمان جیسے شاعروں کو انتظار کرنا پڑتا ہے اور بعض دفعہ انتظار کی شدت انہیں پریشان کردیتی ہے۔ انہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں اپنے قریبی دوست۔ اپنی تخلیقی شخصیت سے کافی عرصے سے کوئی پیغام نہ آیا ہو۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنی تخلیقی صحت کے بارے میں فکر مند ہوجاتے ہیں۔ حمیرا رحمان تو دعائیں مانگتی ہیں اور تخلیقی لمحوں کا انتظار کرتی ہیں۔ ان کی باتیں سن کر گاؤں کے وہ لوگ یاد آتے ہیں جو قحط کے دوران بارش کی دعائیں مانگتے ہیں۔ تخلیقی بارش اور نظم یا غزل کی آمد سے پہلے حمیرا رحمان اپنے قلب اور ذہن میں ایک بے چینی اور بے قراری محسوس کرتی ہیں۔ انہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ روحانی طور پر دردِ زہ کے مراحل سے گزر رہی ہوں۔ جب فاروق حسن پر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ دو دو تین تین نظمیں بھی تخلیق کرلیتے ہیں۔

بعض شاعروں کے لیے وہ بارش بالکل غیر متوقع ہوتی ہے۔ نہ بادل گرجتے ہیں نہ بجلی کڑکتی ہے اور وہ اچانک اپنے سراپا کو بھیگا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ اشفاق حسین اور افتخار عارف کے تجربے کچھ اسی نوعیت کے تھے۔ وہ تجربات جنہوں نے دو خوبصورت نظموں کا روپ دھارا۔

جب میں نے اشفاق حسین سے ان کی نظم ''محبت کی ایک نظم اپنے بیٹے کے نام'' کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگے

''میں نے جو نظم اپنے بیٹے کے لیے لکھی تھی وہ ایک ذاتی نوعیت کی نظم ہے میں اپنے بچے کے ساتھ دو تین سال گزار چکا تھا پھر ایک دن جب میری بیوی اور بیٹا کہیں گئے ہوئے تھے اور میں گھر میں اکیلا تھا میرا موڈ بنا اور میں نے وہ نظم لکھ دی۔ مجھے تفاصیل یاد نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جب میں لکھنے بیٹھا ہونگا اس وقت تک مجھے اندازہ نہ ہوگا کہ میں کیا لکھنے والا ہوں ایک کیفیت طاری ہوئی ہوگی کچھ بچے کی یاد آئی ہوگی کچھ دنیا کی بے ثباتی کا ندازہ ہوا ہوگا کچھ زندگی کے مقصد کے بارے میں سوچ رہا ہونگا۔ یہ سب سوال میرے ذہن میں کہیں نہ کہیں ہونگے جو نظم میں بظاہر کہیں نہیں ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ میں نے ان سب باتوں کے بارے میں سوچ کر نظم کہی ہو میرا خیال ہے کہ یہ سب چیزیں میرے ذہن میں کہیں نہ کہیں پکتی رہی ہونگی۔ میں نے سوچا ہوگا خاندان میں اضافہ ہوا ہے بچہ ہوا ہے کبھی ہم بھی بچے تھے بچے جوان ہوتے ہیں بوڑھے ہوتے ہیں مرجاتے ہیں زندگی کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اکثر انسان زندگی کے مختلف مراحل پر ان مسائل کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں میرے اندر وہ سب چیزیں جمع ہوتی رہیں اور پھر ایک لمحے میں جب بچے کی یاد آئی یا اپنی بے ثباتی پر رونا آیا تو سب کچھ کاغذ پر اتر آیا۔ ممکن ہے اپنے آپ کو تسلی دے رہا ہوں کہ میں تو ختم ہو جاؤں گا لیکن میرا بچہ دنیا میں رہے گا۔ مجھے تفاصیل یاد نہیں لیکن اتنا

یاد ہے کہ اس کیفیت میں بیٹھا اور پندرہ بیس منٹ میں وہ پوری نظم لکھ ڈالی لیکن یہ تو ایک عام سی بات ہوئی۔ اس نظم میں ایک اور Angle یہ ہے کہ اس میں ہر Immigrant نسل کے ایک مسئلے کا ذکر بھی ہے اگرچہ میں نے شعوری طور پر نہیں سوچا لیکن میرے لاشعور میں ضرور ہوگا کہ اگلی نسل کا مستقبل کیا ہوگا کیا ہم ان پر اپنا Cultural Heritage مسلط کریں گے یا انہیں اس ماحول میں کھلا چھوڑ دیں گے۔ میرے خیال میں یہ مسائل ہم سب کے مسائل ہیں اپنی زبان کا مسئلہ کلچر کا مسئلہ۔ ہمیں بہت سی اپنی روایتیں اچھی بھی لگتی ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ غلط ہیں، وہ غلامی کے دور کی جاگیردارانہ نظام کی روایتیں ہیں ہمیں ان کے غلط ہونے کا احساس بھی ہے لیکن پھر بھی ہم ان سے جڑے رہتے ہیں۔ کہنہ اور فرسودہ روایات کو توڑنا ایک Immigrant Parent کا اہم مسئلہ ہے۔ جب میں نے اپنے بیٹے کے نام نظم لکھی تو دراصل وہ نئی نسل سے خطاب تھا جو ذاتی حوالے سے آیا تھا۔“

بیٹے کے نام

میں تمھاری آنکھوں سے
وہ زمانے دیکھوں گا
جو ابھی نہیں آئے

میں تمھارے پاؤں سے
تیز تیز بھاگوں گا
ایسی شاہراہوں پر
جو ابھی نگاہوں سے

مثل خواب اوجھل ہیں

میں تمھارے ہاتھوں سے
وہ پہاڑ چھو لوں گا
جس کو سوچ کر بھی اب
سانس پھول جاتی ہے

وہ پہاڑ وہ رستے
جن پہ تم کو جانا ہے
وہ نیا زمانہ ہے
اور وہ تمھارا ہے

میں کہ اس زمانے کو
دیکھ بھی نہ پاؤں گا
لیکن اس زمانے کی
ہر گھڑی کو ہر پل کو
میری آنکھیں دیکھیں گی
ان چمکتی آنکھوں سے
جو تمھاری آنکھیں ہیں

میں تمھاری آنکھوں میں
پیار بن کے رہتا ہوں

نور بن کے بستا ہوں
خواب بن کے زندہ ہوں

میرے سارے خوابوں کو
ان جمیل آنکھوں کے
ایک خاص گوشے میں
تم چھپا کر رکھ لینا
اور اگر کبھی یہ خواب
پھول بن کے مہکیں تو
ان کی خوشبوؤں میں تم
میرے نام کے سب حرف
احتیاط سے رکھنا

افتخار عارف نے تخلیقی عمل کے بارے میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''مختلف ادیب اور نقاد تخلیقی عمل کے بارے میں مختلف انداز سے سوچتے ہیں۔ بعض ادیب جب اپنی تخلیق مکمل کر لیتے ہیں تو انہیں خوشی ہوتی ہے وہ تخلیقی عمل سے سکون حاصل کرتے ہیں لیکن میں جس کے حصے میں زندگی کے بہت سے دکھ اور درد آئے ہیں، جب بھی کوئی نظم ختم کرتا ہوں تو غمگین ہو جاتا ہوں۔ میری نظم میرا داخل کے کرب سے رشتہ جوڑ دیتی ہے اور میں سوگوار ہو جاتا ہوں۔ میری نظمیں میرے داخلی اضطراب کو اجاگر کر دیتی ہیں۔

میں اپنا موقف ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ مجھے پاکستان میں ایک شام سالِ نو کی دعوت (New Year's Party) پر جانا تھا جہاں میرے چند

قریبی دوست بھی موجود تھے۔ میں اس شام اکیلا ہی پارٹی میں چلا گیا تھا۔ جونہی آدھی رات قریب آئی جب دوست، محبوب اور شریکِ حیات ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں اور بوسوں کے تحفے پیش کرتے ہیں۔ وہ خواتین جو مدتوں سے میری دوست تھیں مجھ سے دور ہٹنے لگیں۔ مجھے وہ منظر دیکھ کر اتنا دکھ ہوا کہ میں نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے واپس گھر لے چلو۔ پارٹی سے گھر کا فاصلہ شاید آدھے گھنٹے کا تھا لیکن اس آدھ گھنٹے میں میں نے "بارھواں کھلاڑی" تخلیق کی۔ جب میں نے وہ نظم پہلی دفعہ کسی کو سنائی تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ اس نظم کا ہیرو میں خود تھا۔ وہ ایک ذاتی نظم تھی۔ اس نظم نے میرا اپنی بدقسمتی سے تعارف کروایا۔"

بارھواں کھلاڑی

خوشگوار موسم میں
اَن گنت تماشائی
اپنی اپنی ٹیموں کو
داد دینے آتے ہیں
اپنے اپنے پیاروں کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں
میں الگ تھلگ سب سے
بارہویں کھلاڑی کو
ہُوٹ کرتا رہتا ہوں
بارہواں کھلاڑی بھی
کیا عجب کھلاڑی ہے

کھیل ہوتا رہتا ہے
شور مچتا رہتا ہے
داد پڑتی رہتی ہے
اور وہ الگ سب سے
انتظار کرتا ہے
ایک ایسی ساعت کا
ایک ایسے لمحے کا
جس میں سانحہ ہو جائے
پھر وہ کھیلنے نکلے
تالیوں کے جھرمٹ میں
ایک جملۂ خوش کُن
ایک نعرۂ تحسین
اس کے نام پر ہو جائے
سب کھلاڑیوں کے ساتھ
وہ بھی معتبر ہو جائے
پر یہ کم ہی ہوتا ہے
پھر بھی لوگ کہتے ہیں
کھیل سے کھلاڑی کا
عمر بھر کا یہ رِشتہ ہے
عمر بھر کا یہ رشتہ چھوٹ بھی تو سکتا ہے
آخری وِسل کے ساتھ
ڈُوب جانے والا دل

ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
تم بھی افتخار عارف
بارہویں کھلاڑی ہو
انتظار کرتے ہو
ایک ایسے لمحے کا
ایک ایسی ساعت کا
جس میں حادثہ ہو جائے
جس میں سانحہ ہو جائے
تم بھی اِفتخار عارف
تم بھی ڈوب جاؤ گے
تم بھی ٹوٹ جاؤ گے

بعض شاعر اگر اپنی تخلیق سے مطمئن نہ ہوں تو اسے بار بار لکھتے ہیں اور اگر پھر بھی خوش نہ ہوں تو اسے ضائع کر دیتے ہیں۔

منیر الدین احمد کے تجربات، جو ایک افسانہ نگار ہیں، شاعروں کی نسبت بہت مختلف ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو دریا سے پانی لاتے ہیں۔ وہ ایک کہانی کے بارے میں مہینوں سوچتے رہتے ہیں۔ جیسے کہ وہ حاملہ ہوں اور پھر جب وہ گھر اور یونیورسٹی سے دور سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں تو اس سفر کے دوران کہانی کو جنم دیتے ہیں۔ انہیں اپنے تخلیقی عمل کے لیے یکسوئی اور تنہائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ''میں اپنی کہانیاں مہینوں کے انتظار اور تیاری کے بعد لکھتا ہوں۔ کہانی میرے ذہن میں مہینوں پرورش پاتی رہتی ہے اور جب میں سیاحت پر گھر سے نکل پڑتا ہوں تو کہانی تخلیق ہوتی ہے۔''

جب میں اکرام بریلوی سے انٹرویو لے رہا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں

ایک ایسے انسان سے تبادلہ خیال کر رہا ہوں جو اپنے صحن میں کنواں کھود رہا ہو۔
انہوں نے ایک ناول تخلیق کرنے میں برس ہا برس گزار دیے۔ وہ کہنے لگے
"جب میں اپنا ناول "پل صراط" لکھ رہا تھا تو اپنی بیٹی کے بیسمنٹ میں روزانہ چھ
سے آٹھ گھنٹے تک کام کرتا تھا۔ میں نے ایک ہی ناول چھ دفعہ لکھا ہے۔ میں آپ
کو اس کے چھ مسودے دکھا سکتا ہوں۔ میں نے اسکے آخری چند جملے اس وقت
بدل ڈالے جب کاتب اسکی کتابت کر رہا تھا۔

ایک ناول نگار کی محنت، مشقت اور لگن کا شاعر تصور بھی نہیں
کر سکتے۔ اشفاق حسین اور حمیرا رحمان نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اگرچہ
ان کی خواہش ہے کہ وہ فکشن تخلیق کریں لیکن اس کے لیے جس ریاض کی
ضرورت ہے وہ ان کے بس میں نہیں۔

جب میں نے فاروق حسن سے پوچھا کہ وہ ترجمہ کرتے وقت بیانیہ،
علامتی اور تجریدی کہانیوں میں سے کن کہانیوں کو چنتے ہیں تو وہ کہنے لگے:

"میں تجریدی کہانیوں سے زیادہ متاثر نہیں۔ ترجمہ کرنے سے پہلے میرا
کہانی کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ترجمہ کرنا درس دینے کی طرح ہے۔ اگر آپ
خود موضوع سے واقف نہیں ہیں تو آپ اس سے انصاف نہیں کر سکتے۔ میں
قارئین سے بد دیانتی نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے جن کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے وہ یا تو
حقیقت پسندی پر مبنی ہیں یا تمثیلی ہیں۔ بہت سی تجریدی کہانیاں میری سمجھ سے
بالاتر ہیں۔"

ج۔ تخلیقی عمل اور ادیب کی ذاتی زندگی

جوں جوں میں ادیبوں کی زندگیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا
گیا میرا ان کی ذاتی زندگی میں تجسس بڑھتا گیا۔ میں نے ان سے ان عوامل کے
بارے میں سوال پوچھنے شروع کیے جو ان کے تخلیقی عمل کے لیے تحریک کا باعث

بنے۔

۱۔ تنہائی کے لمحات

ادیبوں نے تنہائی کے لمحات کو بہت اہم قرار دیا۔ تاریخی طور پر ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر غاروں کی طرف، صوفی جنگلوں کی طرف، سائنس دان لاٹریوں کی طرف اور شاعر ویرانوں کی طرف جاتے رہے ہیں۔ عہدِ حاضر کے ادیب اپنے آپ کو کمپیوٹر کے کمرے میں بند کر لیتے ہیں۔ ادیب دوسروں کی صحبت سے بچ کر اپنی صحبت میں وقت گزارنا چاہتے ہیں۔

تنہائی کے لمحات، جو عام لوگوں کے لیے تکلیف دہ ہوتے ہیں، ادیب اور فنکار انہیں بہت قیمتی سمجھتے ہیں۔ ان لمحوں میں وہ اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور اپنے تخلیقی چشموں کو چھو لیتے ہیں۔ وہ ان لمحات میں گھریلو اور کاروباری مصروفیات سے کنارہ کش ہو کر تصورات کی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور اپنی نظموں غزلوں اور کہانیوں کے کرداروں کی تعمیر اور تخلیق کرتے ہیں۔

ان لمحوں میں ان کی کیفیت ایک بادل کی سی ہوتی ہے جو ہوا کے دوش پر پرواز کرتا رہتا ہے۔ آزادی کے ان لمحوں میں وہ منطق کے ساحل سے دور ہٹ کر لاشعور کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور جب وہ واپس لوٹتے ہیں تو ان کے مشاہدات اور تجربات تخلیقی فن پاروں میں ڈھل چکے ہوتے ہیں۔ وہ فن پارے ایسے موتی ہوتے ہیں جو وہ سمندر کی گہرائیوں سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔

مرفی (Murphy) کا کہنا ہے کہ ساحل سے جدا ہو کر بے خوف و خطر گہرے پانیوں میں اتر جانے کا فن کار کو آخر صلہ ملتا ہے اور وہ زندگی اور فن کے نئے گوشوں سے روشناس ہوتا ہے۔ (Ref 1, P 374)

ہچ نسن (Hutchinson) کا کہنا ہے کہ وہ اتوار کی چھٹی کے دن صبح سویرے اپنی سستی اور کاہلی سے استفادہ کرتا ہے۔ اپنے خیالات کو بے لگام چھوڑ

دیتا ہے اور وہ اسے انجانی دنیاؤں میں لے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں اس کھیل سے استفادہ کرتا ہے اور پھر ان خیالات اور تصورات کو تخلیقی قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ (Ref 5, P 424)

سنگر (Singer) کا کہنا ہے کہ وہ لوگ جو خواب و خیال کی دنیا میں کھو جاتے ہیں ان میں نئے موضوعات کو تلاش کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے جو کہانی لکھنے میں بہت ممد ثابت ہوتا ہے۔ (Ref 1, P 375)

ادیبوں کو اپنے فن کی نشو و نما کے لیے اپنے روزمرہ کے کاموں سے کٹنا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی پرورش کر سکیں۔ ابرار حسن نے بتایا کہ جب ان کا خاندان چند ہفتوں کی چھٹیوں پر چلا جاتا ہے تو وہ اپنے نامکمل پروجیکٹ مکمل کرتے ہیں۔

۲۔ سفر

ادیبوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی سے اس وقت بھی فراغت حاصل ہوتی ہے جب وہ سفر پر نکل پڑتے ہیں۔ ابرار حسن اور منیر الدین احمد نے اس بات کا اقرار کیا کہ سفر کرنے سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ سفر کے دوران انہیں اتنا فارغ وقت میسر آتا ہے کہ وہ اپنی نامکمل نظموں اور کہانیوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں بیدار بخت نے بتایا کہ وہ جب سفر پر نکلتے ہیں تو چند نظمیں ساتھ لے جاتے ہیں اور پھر جہاز میں یا ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر ان کا ترجمہ کرتے ہیں۔ جاوید دانش نے بتایا کہ یورپ کے سفر نے انہیں دوستوں کو ایسے خطوط لکھنے پر اکسایا جنہوں نے بعد میں سفرنامے کا روپ دھارا۔

۳۔ پڑھائی

لکھنے اور پڑھنے کا گہرا تعلق ہے۔ بہت سے ادیب اپنے فارغ وقت میں

دوسرے ادیبوں کی تخلیقات کو پڑھنا پسند کرتے ہیں اور ان سے نہ صرف محظوظ ہوتے ہیں بلکہ تحریک بھی حاصل کرتے ہیں۔ وہ تحریریں انہیں نئی تخلیقات کو جنم دینے پر اکساتی ہیں۔ ترجے کا کام تو پڑھنے کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔

۴۔ ریٹائرمنٹ

چھٹیاں لینا تو فارغ وقت حاصل کرنے کا عارضی طریقہ ہے لیکن جو ادیب ریٹائرمنٹ حاصل کر چکے ہیں انہیں فارغ وقت وافر مقدار میں ملتا ہے۔ اکرام بریلوی نے بتایا کہ جب سے وہ ریٹائر ہوئے ہیں انہوں نے اپنا بہت سا وقت تخلیقی کاموں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ منیب الرحمٰن ان دنوں کا انتظار کر رہے ہیں جب وہ یونیورسٹی کی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائیں گے اور یکسوئی سے اپنا تخلیقی کام کر سکیں گے۔

۵۔ ایڈیٹنگ

بعض ادیب صرف اپنی تخلیقات پر ہی توجہ مرکوز نہیں کرتے بلکہ ایسا ماحول بھی تیار کرتے ہیں جس میں دوسرے ادیب بھی اپنی صلاحیتوں کی پرورش کر سکیں چنانچہ وہ ادیب یا تو رسالوں کے مدیر بن جاتے ہیں یا ادبی سیمیناروں اور کانفرنسوں کا انتظام کرتے ہیں۔ ایسی کاروائیوں میں شاہین، افتخار عارف اور اشفاق حسین پیش پیش ہیں۔ ایسی کاروائیاں جہاں دوسروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ وہیں بعض دفعہ ان کی اپنی تخلیقات کو متاثر کرتی ہیں۔ ایسے ادیب جو مدیر بن جاتے ہیں ہمیں ان ایکٹروں کی یاد دلاتے ہیں جو فلموں کے ڈائرکٹر اور پروڈیوسر بن جاتے ہیں اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جو کامیاب ایکٹر بھی ہوں اور کامیاب ڈائرکٹر اور پروڈیوسر بھی۔

د۔ تخلیقی شخصیت

ہم جتنا زیادہ تخلیقی عمل کا تجزیہ کرتے ہیں اسی قدر ہمارا سامنا تخلیقی شخصیت سے ہوتا ہے۔ اس موضوع پر لکھے ہوئے ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ فنکار کی شخصیت میں بہت سی خصوصیات ایسی ہیں جو اسے عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

فلس گرین ایکر (Phyllis Greenacre) نے فنکاروں کے بچپن کے بارے میں بہت سے پر معنی مقالے رقم کئے ہیں وہ لکھتی ہیں ''تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مندرجہ ذیل خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں:

ا۔ وہ بہت حساس ہوتے ہیں

ب۔ وہ مختلف چیزوں میں نئے نئے رشتے تلاش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ج۔ وہ زندگی کے بارے میں ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں۔

د۔ وہ اپنے جذبات، احساسات اور تجربات کو فن پاروں میں ڈھالنا جانتے ہیں۔ (Ref 7, P 53)

مختلف ادیبوں نے اپنے انٹرویوز کے دوران اپنی شخصیت کے جن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ شرمیلی طبیعت

بہت سے ادیبوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ وہ بچپن سے ہی شرمیلی طبیعت کے مالک تھے۔ فاروق حسن نے کہا ''میں بچپن سے ہی شرمیلا رہا ہوں۔ میرے لیے لوگوں کے سامنے تقریر کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اب بھی ہر سال

یونیورسٹی کا کورس شروع کرتے ہوئے پہلے دن میں بہت عذاب میں ہوتا ہوں۔ پوری کلاس کے سامنے کھڑا ہونا میرے لیے تکلیف دہ عمل ہے۔ میں اب تک اسے نبھا رہا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ ایک دن میں کلاس روم میں بیہوش ہو کر گر پڑوں گا۔

اشفاق حسین کہنے لگے "جب لوگ مجھے مشاعرے کی نظامت کرتا دیکھتے ہیں تو انہیں یقین نہیں آتا کہ میں درپردہ ایک شرمیلا انسان ہوں"

منیب الرحمٰن نے کہا "میں شروع سے ہی تنہائی پسند رہا ہوں میرے دوستوں کا حلقہ کبھی بھی وسیع نہ تھا۔ میرے جو قریبی دوست تھے وہ بھی اب گزر گئے ہیں اور اب میں بہت تنہا محسوس کرتا ہوں۔"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ادیبوں کی شرمیلی طبیعت اس وجہ سے تو نہیں کہ وہ اپنے خیالات اور تصورات کی دنیا میں اتنے کھوئے رہتے ہیں کہ انہیں دوسروں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اکرام بریلوی کا خیال ہے کہ فکشن لکھنے والے اپنے تخلیقی کاموں میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ انہیں محفلوں میں شریک ہونے کا وقت ہی میسر نہیں آتا۔

۲۔ منکسر المزاجی

میں نے جن ادیبوں کا انٹرویو لیا اگرچہ وہ ادبی حلقوں میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور انہوں نے اردو ادب میں گراں قدر اضافے کیے ہیں لیکن اپنے بارے میں وہ عاجزی اور انکساری سے ہی گفتگو کرتے رہے۔ جب میں نے منیب الرحمٰن سے کہا کہ لوگ انہیں ایک کامیاب ادیب سمجھتے ہیں تو وہ کہنے لگے "سچی بات تو یہ ہے کہ میں بہتر اور اچھا لکھ سکتا تھا۔ میں نے ادب کی کچھ زیادہ خدمت نہیں کی۔ اگر میرا نام تاریخ کی کتابوں میں نہ آیا تو مجھے مایوسی نہ ہوگی۔ اگر صرف چند لوگوں نے ہی میری تخلیقات پڑھیں اور انہیں پسند کیا تو

میری خوشی کے لیے یہی کافی ہوگا"

بیدار بخت کہنے لگے "اس سے پہلے کہ میں آپ کے سوالات کا جواب دوں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ انٹرویو نہیں ہے۔ انٹرویو تو صرف ان لوگوں سے لیا جاتا ہے جن کا ادب میں کوئی مقام ہو، جو میرا نہیں ہے۔ میں تو ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں جس نے چند تخلیقات کے ترجمے کیے ہیں۔ آپ اس تبادلہ خیال کو ایک مکالمہ کہہ سکتے ہیں"

ان ادیبوں کے انٹرویو سن کر میں سوچنے لگا کہ کیا ان کی عاجزی اس تہذیب اور روایت کا حصہ تو نہیں جس میں انہوں نے پرورش پائی ہے کیونکہ مشرقی ماحول اور اردو کے ادبی حلقوں کی ایک اہم قدر انکساری رہی ہے۔

۳۔ خود اعتمادی

ادیبوں کے انٹرویوز سے ان کی ایک اور خصوصیت جو سامنے آتی ہے وہ ان کی خود اعتمادی ہے۔ شرمیلی طبیعت اور منکسر المزاجی کے باوجود ان ادیبوں کو اپنی ذات پر اعتماد تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے فیصلے بڑی ہمت کے ساتھ کیے تھے۔ وہ دوسروں کی رائے کو اہمیت تو دیتے تھے لیکن پھر بھی بات اپنے دل کی ہی مانتے تھے۔

حمیرا رحمان کہنے لگیں "گھر سے باہر نکلنے سے مختلف لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے ذہن کھلتا ہے خود اعتمادی آتی ہے، شخصیت میں نکھار آتا ہے۔ وہاں جو لڑکیاں Comparing کرتی تھیں وہ پروڈیوسر نے جو لکھ دیا وہی پڑھ دیتی تھیں لیکن میں اس میں کچھ ترمیم کر دیتی تھیں۔ میں شروع سے خوش قسمت رہی ہوں۔ پروڈیوسر بھی برا نہ مناتے تھے اور مجھے پروگرام میں تبدیلی کی اجازت دیتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجھ میں صلاحیت ہے۔ بعض دفعہ تو میں ان کا پورا پیراگراف کاٹ کر نیا لکھ دیتی تھی۔ میں ایک شعر ایک نغمہ کا پروگرام کیا

کرتی تھی جس کا نام ''آبشار'' تھا۔ میں شعر پڑھنے کے بعد ایسا ماحول پیدا کرتی تھی کہ ڈرامائی عنصر شامل ہو جاتا تھا۔ وہ پروگرام دو سال تک چلتا رہا اور جب میں وہاں سے چلی گئی تو پروگرام بھی بند ہو گیا۔ سامعین نے وہ پروگرام کسی اور انداز میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ پروگرام ایسے معیار پر پہنچ گیا تھا کہ کسی اور کا اسے maintain کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

اشفاق حسین نے کہا ''میٹرک کرنے کے بعد نوکری کی فکر ہوئی اور شام کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کلرکی مل گئی تو کچھ عرصہ وہ بھی کر لی۔ پھر میں نے بی۔ اے کا امتحان دیا۔ سب دوست اور خاندان والے چاہتے تھے کہ میں (A.S.I.) بن جاؤں۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ لیکچرر بننا ہے۔ یونیورسٹی ان دنوں شام کے وقت ہوتی نہ تھی پرائیویٹ میں کرنا نہ چاہتا تھا۔ میں دل لگا کر محنت سے ایم۔ اے کرنا چاہتا تھا۔ آخر میں نے نوکری چھوڑ کر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ مجھے پتہ تھا کہ میری پوزیشن آئے گی۔ اس وقت میں نے کسی کی کوئی بات نہیں سنی جو میرے اپنے دل میں آیا وہی کیا کیونکہ مجھے اردو ادب سے شوق تھا میری ایم۔ اے میں سیکنڈ پوزیشن بھی آئی۔ فیض پر کتاب بھی لکھی۔ اب وہ سب باتیں سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ میں نے اپنے دل کی بات مانی۔''

تخلیقی شخصیتوں کی یہ خود اعتمادی ان کے فن اور شخصیت کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

۴۔ کھلے ذہن کے مالک

ادیب اور فنکار اکثر اوقات کھلے دل اور ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ نئے نئے خیالات اور تجربات کو اپنی ذات کا حصہ بناتے رہتے ہیں۔

کارل روجرز (Carl Rogers) لکھتے ہیں کہ فنکار اپنے اعتقادات اور

نظریات میں تنگ نظر نہیں ہوتے۔ وہ زندگی کے تضادات اور ابہام کو بخوشی قبول کرتے ہیں۔ اپنے ماحول کو اسکی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ قبول کرنے کے عمل سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں پنپتی ہیں۔

اس قسم کے انداز فکر کی ایک مثال بیدار بخت کا انٹرویو ہے۔ وہ کہتے ہیں ''ایک دن میری بیٹی نے پوچھا ''ابو! میرا مذہب کیا ہے؟'' میں نے اس سے کہا ''بیٹی! تمہیں اپنی زندگی میں تین مذاہب کے بارے میں سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اپنے ابو کا مذہب اسلام اپنی اماں کا مذہب ہندوازم اور اپنے دوستوں کا مذہب عیسائیت۔ تم ان تینوں مذاہب کے بارے میں سیکھتی رہو اور جب جوان ہو جاؤ گی تو خود ہی فیصلہ کر لینا کہ تمہیں کون سا مذہب پسند ہے۔ تمہیں ابھی سے فیصلہ کرنے کی کیا ضرورت ہے ہر کسی کو زندگی میں ایسا موقع نہیں ملتا۔''

۵۔ غیر روایتی سوچ

ادیبوں کی پانچویں خصوصیت جو ان کے انٹرویوز سے واضح ہوئی وہ ان کی غیر روایتی سوچ تھی۔ اپنی بالغ نظری اور خود اعتمادی کی وجہ سے وہ زندگی کے اہم مسائل کے بارے میں ایک جداگانہ رائے رکھتے تھے۔

جب میں نے افتخار عارف سے شادی اور خاندان کے بارے میں سوال پوچھا تو وہ کہنے لگے ''یہ بات تو درست ہے کہ خاندان انسان کی زندگی کے ایک خلا کو پر کرتا ہے۔ خاندانی زندگی ایسی خوشیاں مہیا کرتی ہے جو کہیں اور سے نہیں مل سکتیں۔ میرے دو بچے ہیں اور میں انہیں ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔ میں ان کی کامیابی اور خوشحال زندگی کے لیے دعاگو ہوں۔ میں ان کی کامیابیاں دیکھ کر پھولے نہیں سماتا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر میں شادی شدہ نہ ہوتا تو زیادہ ادب تخلیق کرتا۔ مجھے زندگی کے ایسے راستوں پر چلنے کا موقع ملتا جن پر میں ایک شادی شدہ انسان ہونے کے ناطے نہیں جاسکتا۔ میرے خیال میں ایک ادیب کو نہ

تو شادی کرنی چاہیے اور نہ بچے پیدا کرنے چاہئیں کیونکہ ان کاموں سے اس کی تخلیقی اور ادبی زندگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ خاندانی زندگی اسے محدود کر کے رکھ دیتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایک مسلمان، ایک باپ اور ایک شوہر ہونے کے ناطے مجھے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں لیکن میں یہ باتیں ایک فنکار کی حیثیت سے کر رہا ہوں اگر میں یہ بات نہ کروں گا تو اپنے آپ سے بد دیانتی کر رہا ہوں گا۔"

جب میں نے فاروق حسن سے انسان اور خدا کے رشتے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا "اسکول کے زمانے میں میں مذہبی ہوا کرتا تھا لیکن کالج جا کر میرے نظریات بدل گئے۔ اب میں مذہبی نہیں ہوں۔ اب میں مذہب کی روایات اور قانون کی پابندی نہیں کر سکتا۔ میرے لیے کتابیں لکھ کر جنت میں جانا شاید آسان ہو۔ میں نظریاتی طور پر صوفیوں کے زیادہ قریب ہوں جو اپنے خالق سے ایک ذاتی رشتہ رکھتے ہیں۔ میری سمجھ سے وہ لوگ بالاتر ہیں جو خدا سے اپنے رشتے کا بے شرمی سے ذکر کرتے ہیں۔ مجھے تو ایسے لوگ بے حیا لگتے ہیں۔ میری نگاہ میں انسان کا اپنے خالق سے رشتہ ذاتی اور مقدس ہے۔ جس طرح ایک شادی شدہ شخص بیوی سے اپنے تعلقات کا ذکر دوسروں سے نہیں کرتا اسی طرح مجھے کسی انسان کا اپنے خدا سے تعلقات کا دوسروں سے ذکر کرنا عجیب لگتا ہے۔"

٦۔ غیر روایتی طرزِ زندگی

ادیبوں کی چھٹی خصوصیت جس کا مجھے انٹرویوز سے اندازہ ہوا وہ ان کا غیر روایتی طرزِ زندگی تھا۔ جن ادیبوں نے خاندانی اور معاشرتی روایات کی کبھی اندھی تقلید نہیں کی۔ جب بھی ان کے دل اور روایات میں تضاد پیدا ہوا انہوں

نے اپنے دل کی بات مانی۔ یہ رجحان خاص طور پر شریکِ حیات کے چناؤ میں کھل کر سامنے آیا۔ میں اپنی بات واضح کرنے کے لیے اکرام بریلوی، بیدار بخت اور منیب الرحمٰن کے انٹرویوز کے چند اقتباسات نقل کرتا ہوں۔

سہیل: کیا آپ کی بیوی آپ کی رشتہ دار ہیں؟

اکرام: ہاں میری کزن ہیں میری پوپھی کی بیٹی ہیں۔

سہیل: آپ کی بیوی کو آپ کے لیے کس نے چنا تھا؟

اکرام: میں نے خود چنا تھا۔ میں اپنے خاندان کا پہلا شخص تھا جس نے اپنی بیوی کو برقعہ نہیں پہنایا۔ میں نے برقعہ جلا دیا تھا کیونکہ وہ مجھے بالکل پسند نہ تھا وہ بریلی سے دہلی بغیر برقع کے آئی تھیں۔

سہیل: آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟

بیدار بخت: لندن میں ۱۹۶۸ء میں

سہیل: آپ کے خاندان کا کیا ردِ عمل تھا؟

بیدار: میں اپنے والدین کو یہ بتاتے ڈر رہا تھا کہ میری بیوی ہندو ہے۔ میرے والد صاحب ایک روایتی مسلمان تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ ناراض ہو جائیں گے۔ آخر دس سال بعد ۱۹۷۸ء میں، جب میں نے انہیں خط لکھ کر بتایا کہ میں نے ایک بنگالی ہندو سے شادی کی ہے تو ان کا جواب آیا کہ انہیں شادی کی نہ صرف خبر تھی بلکہ انہوں نے شادی کی خوشی میں دوستوں اور رشتہ داروں میں مٹھائی بھی بانٹی تھی۔

منیب الرحمٰن: جب میں نے ایک یورپین خاتون سے شادی کا فیصلہ کیا تو میں نے والد صاحب کو خط لکھ کر مطلع کیا۔ میرے والد صاحب نے جواب میں ایک تفصیلی خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ میں تمہاری شادی

کے خلاف نہیں ہوں لیکن تم جانتے ہو کہ ہندوستان کی خاندانی روایات اور معاشرتی رسم و رواج یورپ سے بہت مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں پرائیویسی (Privacy) کا کوئی تصور نہیں ہے کیا تمہارا خیال ہے کہ تمہاری بیوی ہندوستان میں خوش رہ سکے گی۔ میرے والد صاحب نے تمام ممکنہ مسائل کی طرف میری توجہ دلوائی۔ میں نے اس خط کا ترجمہ کیا اور اپنی منگیتر کو بھیج دیا۔ اس نے خط پڑھ کر لکھا کہ اسے وہ تمام مشکلات منظور ہیں چنانچہ ہم نے شادی کی اور ہم ہندوستان چلے گئے۔

ان کہانیوں سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اپنے ملک، مذہب، تہذیب اور ثقافت سے باہر شادی کرنے والے ادیبوں نے کتنی غیر روایتی زندگیاں گزاری ہوں گی۔

۷۔ تخلیقی جذبے کی شدت

ادیبوں کی شخصیات میں ساتویں خصوصیت ان کی جوش اور جذبہ ہے جو تخلیق عمل کو آغاز سے انجام تک پہنچاتا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جذبے کا ماخذ کیا ہے؟

فرائڈ (Freud) کا خیال تھا کہ فنکار اپنی تشنہ خواہشات اور نفسیاتی تضادات کو اپنے فن میں پیش کرتا ہے۔

روتھ (Roth) کا خیال تھا کہ فنکار میں اپنے تخلیقی اظہار کا جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ راستے کی رکاوٹوں اور مسائل کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔

گرین ایکر (Greenacre) کا خیال تھا کہ فنکاروں کا زندگی اور انسانوں کو چاہنے کا جذبہ ان کے فن کے لیے تحریک کا باعث بنتا ہے۔

کاکٹو (Cocteau) ادیب کی ہر تحریر کو ایک محبت بھرا خط سمجھتا تھا۔

۸۔ ذہانت

ادیبوں کی شخصیت کی آٹھویں خصوصیت ان کی ذہانت ہے۔ ماہرینِ نفسیات ایک طویل عرصے سے تخلیقی صلاحیتوں اور ذہانت کے رشتے پر غور و خوض کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سب فنکار ذہین ہوتے ہیں لیکن ہر ذہین شخص فنکار نہیں ہوتا۔ ایک تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ فلاسفروں کا اوسط آئی کیو (I.Q) ۱۷۰، ناول نگاروں اور ڈرامہ نگاروں کا ۱۶۰ اور سائنس دانوں کا ۱۵۵ ہوتا ہے (Ref 1, P 342) لیکن بعض ماہرین ہماری توجہ اس طرف بھی مبذول کرواتے ہیں کہ ڈارون، آئن سٹائن اور چرچل، اسکول کے امتحانوں میں زیادہ کامیاب نہ تھے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ تخلیقی ذہانت اسکول کا امتحان پاس کرنے کی ذہانت سے مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسکول کی تعلیم کے لیے بچوں کو کنورجینٹ سوچ (Convergent Thinking) استعمال کرنی پڑتی ہے جو بہت سے نقطوں سے ایک نقطے کی طرف جاتی ہے۔ اگر کسی بچے سے پوچھا جائے کہ انگور، مالٹے اور کیلے میں کیا چیز مشترک ہے اور وہ کہے کہ یہ سب پھل ہیں تو یہ ایسی سوچ کی مثال ہوگی۔ اس کے مقابلے میں تخلیقی کام کرنے کے لیے ہمیں ڈائورجنٹ سوچ (Divergent Thinking) کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک نقطے سے کئی نقطوں کی طرف جاتی ہے۔ اگر کسی بچے سے پوچھا جائے کہ تم ایک دائرے سے کتنی چیزیں بنا سکتے ہو اور وہ کہے کہ میں اس سے گھڑی، پیالی اور گیند بنا سکتا ہوں تو یہ ایسی سوچ کی مثال ہوگی۔

ماہرین نفسیات اب ایسے ٹیسٹ تیار کر رہے ہیں جن سے بچوں کی تخلیقی ذہانت کا اندازہ لگایا جا سکے میں نے جن ادیبوں کا انٹرویو لیا ان کی ذاتی اور پیشہ وارانہ کامیابیاں ان کی اعلیٰ ذہانت کی دلیل ہیں۔

۹۔ دانائی

ادیبوں کی شخصیت کی نویں خصوصیت ان کی دانائی ہے۔ روبرٹ سٹرنبرگ سولومون (Solumon) کی دانائی، آئن سٹائن کی ذہانت اور ملٹن (Mil-ton) کی تخلیقی صلاحیتوں کا آپس میں مقابلہ کرتا ہے اور ان میں مشترک خصوصیات تلاش کرتا ہے۔

ڈیوڈ روبرٹسن لکھتا ہے کہ ایک دانا شخص کا فلسفے سے گہرا تعلق ہوتا ہے جو زندگی کی ازلی و ابدی سچائیوں کی تلاش میں ہوتا ہے۔ ایسی سچائیاں جن کا تعلق انسانی ارتقا سے ہے۔ میں نے جن ادیبوں کا انٹرویو لیا وہ سب اپنی ذات سے بالاتر ہو کر زندگی اور معاشرے کے اہم مسائل کے بارے میں فکر مند تھے۔ اکرام بریلوی نے اپنے فلسفے کی وکالت کرتے ہوئے کہا "میرا مذہب انسانیت ہے۔ میں معاشرتی ناانصافیاں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ایک انسان کو دوسرے انسان کا استحصال کرتے نہیں دیکھ سکتا۔

۱۰۔ انسان دوستی کا فلسفہ

ادیبوں کی شخصیت کی دسویں خصوصیت ان کی انسان دوستی ہے۔ انٹرویوز کے دوران مجھے احساس ہوا کہ اگرچہ ہر ادیب ایک خاص خاندان، ماحول، زبان اور ثقافت میں پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ان سب دیواروں سے بالاتر ہو کر پوری انسانیت کو گلے لگاتا ہے۔ وہ انسانیت کی انفرادی اور اجتماعی بھلائی کے بارے میں فکر مند رہتا ہے وہ کرۂ ارض پر ایک بہتر زندگی کی تلاش میں رہتا ہے وہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ ہم سب انسان ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور ہم ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ہم سب کو اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے۔ شاید یہ وہی مقام ہے جہاں ادب اور شاعری پیغمبری کا حصہ بن

جاتے ہیں۔

س۔ تخلیقی عمل اور ادیب کی معاشرتی زندگی

جب ہم ادیب اور اس کی تخلیقات کے پراسرار رشتے پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اس کی معاشرتی زندگی کے بارے میں بھی سوچنا پڑتا ہے۔ ہر ادیب پیدائش سے موت تک مختلف حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ وہ حالات ادیبوں کی تخلیقی صلاحیتوں اور کاوشوں کو کیسے متاثر کرتے ہیں۔

خاندانی اثرات

ہر ادیب سب سے پہلے اپنی زندگی میں اپنے خاندان سے متاثر ہوتا ہے۔ خاندان بچوں کی شخصیت کی نشوونما کرتے ہیں، ان کی صلاحیتوں کو مروجہ ڈھانچوں میں ڈھالتے ہیں اور انہیں مستقبل کے لیے تیار کرتے ہیں۔ خاندان ایک نسل کی روایات اور اقدار دوسری نسل تک منتقل کرتے ہیں۔

یہ ایک دلچسپی کی بات ہے کہ بعض خاندان اپنے بچوں کی تخلیقی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور بعض حوصلہ شکنی۔ جاوید دانش اپنے انٹرویو کے دوران کہنے لگے ”میرے والد شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ شعر کہتے تھے انہوں نے کئی افسانے اور مضامین ترجمہ بھی کیے تھے۔ سخن فہمی مجھے ورثے میں ملی تھی“

منیر الدین احمد فرمانے لگے ”ہمارے خاندان کا ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ میرے نانا ایک ادیب تھے وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے انہوں نے اپنے گاؤں میں رہ کر بھی بہت سی کتابیں چھاپیں جن میں سے کئی بار بار چھپیں۔“

اکرام بریلوی کہنے لگے ”میں اپنے والد سے اتنا خوفزدہ رہتا تھا کہ اے۔ ایچ۔ پروانہ کے نام سے لکھتا تھا“

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس خوف کے باوجود اکرام بریلوی نے لکھنا پڑھنا ترک نہیں کیا اور آخر کار ایک کامیاب ادیب بن کر ابھرے۔

ادبی ماحول

خاندان کے بعد جو ماحول ادیب پر اثر انداز ہوتا ہے وہ اسکول، کالج، یونیورسٹی اور معاشرے کا ادبی ماحول ہوتا ہے۔ بعض تعلیمی اور معاشرتی ادارے ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے ہیں اور بعض انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بعض معاشروں میں ادیبوں کے لیے کتابیں پڑھنا، دوسرے ادیبوں سے ملنا، مختلف ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال کرنا آسان ہوتا ہے اور بعض میں مشکل، میرے انٹرویوز کے دوران بہت سے ادیبوں نے ادبی ماحول کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ جن ادیبوں کو ماحول نے مثبت انداز میں متاثر کیا ان میں مغیب الرحمٰن اور جاوید دانش سر فہرست ہیں۔ دونوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔

جاوید دانش نے اپنے نام کے ساتھ ''علیگ'' لکھنے کے بارے میں کہا:

''علی گڑھ علم و ادب اور ثقافت کا گہوارہ رہ چکا ہے اور اپنی تمام تر بے حالی کے باوجود آج بھی اس کا ایک کردار ہے۔ اردو ادب کے تقریباً ہر بڑے قلمکار کا تعلق کسی نہ کسی طرح علی گڑھ سے رہا ہے۔ میرے لئے بھی علی گڑھ ایک ڈریم لینڈ سے کم نہ تھا۔ تعلیم کے علاوہ ادبی و ثقافتی طور پر علی گڑھ نے مجھے بڑا confidence عطا کیا ہے۔ کلکتے کی تمام علمی ادبی اور ثقافتی کاوشوں میں مجھے مقامی سمجھا جاتا تھا۔ مگر علی گڑھ جاتے ہی ڈرامے کی Activity نیشنل لیول پر ہوگئیں۔ اس کے علاوہ ملک گیر سطح پر استادوں اور نقادوں کے ساتھ ہی دہلی ریڈیو سے رابطہ بڑھتا چلا گیا۔ یعنی کنوئیں سے نکل کر میں ایک کھلے سمندر میں تیرنے لگا۔ وہ میری زندگی کا زریں دور کہا جاسکتا ہے!''

مغیب الرحمٰن نے علی گڑھ کی زندگی کے بارے میں اپنے جذبات کا

اظہار ان الفاظ میں کیا "اس ماحول نے مجھے ادبی تحریک بخشی۔ وہاں میری ملاقات مجاز اور جاں نثار اختر جیسے ادیبوں سے ہوئی وہاں ادبی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہیں اور ادبی مسائل پر تبادلہ خیال بھی ہوتا تھا۔ میں نے جب اپنی تخلیقات ان محفلوں میں پیش کیں تو ان کو سراہا بھی گیا اور ان پر تنقید بھی ہوئی۔ ان محفلوں سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔"

ادبی ماحول کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نئے لکھنے والوں کو ادبی رہنما مل جاتے ہیں جو ان کے فن کو نکھارتے ہیں۔ منیر الدین احمد کہتے ہیں "میں نے اپنی ادبی زندگی میں "قندیل" کے مدیر شیر محمد اختر سے بہت رہنمائی حاصل کی۔ وہ خود بھی لاہور کے ایک مشہور افسانہ نگار تھے۔ میں نے انہیں اپنا استاد بنا لیا تھا۔ میں جو کچھ بھی تخلیق کرتا ان سے ضرور مشورہ لیتا۔"

تعلیمی زندگی سے فارغ ہو کر اکثر ادیب باقی انسانوں کی طرح شریکِ حیات اور پیشے کا چناؤ کرتے ہیں اور یہ دونوں فیصلے ان کی ادبی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔

پیشہ وارانہ ماحول

میں نے جن ادیبوں کے انٹرویو لیے ان میں سے بعض نے اپنی ادبی زندگی کو اپنی پیشہ وارانہ زندگی سے بہت دور رکھا تھا اور بعض انہیں بہت قریب لے آئے تھے۔ وہ ادیب جن کی ادبی اور پیشہ ورانہ زندگیاں آپس میں گھل مل گئی تھیں ان کے جذبات بھی بہت ملے جلے تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کر رہی تھیں اور بعض سمجھتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔

شاہین اور بیدار بخت کے پیشوں کا ان کی ادبی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ شاہین کہنے لگے "میرے نزدیک وہ میری زندگی کے دو علیحدہ علیحدہ حصے

ہیں۔ میں ایک ماہر شماریات اور ماہر اقتصادیات کی حیثیت سے کینڈا کی حکومت کو غلے کی ٹرانسپورٹ کی پالیسیوں کے بارے میں مشورے دیتا ہوں۔ میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کو ادبی زندگی سے متاثر نہیں ہونے دیتا۔ میرے بعض رفیق کار میری کتابیں بک اسٹور سے لے کر پڑھتے ہیں۔ اگر مجھے اپنے خاندان کی معاشی ذمہ داریوں کے لیے کام نہ کرنا پڑتا تو شاید میرے تخلیقی کاموں میں اضافہ ہوتا۔"

بیدار بخت کہنے لگے "میں اپنے انجینئرنگ کے پیشے میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ میرے لیے شاعری کا کام آرام کرنے کی طرح ہے۔ انجینئرنگ کی وادی میں دیر تک سفر کرنے کے بعد میں شاعری کے درخت تلے چند لمحے ستا لیتا ہوں اور پھر انجینئرنگ کے سفر کے لیے دوبارہ تیار ہو جاتا ہوں۔"

مجھے فاروق حسن سے گفتگو کر کے، جو یونیورسٹی میں ادب پڑھاتے ہیں حیرانی ہوئی کہ وہ ادبی پیشے کو اپنی تخلیقی زندگی کے لیے سودمند نہیں سمجھتے۔ وہ کہنے لگے "اگر آپ کا خیال ہے کہ ادب پڑھانا ادب تخلیق کرنے کے لیے مفید ہے تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ سبق پڑھانے سے میں تھک جاتا ہوں اور میری ساری تخلیقی توانائی کلاس روم میں صرف ہو جاتی ہے اور وہ بھی ان طالب علموں پر جن کو ان کی بالکل قدر نہیں۔ تین چار گھنٹے پڑھانے کے بعد جب میں گھر آتا ہوں تو ذاتی تخلیقی کام کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں ہوتا۔ ہر سال نئے طالب علموں کو پڑھاتے ہوئے میرے ذہن میں چند نئے خیال آتے ہیں لیکن میں ان سے پوری طرح استفادہ نہیں کر سکتا۔ اگر میں بینک میں کام کر رہا ہوتا اور کام پر الفاظ کی بجائے (Calculator) استعمال کرتا تو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بچا کر رکھتا۔ تدریس کا کام میری تخلیقی توانائی کو کم کر دیتا ہے۔"

منیب الرحمٰن کا خیال ہے کہ فارسی ادب پڑھانے کا کام ان کے ادبی

تراجم کرنے میں سود مند ثابت ہوتا ہے۔

شادی شدہ زندگی کے اثرات

جب میں نے ادیبوں سے پوچھا کہ ان کی شادی شدہ زندگی نے ان کی ادبی زندگی کو کیسے متاثر کیا ہے تو مختلف ادیبوں نے مختلف جواب دیے۔

افتخار عارف کہنے لگے کہ شادی شدہ زندگی ادیب کو محدود کر دیتی ہے۔

فاروق حسن کہنے لگے "وہ بالکل مدد نہیں کرتی۔ گھر میں کسی کو یہ فکر نہیں کہ مجھے اتنا وقت میسر آئے کہ میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کر سکوں۔ مجھے تمام دن گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے جس میں بہت سارا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ کینڈین زندگی کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ یونیورسٹی میں پڑھانے کی ذمہ داریاں مستزاد۔ جب میں سعودی عرب میں تھا تو مجھے سوچنے اور لکھنے کو کافی وقت مل جاتا تھا۔"

منیر الدین احمد کا شادی کا تجربہ فاروق حسن سے بہت مختلف ہے وہ کہنے لگے "میری بیوی اوٹا (Uta) نے میری ادبی زندگی کو بہت نکھارا ہے۔ وہ آسٹریا میں پیدا ہوئی تھیں اٹلی اور چلی (Chile) میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ پیرو (Peru) میں رہیں اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ہمبرگ جرمنی چلی گئیں۔ وہ جرمن، Italian، Spanish اور Portugese زبانوں اور ان کے ادب میں کافی دلچسپی رکھتی ہیں میں نے اوٹا سے ان زبانوں کے ادب کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے۔"

ادیبوں سے انٹرویو لینے کے بعد میں سوچتا رہا کہ کیا شادی کرنے کے عمل سے یہ زیادہ اہم تو نہیں کہ ادیبوں نے شادی کس سے کی ہے۔

تخلیقی زندگی اور بچے

انٹرویوز لینے کے دوران مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ بعض ادیبوں کی تخلیقی زندگی ان کے بچوں سے بالکل متاثر نہیں ہوئی جبکہ دوسرے ادیبوں نے بہت سی ایسی چیزیں تخلیق کیں جن کا ان کے بچوں سے براہِ راست تعلق تھا۔ بیدار بخت اور اشفاق حسین نے بہت سی چیزیں اپنے بچوں سے تحریک حاصل کر کے لکھی ہیں۔

ابرار حسن اپنے باپ بننے کے تجربے کے بارے میں کہتے ہیں ''میرے بچے میرے لیے بہت سی خوشیاں لے کر آئے ہیں۔ اگر مجھے اپنی زندگی میں خدا کی قربت کا احساس ہوا ہے تو وہ اپنے خاندان اور بچوں کے حوالے سے ہوا ہے یہ میرا ایک ابدی زندگی سے رشتہ ہے۔ میں نے اپنے بچوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بچے ناکام ہو کر بھی مایوس نہیں ہوتے وہ ہر کام کو بار بار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ غلطیاں کرنے سے ڈرتا رہا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی بھی کام میں کمال حاصل کرنے کے لیے غلطیاں کرنا بہت ضروری ہے وہ سیکھنے کے عمل کا حصہ ہے اور یہ سبق میں نے اپنے بچوں سے سیکھا ہے۔''

تخلیقی زندگی اور معاشرت ازادی

تخلیقی زندگی چونکہ انفرادی اور اجتماعی طور پر آزادی کا پیغام لیکر آتی ہے اس لئے اس کی پرورش کے لئے ایک آزادانہ ماحول کی ضرورت ہے

اپنی پرواز کا اندازہ لگانے کے لئے
ہم نے ماحول سے آزاد فضائیں مانگیں

امریکی صدر فرانکلن روزویلٹ (Franklin Roosevelt) نے کہا تھا کہ آزادی کی زندگی کے لئے معاشرے میں چار قسم کی آزادی بہت ضروری ہے

خوف سے آزادی

بنیادی ضروریات سے آزادی

اظہارِ خیال کی آزادی

مذہب اور عبادت کی آزادی

وہ معاشرے جن میں لوگوں کو یہ آزادیاں میسر آئیں گی ان کے تخلیقی زندگی میں فعال ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔

کارل روجرز (Carl Rogers) کا خیال ہے کہ ہمیں زندگی میں عمل کی آزادی اور فکر کی آزادی میں فرق کرنا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ بہت سے خیالات پر ہم روزمرہ زندگی میں عمل نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو سکتا ہے لیکن ہمیں فنونِ لطیفہ میں ان کے علامتی اظہار کی اجازت ہونی چاہیئے۔

بعض ادیبوں کو اپنے ماحول میں اتنی گھٹن محسوس ہوئی کہ وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے

تخلیقی عمل اور ہجرت کا تجربہ

مغرب میں بسے مشرقی ادیبوں کے انٹرویو لینے کا ایک مقصد تخلیقی عملی اور ہجرت کے تجربے کا تعلق تلاش کرنا تھا۔ میری نگاہ میں ایک مہاجر ادیب، ادیب ہونے اور مہاجر ہونے کے دوہرے دکھ سہتا ہے۔

ادیب دیگر مہاجروں کی طرح جب نئی تہذیب و ثقافت میں آتے ہیں تو انہیں نئے ماحول سے ایک نیا رشتہ جوڑنا پڑتا ہے۔ اگر مہاجر ادیب

☆ میزبان معاشرے کی زبان سے واقف ہوں

☆ آسانی سے ملازمت حاصل کر سکیں اور

☆ ان کے رشتہ دار اور دوست پہلے سے موجود ہوں تو ان کے لئے ماحول کو قبول کرنے کا عمل قدرے آسان ہوتا ہے وگرنہ مشکل۔ نئے

معاشرے کے تجربات ادیب کی تخلیقی زندگی کو کئی حوالوں سے متاثر کرتے ہیں۔

ابرار حسن کہنے لگے کہ کینڈا میں وہ پہلے چند سال بہت پریشان خیالی کا شکار رہے اور انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ریوڑ سے بچھڑ گئے ہوں۔

منیر الدین احمد جب جرمنی گئے جہاں لوگ انگریزی بھی نہ بولتے تھے تو انہیں اپنی تخلیقی زندگی کی طرف لوٹنے میں کئی سال لگے۔ وہ کہتے ہیں "جب میں جرمنی آیا تو میرا رشتہ اردو سے منقطع ہو گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جرمنی سیکھنے کے لئے میں انگریزی اخبار تک نہ پڑھوں گا۔ میں نے دس سال تک اردو میں کچھ نہ لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں جرمنی زبان و ادب کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ دس سال کے بعد پہلے میں نے جرمن ادب کا اردو میں ترجمہ کیا اور پھر اردو میں طبعزاد افسانے اور مضامین لکھے"

منیب الرحمٰن کہنے لگے "جو لوگ جوانی میں ہجرت کرتے ہیں انہیں نئے ماحول سے رشتہ جوڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ میں عمر کے جس حصے میں آیا ہوں میں بہت تنہا محسوس کرتا ہوں۔ میری عمر میں ماحول کے ساتھ نیا رشتہ استوار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

زبان کا مسئلہ

مہاجر ادیب کا ہجرت کے بعد اپنی زبان سے ایک نیا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ وہ جس ماحول میں رہتا ہے وہاں کے لوگ کسی اور زبان میں گفتگو کرتے ہیں جبکہ ادیب اپنی مادری زبان میں ادب تخلیق کرتا رہتا ہے جسے نئے ملک کے لوگ نہیں سمجھتے اس طرح مہاجر ادیب کا اپنی زبان سے رشتہ بدل جاتا ہے۔

جب میں نے فاروق حسن سے پوچھا کہ کینڈا آنے کے بعد انہوں نے اپنے تخلیقی اظہار میں کیا تبدیلی محسوس کی تو وہ کہنے لگے "میری نظموں میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ میری زبان بہت سادہ ہو گئی ہے۔ جب میں پاکستان میں تھا

تو زبان کے اندر رہتا تھا میں لوگوں سے اردو میں گفتگو کرتا تھا اور الفاظ کی نئی تراکیب تلاش کرتا رہتا تھا میں الفاظ کے ساتھ ایک کھیل کھیلا کرتا تھا۔ کینڈا آنے کے بعد زندگی کا کاروبار انگریزی میں چلتا رہتا ہے۔ میں اپنے بچوں سے بھی انگریزی میں بات چیت کرتا ہوں۔ میں اردو میں صرف اپنی بیوی اور چند قریبی دوستوں سے بات کرتا ہوں یہ ایسا ماحول نہیں جہاں زبان کے نئے پیرائے جنم لے سکیں۔ اگر میرا رشتہ اردو زبان سے گہرا ہوتا تو شاید میں زیادہ لکھتا۔ میرا خیال ہے مجھے اردو بولنے والے دوستوں کو کینڈا بلوالینا چاہئے۔"

منیرالدین احمد نے اپنے تجربے کا ان الفاظ میں اظہار کیا:

سہیل: کیا جرمن ادب پڑھنے سے آپ کی اپنی تخلیقات اور زبان پر کچھ اثر پڑا؟

منیر: کافی فرق پڑا۔ میں نہ صرف لکھتا مختلف ہوں بلکہ سوچتا بھی مختلف ہوں۔ اب میں اردو زبان میں اس طرح نہیں لکھتا جس طرح پاکستان اور ہندوستان کے ادیب لکھتے ہیں۔ مجھے دوستوں نے بتایا ہے کہ اب میرے جملے کی ساخت اردو کی نسبت جرمن زبان کی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جرمن ادب اردو زبان میں تخلیق کرتا ہوں۔"

سہیل: ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

منیر: آپ کو میرے افسانوں میں ایسے الفاظ، تشبیہیں، استعارے اور محاورے ملیں گے جو اردو زبان اور ادب کے لئے ناآشنا ہیں۔"

ابرار حسن نے فرانس کی زندگی کے ان کے ادب پر اثرات کا ان الفاظ میں اظہار کیا "میرے انداز میں کئی تبدیلیاں آئی ہیں میری زبان سادہ ہوگئی ہے۔ اس میں فارسی کے الفاظ کم ہوگئے ہیں۔ میں نے نہ صرف پیرس کے پارکوں کے بارے میں بلکہ اسرائیل، جنوبی افریقہ

اور پاکستان کے سیاسی خیالات کے بارے میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ سب میری شاعری میں خوش آئند تبدیلیاں ہیں۔"

ادیبوں کے انداز فکر میں تبدیلی

نئے ملک، نئی زبان، نئی ثقافت اور نئے معاشرے میں زندگی گزارنے سے ادیبوں کی شخصیت، اندازِ فکر اور مزاج میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں جن کا اظہار ان کی تخلیقات سے ہوتا ہے۔

اشفاق حسین نے اقرار کیا کہ مغرب میں آنے کے بعد معاشرتی مسائل، عورتوں اور خاندان کے بارے میں ان کے نظریات بہت بدل گئے ہیں۔ مغربی زندگی نے انہیں ایک جمہوری انداز میں سوچنے میں مدد دی تھی۔

نسیم سید نے کہا کہ شمالی امریکہ میں وہ مذہبی اور فلسفیانہ مسائل پر کھل کر تبادلۂ خیال کر سکتی ہیں۔ ایسی گفتگو نے انہیں زندگی کے مسائل کو منطق کی کسوٹی پر پرکھنے میں مدد کی ہے۔

شاہین کہنے لگے "میرے نظریات میں تبدیلی تو آئی ہے لیکن مکمل تبدیلی نہیں۔ میں اپنے ملک میں رہ کر بھی مہاجر محسوس کرتا تھا۔ بعض لوگ شمالی امریکہ میں رہ کر بھی اجنبی محسوس نہیں کرتے اور بعض اپنے ملک میں بھی اجنبی پن کا شکار ہوتے ہیں۔ جب میں ہندوستان میں تھا تو اپنے ماحول سے جڑا ہوا نہ تھا۔ میں عالمی ادب کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ میں فرانسیسی اور جرمن ادب اور ان کی تحریکوں کو سنجیدگی سے پڑھتا تھا۔ اب جب میں اپنا مجموعۂ کلام "رگِ ساز" پڑھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں نے کس طرح بین الاقوامی ادب کے استعاروں سے اپنی شاعری میں استفادہ کیا ہے۔ جب میں کینیڈا آیا تو مجھے نئی حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور میں نے ایک نئے انداز سے زندگی کو دیکھنا سیکھا۔ جس طرح ڈیڈ پوئٹس سوسائٹی (Dead Poet's Society) فلم میں استاد ایک طالبعلم کو میز پر

کھڑے ہو کر اپنے ماحول کو دیکھنے کا مشورہ دیتا ہے۔ جن چیزوں اور کاموں کی مشرق میں ممانعت تھی وہ مغربی زندگی کا حصہ ہیں میں نے ان نئی حقیقتوں کو قبول کرنا سیکھا۔

میں اپنی نسل اور رنگ کی وجہ سے دوسروں سے مختلف ہوں اور مقامی لوگ مجھے ایک خاص انداز سے دیکھتے ہیں جو مجھے پسند نہیں۔ سارتر نے ایک دفعہ کہا تھا ''جہنم دوسرے لوگ ہیں'' یعنی میں بھی اس جہنم میں رہتا ہوں۔

میرے نئے تجربات نے میری شاعری کو کافی متاثر کیا ہے۔ اگر شاعر ہجرت نہ بھی کرے تب بھی اس کی شاعری میں تبدیلی آتی رہتی ہے عمر کے گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کا نقطۂ نظر بدلتا ہے اور وہ تبدیلی شاعری میں بھی جھلکتی ہے۔''

مشرقی ادیب اور شاعر جب مغرب میں آبستے ہیں تو پہلے تو وہ اپنے اندازِ فکر کے بدلنے سے خوش ہوتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ جس قدر مغربی طرزِ زندگی کے قریب آتے جاتے ہیں وہ اتنا ہی مشرقی تہذیب سے دور بھی ہوتے جاتے ہیں اور ان کی تخلیقات کو مشرق کے روایتی لوگ قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ منیرالدین احمد کہتے ہیں:

''مسئلہ اردو زبان کا نہیں ان لوگوں کا ہے جو اردو بولتے ہیں کیونکہ وہ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چراتے ہیں۔ رسالوں کے مدیروں پر حکومت اور ان کے قاری دباؤ ڈالے رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں کسی نے میرے افسانے میں ''دلال'' اور ''طوائف'' کے الفاظ پر اعتراض کیا وہ کہنے لگا میرا دس سال کا بیٹا بھی رسالہ پڑھتا ہے اور اس کا خیال تھا کہ اس کے بیٹے کو ایسے الفاظ نہیں پڑھنے چاہئیں۔

عورتوں اور تخلیقی عمل کا رشتہ اتنا دلچسپ اور گنجلک ہے کہ اس موضوع پر بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ میں نے چند سال پیشتر اس موضوع پر ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نام تھا ''مغربی عورت، ادب اور زندگی'' جس میں میں نے مغربی خواتین کی تحریروں سے ان کی آزادی کی تحریک کی نشاندہی کی تھی۔ اس کتاب میں میں نے (Anais Nin) کی ڈائری سے ایک صفحہ پیش کیا تھا جس میں وہ نسوانیت اور تخلیقی عمل کے رشتے پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''آج پھر ہنری ملر اور لیری (ناولسٹ لورنس ڈورل) ملنے آئے تھے اور ''میں خدا ہوں'' کی بکواس کرتے رہے ان کے نزدیک تخلیقی عمل کے لئے یہ احساس ضروری ہے۔ میرے خیال میں وہ کہنا چاہتے تھے ''میں خدا ہوں عورت نہیں ہوں'' عورت کی کبھی بھی خدا سے بلاواسطہ گفتگو نہیں ہوئی ہمیشہ ایک مرد پادری کے واسطے سے ہوئی اس نے جو کچھ بھی تخلیق کیا مرد کی وساطت سے کیا۔ صرف عورت بن کر نہیں کیا۔ ایک بات جو ہنری اور لیری نہیں سمجھتے کہ عورت کی تخلیق مرد کی تخلیق سے بہت مختلف ہوتی ہے اس کی ہر تخلیق ایک بچے کی تخلیق کی طرح ہوتی ہے جس میں اس کا خون شامل ہوتا ہے جس کی وہ اپنے کوکھ میں پرورش کرتی ہے اور پھر اسے اپنا دودھ پلاتی ہے اس کی تخلیق مردوں کی تخلیق کی طرح نہیں ہوتی جو تجریدی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔''

ہم سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ عورتوں کو صدیوں سے اپنے ذاتی اور فنی اظہار کی اجازت نہیں دی گئی جس سے ان کی انفرادی اور اجتماعی نشوونما بہت متاثر ہوئی ہے۔ آج بھی مشرق میں عورتوں کو بہت سی معاشرتی پابندیاں قبول کرنی پڑتی ہیں اور اگر وہ ان پابندیوں کے خلاف آواز اٹھائیں تو انہیں اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

عورتوں کی تاریخ مختلف قسم کی قربانیوں سے پر ہے۔ میں نے اپنی کتاب کے لئے حمیرا رحمان اور نسیم سید کے انٹرویو لئے۔ ان کی گفتگو سے ہمیں عورتوں کے مسائل کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

حمیرا رحمان اپنے آپ کو خوش قسمت عورت تصور کرتی ہیں کیونکہ اب ان کے گھر والے اور خاوند ان کی بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں لیکن انہیں بھی نوجوانی میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کالج کے زمانے میں جب ان کی ایک ایسی نظم چھپی جس میں انہوں نے روایات پر تنقید کی تھی تو ان کے والد نے انہیں شاعری کرنے سے منع کیا تھا اور انہوں نے چند سال تک شاعری ترک کر دی تھی۔ بعد میں انہوں نے دوبارہ شاعری کی تو بہت مقبول ہوئیں۔ وہ اپنے اور ادیب عورتوں کے مسائل کے بارے میں کہتی ہیں:

حمیرا رحمان نے کہا:

''ان دنوں کراچی سے ایک ڈائجسٹ نکلا تھا جس کا نام تھا خواتین ڈائجسٹ انہوں نے ایک شاعرات نمبر نکالا تھا جو Women's Lib کے بارے میں تھا۔ مجھے عورتوں کے مسائل کا پورا احساس تو نہ تھا لیکن میں نے ایک آزاد نظم لکھ کر بھیج دی۔ انہوں نے وہ نظم چھاپ دی۔ اگرچہ وہ نظم عورتوں کے رسالے میں چھپی تھی لیکن ہمارے محلے کے لڑکوں نے پڑھ لی اور ہمارے ابا کو جا کر دکھادی۔ وہ ابا کے اِسٹوڈنٹس تھے۔ ابا جان بہت ناراض ہوئے کیونکہ اس نظم میں میں نے مردوں کو بہت ہی خراب انداز میں پیش کیا تھا ابا جان نے کہا ''ہر معاشرے کی اپنی روایات ہوتی ہیں تمہیں اس عمر میں اس قسم کی چیزیں نہیں لکھنی چاہئیں ''میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن یہ احساس ہوا کہ اس نظم میں ضرور کوئی چیز ہو گی جو رسالے والوں نے چھاپ دی ہے اس کے بعد تین چار سال تک بالکل نہیں چھپی۔ پھر میں لندن گئی تو اپنا کلام رسالوں میں بھیجنا شروع کیا۔''

سہیل: آپ کے خیال میں اردو میں جو عورتیں ادب تخلیق کر رہی ہیں انہیں کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

حمیرا: ان پر معاشرتی دباؤ بہت ہے وہ بہت کچھ نہیں لکھ سکتیں۔ جو وہ لکھنا چاہتی ہیں۔ اس سے انہیں بہت Frustration ہوتی ہے۔ بعض دفعہ وہ اذیتیں اور تکلیفیں برے طریقے سے سامنے آنے لگتی ہیں بعض عورتوں پر سسرال کا دباؤ ہے بعض پر میاں کا دباؤ ہے۔ بعض کی شادی اس لئے نہیں ہوئی کہ وہ کھلی کھلی باتیں لکھ دیتی ہیں۔ ایسی بات نہیں کہ عورتیں لکھتی نہیں ہیں لیکن ان کی بہت کم تعداد سامنے آتی ہے۔

حمیرا رحمان نے جن مسائل کا ذکر کیا ہے ان کی چند جھلکیاں ہمیں نسیم سید کے انٹرویو میں نظر آتی ہیں۔ نسیم سید جو یونیورسٹی کی ایک ہونہار طالبہ اور ابھرتی ہوئی شاعرہ تھیں انہیں شادی کے بعد بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور انہوں نے کئی سال تک اپنی تخلیقی زندگی کو خیر باد کہہ دیا۔ ان سالوں کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

نسیم: میں اردو ادب سے طویل عرصے تک بالکل کٹ چکی تھی۔ جب مجھے دوبارہ تحریک ہوئی تو اس ماحول میں دوبارہ آگئی۔ شادی کرنے سے پہلے تو میں شاعری کیا کرتی. تھی بلکہ کئی پروفیسروں کی پیشنگوئی تھی کہ میں اس میدان میں کافی آگے تک جا سکتی ہوں لیکن شادی کے بعد میرا ماحول بالکل بدل گیا۔ میں ایک ایسے ماحول میں آگئی جہاں شاعری کرنے والی عورت کو آوارہ اور بدمعاش سمجھا جاتا تھا چنانچہ بارہ تیرہ برس تک میں ادب سے بالکل کٹی رہی لیکن میرے اندر ہی

اندر بہت کچھ پکتا رہا۔ نہ تو مناسب ماحول تھا نہ مواقع تھے ادب سے ناطہ کٹ گیا تھا۔ جب کینڈا چلی آئی تو حالات بدل گئے۔

یہ ایک دلچسپی کی بات ہے کہ نسیم سید نے دوبارہ اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کیا اور مشکلات پر قابو پا لیا۔ ان کے مقابلے میں بہت سی دیگر عورتیں ایسی ہیں جو وہ جنگ ہار گئیں اور کچھ بھی تخلیق نہ کر سکیں۔

نسیم سید نے کینڈا آکر معاشی اور معاشرتی آزادی اور خودمختاری کے ایسے قدم اٹھائے جو وہ پاکستان میں نہ اٹھا سکیں ان کی جنگ صرف اپنے معاشرے اور ماحول سے ہی نہ تھی اپنی ذات سے بھی تھی اور جب انہوں نے اپنے آپ سے صلح کر لی تو وہ اس قابل ہو سکیں کہ اس جنگ کا حال شاعری کی زبان میں بیان کر سکیں انہوں نے اپنی شاعری میں عورتوں کے مسائل کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔

اس پوری جدوجہد میں نسیم سید کو جہاں اپنے بھائی، چند دوستوں اور رشتہ داروں کا تعاون حاصل ہوا وہیں کئی ادبی حلقوں نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتی ہیں:

"میں تصوراتی طور پر یہ سمجھتی تھی کہ ہمارا شاعروں اور ادیبوں کا طبقہ معاشرے کا بہترین طبقہ ہے یہ Mature لوگ ہیں ایسی نظمیں اور تحریریں لکھتے ہیں کہ ان کی نظریں دور تک دیکھ اور سمجھ سکتی ہیں لیکن جب سے میں خود اس حلقے میں داخل ہوئی ہوں تو مجھے یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے کہ مجھے قدم قدم پر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ میں فلاں شخص سے ملوں یا نہ ملوں مجھے کئی دوستوں نے کہا اور Sin-cerely کہا کہ تم عورت ہو فلاں فلاں شخص سے نہ ملا کرو۔ سارا ماحول

ہی کچھ عجیب سا ہے میں نہیں سمجھتی کہ جو کچھ شاعری میں کہتے ہیں اسی طرح زندگی میں عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ میرا تجربہ اس معاملے میں تکلیف دہ ہے جیسے تم اور میں اکیلے بیٹھے یہ باتیں کر رہے ہیں اگر ہماری ادبی برادری کو یہ پتہ چل جائے تو مجھے کہے گی کہ دنیا اس بارے میں کیا سوچے گی یہ نہیں سوچتے کہ اگر میں خالد کے بارے میں کوئی اور خیالات رکھتی تو اس سے ملنے کے میرے پاس اور طریقے موجود ہیں۔ "دنیا کیا سوچے گی" مجھے یہ بار بار بتایا جاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ادبی برادری سمجھتی ہے کہ میری اپنی کوئی شخصیت نہیں ہے اپنے کوئی اصول نہیں ہیں میرے اپنے کوئی نظریات نہیں ہیں۔

میں جب کسی سے ملتی ہوں تو بہت Frankly ملتی ہوں شرماکر، لجاکر، دوپٹہ اوڑھ کر نہیں ملتی۔ آپ سے بات کر رہی ہوں تو آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کروں گی جیسے میں عورتوں سے مسکراکر بات کرتی ہوں ویسے ہی مردوں سے بات کرتی ہوں۔ میرے ایک دوست نے کہا "فلاں شاعرہ کو دیکھو وہ کتنی نیک ہے" وہ نہیں سمجھتے کہ ان کے سمجھانے سے میں نیک نہیں ہو جاؤں گی اور نیکی کا میرا معیار بھی علیحدہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہماری ادبی برادری میرے معیار پر پوری نہیں اتری۔"

حمیرا رحمان اور نسیم سید کی گفتگو سے صاف واضح ہے کہ مہاجر ادیب عورتوں کو ادب اور معاشرے میں وہ مقام نہیں ملا جن کی وہ مستحق ہیں۔ ابھی تک ایسا ماحول پیدا نہیں ہوا کہ عورتیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر سکیں اور معاشرہ ان کی کھلے دل سے

پذیرائی کر سکے۔

مہاجر ادیبوں کا مستقبل

جب ہم مغرب میں بسے مہاجر ادیبوں کو اور انکی رنگارنگ تخلیقات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ادب کی ایک ایک قوس قزح نظر آتی ہے۔

بعض ادیب مغرب کی زندگی کے مسائل میں اتنا الجھے کہ ان کا تخلیقی زندگی سے رشتہ ٹوٹ گیا اور انہوں نے ادب تخلیق کرنا بند کر دیا۔

بعض ادیب اتنا بدلے کہ وہ مشرقی ادب کے دھارے سے بہت دور نکل آئے لیکن بد قسمتی سے نئے ملک کے ادب میں بھی شامل نہ ہو سکے لیکن ......

بعض ادیب خوش قسمت ہیں کہ انہوں نے اپنے ادب میں مشرق اور مغرب کے ادب کی روایات کو یکجا کر دیا ہے۔ مغرب میں رہنے سے انہیں موقع ملا ہے کہ وہ بین الاقوامی ادب کا مطالعہ کر سکیں، عالمی ادیبوں سے مل بھی سکیں اور انہیں اپنے تجربات میں شریک بھی کر سکیں۔ ایسے ادیب پر امید ہیں وہ جانتے ہیں کہ مغرب میں رہنے سے وہ عالمی ادب کے دھارے کے قریب آ گئے ہیں۔

افتخار عارف اس حوالے سے اپنے جذبات اور خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں۔

''مغرب میں رہنے والے ادیبوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے سامنے مشرقی ادب بھی ہے اور مغربی ادب بھی اور بیسویں صدی میں اچھا ادب تخلیق کرنے کے لئے عالمی ادب پر نگاہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ جب تک ہم عالمی صورتِ حال پر نظر نہیں رکھیں گے بہترین ادب تخلیق نہیں کر سکیں گے۔

مغرب میں بسنے والے ادیب عالمی ادیبوں سے نہ صرف مل سکتے ہیں بلکہ آسانی سے ان کا ادب پڑھ بھی سکتے ہیں۔ بہت سارا فرنچ، جرمن اور Spanishادب انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے ایسا ادب پاکستان میں بسنے والے

ادیبوں کی دسترس میں نہیں ہے۔ بعض لوگ یورپ کے سفر کے دوران چند کتابیں خرید کر لے جاتے ہیں لیکن اکثر لوگ ان کتابوں سے محروم ہیں مغرب میں بسنے والے ادیب نہ صرف مغربی ادب کا مطالعہ کرسکتے ہیں بلکہ مغربی طرزِ زندگی کا قریب سے مشاہدہ اور تجربہ بھی کرسکتے ہیں اور پھر مشرقی اور مغربی تجربے کو ملاکر سوچ بھی سکتے ہیں۔ اس دور کے مسائل عالمی ہیں اور ہمیں ان کا عالمی حل تلاش کرنا ہوگا۔ عالمی مسائل کا عالمی حل تلاش کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی مقامی شناخت کو بھول جائیں۔ میں پاکستانی شناخت کے بغیر بین الاقوامی شناخت حاصل نہیں کرسکتا۔ میرے نزدیک بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ میری اپنی دھرتی ماں کے ساتھ وفاداری بہت ضروری ہے۔

مغرب میں زندگی گزارنے سے ہم مغرب کی زندگی میں کچھ اضافے کرسکتے ہیں اور وہ ماحول ہماری زندگی میں کچھ اضافے کرسکتا ہے۔ بعض دفعہ دونوں طرف غلط فہمیوں کی دیواریں کھڑی ہوجاتی ہیں اور بعض حقدار اپنے حق سے محروم رہ جاتے ہیں لیکن اگر کوئی ادیب سچا ہے اور اعلیٰ پیمانے کا ادب تخلیق کررہا ہے تو اسے کوئی بھی نظرانداز نہیں کرسکتا۔ مغرب پالونرودا اور نجیب محفوظ کو نظرانداز نہ کرسکا اگرچہ انکا تعلق تیسری دنیا سے تھا۔ اگر کسی ادیب کی تخلیقات جاندار ہیں تو انہیں جلد یا بدیر کامیابی حاصل ہوگی۔"

Literary Encounters میں مندرجہ ادیبوں کے انٹرویو شامل ہیں۔

۱۔ اکرام بریلوی ۲۔ منیب الرحمٰن

۳۔ منیرالدین احمد ۴۔ شاہین

۵۔ فاروق حسن ۶۔ بیدار بخت

۷۔ ابرار حسن ۸۔ افتخار عارف

۹۔ نسیم سید ۱۰۔ اشفاق حسین

۱۱۔ جاوید دانش ۱۲۔ حمیرا رحمان

نوٹ: بعض انٹرویو چونکہ انگریزی میں لیے گئے تھے اس لئے اس کتاب میں شامل نہ ہو سکے۔

REFERENCES

1. ARIETI, Silvano — CREATIVITY- The Magic Synthesis. Basic Books, Inc. Inc. Publisher New York

2. ROGERS, Carl — ON BECOMING A PERSON Houghton Mifflin Company, Boston

3. GREENACRE, Phyllis — PLAY IN RELATION TO CREATIVE IMAGINATION Sophia Miriss Memorial Lecture, San Francisco, California, March 2, 1959

4. PATRICK, Catharine — WHAT IS CREATIVE Philosophical Library, New York

5. HUTCHINSON, Eliot Dole — VARIETIES OF INSIGHT IN HUMANS PSYCHIATRY (1939) 2:323-332

6. NOY, Pinchas — INSIGHT AND CREATIVITY Presented Sept. 1976, New York Psychonalytic Society

7. GREENACRE, Phyllis — THE CHILDHOOD OF THE ARTIST (Libidinal Phase Development & Giftedness) Paper panel discussion; American Psychonalytic Associtaion, New

Yorm,

Dec. 1956

8. KRETSCHMER THE PSYCHOLOGYOF MEN GENIUS
University of Marburg

9. HUTCHINSON, Eliot Dole THE PERIOD OF FRUSTRATION IN CREATIVE ENDEAVOUR

10. ARIETI, Silvano INTERPRETATION OF SCHIZOPHRENIA
Basic Books Inc. Publishers, New York

11. MAY Rollo THE COURAGE TO CREATE
Bantam Books, New York

12. TYSON, Moya NEW HORIZONS IN PSYCHOLOGY
Edited by Brian Foss, Penguin Books, England.

13. STEINBERG Robert WISDOM
Cambridge University Press, New York

14. NIN, Anais THE JOURNALS OFANAIS NIN
Quartet Books, New York

ایک ادیب کا احترام

اس کے

قومی پرچم سے زیادہ نہیں ہو سکتا

افتخار عارف سے انٹرویو

نیویارک اکتوبر ۱۹۹۰ء

(انگریزی سے ترجمہ۔ عطیہ جعفری، خالد سہیل)

سہیل: افتخار عارف! کل آپ کہہ رہے تھے کہ تخلیقی عمل کے بارے میں آپ کا تجربہ اور نظریہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہے کیا آپ اس کی توضیح کریں گے؟

افتخار: مختلف ادیب اور نقاد تخلیقی عمل کے بارے میں مختلف انداز سے سوچتے ہیں۔ بعض ادیب جب اپنی تخلیق مکمل کر لیتے ہیں تو انہیں خوشی ہوتی ہے وہ تخلیقی عمل سے سکون حاصل کرتے ہیں لیکن میں جس کے حصے میں زندگی کے بہت سے دکھ اور درد آئے ہیں، جب بھی کوئی نظم ختم کرتا ہوں تو غمگین ہو جاتا ہوں۔ میری نظم میرا داخل کے کرب سے رشتہ جوڑ دیتی ہے اور میں سوگوار ہو جاتا ہوں۔ میری نظمیں میرے داخلی اضطراب کو اجاگر کر دیتی ہیں۔

میں اپنا موقف ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ مجھے پاکستان میں ایک شام سالِ نو کی دعوت (New Year's Party) پر جانا تھا

جہاں میرے چند قریبی دوست بھی موجود تھے۔ میں اس شام اکیلا ہی پارٹی میں چلا گیا تھا۔ جونہی آدھی رات قریب آئی جب دوست، محبوب اور شریکِ حیات ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں اور بوسوں کے تحفے پیش کرتے ہیں وہ خواتین جو مدتوں سے میری دوست تھیں مجھ سے دور ہٹنے لگیں۔ مجھے وہ منظر دیکھ کر اتنا دکھ ہوا کہ میں نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے واپس گھر لے چلو۔ پارٹی سے گھر کا فاصلہ شاید آدھے گھنٹے کا تھا لیکن اس آدھ گھنٹے میں میں نے "بارہواں کھلاڑی" تخلیق کی جب میں نے وہ نظم پہلی دفعہ کسی کو سنائی تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ مجھے اچانک احساس ہوا کہ اس نظم کا ہیرو میں خود تھا۔ وہ ایک ذاتی نظم تھی۔ اس نظم نے میرا اپنی بدقسمتی سے تعارف کروایا۔

سہیل: آپ کی نظم "بارہواں کھلاڑی" آپ کی باقی تخلیقات سے بہت مختلف ہے۔

افتخار: ہوسکتا ہے قارئین کو مختلف لگتی ہو۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میری چند اور نظمیں مثلاً "چک پھیری" بھی ذاتی نوعیت کی ہیں۔ ویسے آپ کی یہ بات درست ہے کہ میری نظم "بارہواں کھلاڑی" کی ڈکشن بہت مختلف ہے اور نظموں کا مزاج ویسے بھی غزلوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔

سہیل: کیا آپ کے لئے نظمیں لکھنے کا تخلیقی تجربہ غزلیں لکھنے سے بہت مختلف ہے۔

افتخار: اس کے بارے میں کوئی فارمولا تو ہے نہیں۔ میں یہ تو کہتا نہیں کہ پیر کو غزل لکھوں گا اور منگل کو نظم۔ ویسے بعض شاعر ایسا کرتے بھی

ہیں۔ جوش صاحب ہر روز لکھا کرتے تھے۔ بعض شاعروں نے اپنے کلام کے اٹھارہ مجموعے چھپوائے ہیں لیکن میں زیادہ نہیں لکھتا۔ میں پورے سال میں تین یا چار نظمیں یا غزلیں لکھتا ہوں اور وہ بھی میرے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ میں اپنی تخلیق اس وقت تک نہیں چھپواتا جب تک کہ میں اس سے پوری طرح مطمئن نہ ہو جاؤں میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہر نظم اپنا ڈکشن ساتھ لے کر آتی ہے۔ اگر آپ ایک جینوین شاعر یا افسانہ نگار ہیں تو آپ کی تخلیق اپنا مواد اور پیرایۂ اظہار ساتھ لے کر آتی ہے۔ ایسا نہیں کہ آپ کے ذہن میں ایک خیال آیا اور آپ بیٹھ کر سوچنے لگے کہ اس کا اظہار کس انداز میں بہتر ہوگا۔ بعض لوگ ایسا کرتے بھی ہیں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ جب میں تخلیقی موڈ میں ہوتا ہوں تو لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ اس وقت میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں غزل لکھوں گا یا نظم۔ اب تو غزلوں میں بھی وحدتِ تاثر ملتا ہے۔ اس روایت کی بنیاد حالی نے ڈالی تھی پھر اقبال، ناصر کاظمی اور فیض صاحب نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے جگر مرادآبادی، سیماب اکبر آبادی اور شاعر لکھنوی کی طرح غزلیں نہیں لکھیں جس میں ہر شعر کا مزاج اور تاثر مختلف ہوتا تھا۔ ناصر کاظمی تو اپنی غزل میں ایک مخصوص فضا پیدا کرتے تھے مجھے بھی وہ روایت پسند ہے۔

سہیل: جب میں آپ کی شاعری پڑھتا ہوں تو اس میں مجھے درد و کرب کی بہت سی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ تو آپ نے رزق کی تلاش میں مغرب میں آبسنے والے مہاجروں کو ''سنگِ زمانہ'' کہہ کر پکارا ہے کیا آپ کے لئے ہجرت کا تجربہ اتنا تکلیف دہ رہا ہے؟

افتخار: ہر معاشرے کے ادیبوں اور شاعروں کو چند اقدار عزیز ہوتی ہیں۔ میں دولت کمانے اور آسودہ زندگی گزارنے کے خلاف نہیں۔ میں شاعروں کے مفلوک الحال ہونے کے حق میں نہیں لیکن بعض دفعہ ہم حرص کا شکار ہو جاتے ہیں اور جب ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو ہم اپنے آدرشوں کو دولت کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ادیب اور شاعر کی زندگی کا بنیادی مقصد تخلیق کا کام کرنا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ شاعر اور ادیب کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو مادی ضروریات کیلئے قربان کرنا چاہیئے۔ادیب اور شاعر تو ایک بہتر زندگی ایک بہتر دنیا کے خواب دیکھتے ہیں وہ تو ظلم اور ستم اور ناانصافی کے خلاف لڑتے ہیں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ ادیب اور شاعر بھی دولت کی حرص کا شکار ہیں تو میں بددل ہو جاتا ہوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے فنکاروں نے اپنے آپ سے بے وفائی کی ہو۔ دوسروں سے بددیانتی کرنا برا ہے اور خود فریبی کا شکار ہونا تو اور بھی برا ہے اس سے زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ میں جب بھی ایسا ہوتا دیکھتا ہوں تو دکھی ہو جاتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ انسان کو شہرت اور دولت کی خاطر اپنے ضمیر کو فروخت نہیں کرنا چاہئے۔ میرا کام اپنے آپ کو اور دوسروں کو آئینہ دکھاتے رہنا ہے کیونکہ ایک دفعہ انسان دولت کی ہوس کی دوڑ میں شامل ہو جائے تو پھر وہ انسانیت کی بھلائی کے خواب اور آدرش پیچھے چھوڑ آتا ہے۔ جوانی میں انسان ایسا کرے تو اس کے لوٹ آنے کی امید کی جاسکتی ہے لیکن میری عمر میں اس راہ پر چلنا ایک المیے سے کم نہیں۔

سہیل: آپ کی شاعری کی قوسِ قزح میں مذہبی رنگ بھی شامل ہے آپ کا

مذہبی روایت سے کیا رشتہ ہے؟

افتخار: میں ایک روایتی ماحول میں پلا بڑھا۔ میں لکھنؤ میں پیدا ہوا جو ایک شیعہ معاشرہ ہے۔ میرے والد سنی تھے اور میری والدہ شیعہ۔ اس لئے میں فقہِ جعفریہ سے بھی واقف ہوں اور فقہِ حنفیہ سے بھی۔ میں خود حنفی مسلک سے تعلق رکھتا ہوں۔ لکھنؤ کے معاشرے کا شروع سے ہی اردو شاعری سے قریبی تعلق رہا ہے۔ جب میر انیسؔ مرثیے لکھ رہے تھے تو وہ مرثیے کربلا کے ہی نہیں جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے بھی تھے۔ اس دور کے ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کا زوال شروع ہو چکا تھا اور انگریزوں کا تسلط بڑھ رہا تھا۔ وہ مرثیے اس المیے کی کہانی سناتے ہیں۔ ان مرثیوں میں ہمیں غدار بھی نظر آتے ہیں اور باطل کے خلاف صف آرا ہونے والے مجاہد بھی۔ ان مرثیوں میں سچ بہت تنہا نظر آتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے حق کے لئے قربانیاں دیں لیکن جب ان کی پیروی کرنے والے اپنے شہیدوں کے لئے آنسو بہا رہے تھے تو ان میں سے بعض اپنے زوال پر بھی گریہ وزاری کر رہے تھے۔

میں لکھنؤ کے مذہبی ماحول میں پلا بڑھا۔ میرا تعلق ایک غریب خاندان سے ہے۔ ہم اتنے غریب تھے کہ مجھے کئی دفعہ فاقہ بھی کرنا پڑا۔ میں یونیورسٹی پیدل جایا کرتا تھا۔ مجھے روزانہ چار آنے ملتے تھے۔ ان چار آنوں میں یا تو میں بس کا کرایہ ادا کرتا اور یا دوپہر کا کھانا کھاتا میں صبح سویرے یونیورسٹی وقت سے بہت پہلے چلا جاتا تھا اور شام کو دیر سے لوٹا کرتا تھا تاکہ مجھے کوئی پیدل آتا جاتا نہ دیکھ لے۔ چونکہ میں نے بہت سے دکھ سہے ہیں اسی لئے میرے لئے وہ لوگ ہیرو تھے

جن کو مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ جنہوں نے حق اور سچائی کے لئے قربانیاں دیں۔

امام حسین ایک دوراہے پر کھڑے تھے وہ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر کے خوشی کی زندگی گزار سکتے تھے لیکن انہوں نے ایک ظالم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا انہوں نے اپنے بہتر (۷۲) ساتھیوں سے کہا "کل صبح مقابلہ ہو گا اور میں مارا جاؤں گا۔ میں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہوں تم میں سے جو بھی جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔ اگر کسی کو جانے میں شرم آتی ہے تو میں شمع بجھا دیتا ہوں تاکہ وہ شخص اندھیرے میں چلا جائے۔ میں کسی کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا میں کل مارا جاؤں گا۔

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ کربلا میں کیا ہوا۔ جب امام حسین نے آخری سانس لیا تو انہوں نے دعا کی "میں تمام عمر تیری رضا پر راضی رہا ہوں۔ اے خدا! میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے اب تیری وعدہ کرنے کی باری ہے" میں نے جب یہ دعا سنی اور پڑھی تو میرے سراپا میں جوش اور جذبے کی لہر دوڑ گئی۔ میں آپ سے صاف گوئی سے کہتا ہوں کہ میں ایک مذہبی انسان ہوں میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے میں پیغمبر اسلام پر ایمان لایا ہوں اور ان کے ہی کہنے پر خدا اور قرآن پر ایمان لایا ہوں۔ پیغمبر اسلام میری زندگی کا مرکز ہیں۔ میں نے ان کے حوالے سے بھی دنیا کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں کئی چیزوں کو منطق کے حوالے سے نہیں سمجھا سکتا میری نگاہ میں وجدان اور جذبات کا بھی ایک منطق ہوتا ہے اور میں اسی منطق کے راستے سے خدا، پیغمبر اور ان کے ساتھیوں پر ایمان لایا ہوں اب میں آپ کے سوال کی طرف پلٹتا ہوں۔ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے معاشقوں کا ذکر بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں انہیں کسی مرد یا عورت سے محبت ہو جائے تو اس کی کہانی فخر سے بیان کرتے ہیں۔ وہ ان کے چھوٹے چھوٹے آدرش ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ میں اگر ایک عظیم ہستی سے محبت کرتا ہوں اور عظیم طاقت پر ایمان رکھتا ہوں تو پھر میں اس کا ذکر کیوں نہ کروں میں یہ کسی فائدے کے لئے نہیں کہہ رہا۔ میں یہ بات بخوبی جانتا ہوں کہ مذہب کو بہت سے لوگوں نے ایک کاروبار بنا لیا ہے وہ قرآن اور اسلام کو بیچ کر اپنے مفادات پورے کر رہے ہیں میرے نزدیک ایسے لوگ پیغمبر، قرآن اور اسلام کے دشمن ہیں۔ ان کی ایک مثال خلیج کی مسلمان ریاستوں کے بادشاہ ہیں۔ جب وہ یورپ آتے ہیں تو غیر اسلامی زندگی گزارتے ہیں وہ مذہب کے سب اصولوں کو توڑتے ہیں۔ میری نگاہ میں اسلامی معاشرے میں شہنشاہوں، بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور دقیانوسی مولویوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ بدقسمتی سے وہ لوگ جو جدید علوم سے بالکل بے بہرہ ہیں اسلام کے ٹھیکے دار بن گئے ہیں۔

سہیل: میں آپ سے اردو مرکز کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کس طرح وجود میں آیا اور آپ کا اس سے رشتہ کیسے استوار ہوا؟

افتخار: خالد! جب میں نے پاکستان ٹیلی ویژن سے ۱۹۷۷ء میں استعفی دیا تو میں سیاسی پناہ (Political Exile) لینے کے خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں پاکستانی حکومت کے تحت کام نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے خاموشی سے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ بعد میں مجھے بی سی سی آئی (B.C.C.I.) میں ملازمت مل گئی اور میں لندن آگیا۔ ان دنوں الطاف گوہر اور مشتاق احمد یوسفی لندن میں مقیم تھے۔ ہم کچھ دوست مل کر بیٹھا کرتے تھے اور پاکستان کے حالات کے بارے میں تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔ مجھے ہمیشہ پاکستانی ہونے پر فخر رہا ہے۔ میں سندھی بھی ہوں اور مسلمان بھی۔ اس لئے جب میں کہتا ہوں کہ میں بیک وقت سندھی، پاکستانی اور مسلمان ہوں تو مجھے اس میں کوئی تضاد

نظر نہیں آتا۔ میرے نزدیک یہ میری ذات، میری شخصیت اور میری شناخت کے مختلف پہلو ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے میں بیک وقت خاوند بھی ہوں، باپ بھی اور بیٹا بھی۔ میرے لئے ان سب کرداروں میں کوئی تضاد نہیں۔ جب لندن میں ہم سب دوست مل بیٹھتے تھے تو ایک دوسرے سے اخبار، رسائل اور کتابیں مانگ کر پڑھا کرتے تھے۔ پھر ہمیں احساس ہوا کہ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں یہ سہولتیں میسر ہیں۔ چنانچہ ہم نے سوچا کہ ایک ایسا ادارہ بنایا جائے جس میں ایسے لوگوں کو بھی کتابیں، رسالے اور اخبار پڑھنے کا موقع ملے جو ان سہولتوں سے محروم ہیں۔ آغا حسن عابدی کو جو بینک کے صدر تھے، ہمارا خیال پسند آیا۔ چنانچہ انہوں نے اردو مرکز قائم کیا اور مجھے اس کا اعزازی سکریٹری مقرر کیا۔ اگرچہ میں ملازم بینک کا تھا لیکن کام اردو مرکز میں کرتا تھا۔

چونکہ اردو پاکستان میں ہی نہیں ہندوستان میں بھی بولی جاتی ہے اس لئے میں نے اردو مرکز کو ہندوستانی، پاکستانی یا برٹش (British) ادارہ نہیں بنایا بلکہ اس کی عمارت لسانی اور سیکولر بنیادوں پر رکھی۔ وہاں پاکستانی، ہندوستانی، بنگلہ دیشی، ہندو اور مسلمان، دائیں اور بائیں بازو کے سبھی ادیب اور شاعر آیا کرتے تھے۔ میں یہ بات فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو مرکز کی وساطت سے انگلستان کے لوگوں کی فیض، سبطِ حسن، سردار جعفری، اختر لایمان، اختر حسین رائے پوری، قدرت اللہ شہاب، گوپی چند نارنگ، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، این میری شمیل، ڈیو میتھیوز، محمد عمر میمن، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، کشور ناہید، جمیل لبی، جمیل الدین عالی، فارغ بخاری، شہرت

بخاری، کیفی اعظمی، مہندر سنگھ بیدی، انتظار حسین اور کئی دیگر ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ہم نے اردو زبان اور ادب کو مغربی ادب کی محفل میں پیش کرنا چاہا۔

خالد! آپ بھی مغرب میں زندگی گزارتے ہیں اور اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جب ہم پاکستان اور ہندوستان میں رہ کر کہتے ہیں کہ منٹو اور فیض بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں تو یہ درست نہیں ہے۔ یہ ایک سراب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا کوئی ادیب اور شاعر بھی بین الاقوامی طور پر نہیں مانا جاتا۔ ہماری زبان تک نہیں مانی جاتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ منٹو، راشد، میراجی، فیض، بیدی یا غلام عباس بڑے ادیب نہیں ہیں۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ بدقسمتی سے وہ ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو معاشی طور پر پسماندہ ہے۔ زبانیں اپنی قوم کے سیاسی اور معاشی حالات سے متاثر ہوتی ہیں۔ پطرس بخاری کہا کرتے تھے کہ کسی ادیب کا احترام اسکے قومی پرچم سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

بات صرف اردو مرکز کی نہیں ہے۔ ہم نے ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے مغرب میں اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہو سکے۔ اردو بولنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے اور انہیں ادب تخلیق کرنے کی تحریک مل سکے۔ پچھلے دس پندرہ سالوں میں پاکستان اور ہندوستان سے باہر یورپ، کینڈا اور امریکہ میں اردو کو بہت فروغ حاصل ہوا ہے بہت سی کتابیں چھپی ہیں بہت سی محفلیں برپا ہوئی ہیں اور وہ محفلیں لاہور کی محفلوں سے مختلف ہیں۔ لاہور میں حلقۂ اربابِ ذوق کی محفل میں اگر بیس لوگ جمع ہو جائیں تو وہ محفل

کامیاب سمجھی جاتی ہے۔ میں نے ٹورانٹو کے مشاعروں میں سینکڑوں لوگوں کو آتے دیکھا ہے اور کمال کی بات یہ تھی کہ وہ لوگ ٹکٹ خرید کر شاعروں کو سننے آئے تھے۔

خالد! میں تمہاری مثال بھی دیا کرتا ہوں۔ پہلی دفعہ جب میری تم سے ملاقات ہوئی تھی تو تم سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے شاعروں سے ملنے ٹورانٹو آئے تھے اس سے تمہاری زبان و ادب سے محبت ثابت ہوتی ہے اس وقت سے اب تک تم نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں بہت سے کیسٹ بنائے ہیں۔ کینڈا میں دوسرے لوگ بھی کام کر رہے ہیں فاروق حسن، اشفاق، حفظ الکبیر، نزہت، شاہین اور دوسرے شاعر سنجیدگی سے لکھ رہے ہیں۔ عابد اور کئی دوسرے دوست صحافت کا کام کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ پچھلے چند سالوں میں کینڈا میں ڈھیر سارا ادب تخلیق ہوا ہے۔

میں اس بارے میں کسی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ عمل کب تک جاری رہے گا۔ مستقبل کی کسے خبر ہے، ملک ٹوٹ جاتے ہیں ثقافتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں لیکن ہم سے جو ہو سکے ادب کی خدمت کرتے رہنا چاہیئے چاہے وہ اردو مرکز ہو یا اس جیسے دیگر ادارے ہوں چاہے وہ افتخار عارف ہو یا اس جیسے دیگر لوگ ہوں انہیں اپنا کردار ادا کرتے رہنا چاہیئے وہ خدا نہیں ہیں انسان ہیں انہیں اپنی زبان اور ادب سے عشق ہے اور ان کے عشق کا اظہار ان کے ادب سے ہونا چاہیئے انہیں اپنے گھر اور ملک سے دور رہ کر اردو کی خدمت کرتے رہنا چاہیئے چاہے ہم کامیاب ہوں یا نہ ہوں ہمیں تخلیق کا کام کرتے رہنا چاہیئے یہی ادیب کی زندگی کا مقصد ہے اور یہی

اس کی زندگی کو اعتبار بخشتا ہے۔ اگر ادیب اور شاعر ایسا نہیں کریں گے تو وہ اپنی دھرتی ماں اور اپنی ذات سے غداری کریں گے۔

سہیل: اردو مرکز جیسے ادارے کے ساتھ کام کرنے سے آپ کی اپنی تخلیقی زندگی کیسے متاثر ہوئی؟

افتخار: یہ ایک دلچسپ عمل ہے یہ ایک نازک سوال ہے یہ ایک دو دھاری تلوار پر چلنے کی طرح ہے جب ایک ادیب کسی ادبی ادارے کے ساتھ کام کرتا ہے تو وہ کام اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو زیادہ بھی کرتا ہے اور کم بھی۔ بہت سے ادیب جو ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار اور رسائل کے ساتھ کام کر رہے ہوتے ہیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ تخلیقی کام کر رہے ہیں، ثقافتی کام تخلیقی کام نہیں ہوتے وہ ایک سراب ہے لیکن وہ سراب انہیں وقتی طور پر خوش رکھتا ہے۔

اگر سہیل اور اشفاق اور نسیم اور عابد نے ٹورانٹو میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تو کون سی بڑی بات ہے سب نے ایک اچھی شام گزاری اور بس لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے مشاعرے کے بعد جب لوگ گھر جاتے ہیں تو سوچتے ہیں ''اس مشاعرے میں شاعروں نے کتنے برے برے شعر سنائے ہیں میں ان سے اچھے شعر کہہ سکتا ہوں'' اور یا ''اس مشاعرے میں بہت اچھی غزلیں سنائی گئیں۔ میں ان سے بہتر غزلیں لکھنے کی کوشش کروں گا۔'' اور پھر جب وہ لوگ شعر لکھتے ہیں تو بہتر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں ان مشاعروں اور محفلوں سے تحریک ملتی ہے۔ مغرب میں بسنے والے ادیبوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے سامنے مشرقی ادب بھی ہے اور مغربی ادب بھی

اور بیسویں صدی میں اچھا ادب تخلیق کرنے کے لئے عالمی ادب پر نگاہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ جب تک ہم عالمی صورتِ حال پر نظر نہیں رکھیں گے بہترین ادب تخلیق نہیں کرسکیں گے۔ مغرب میں بسنے والے ادیب عالمی ادیبوں سے نہ صرف مل سکتے ہیں بلکہ آسانی سے ان کا ادب پڑھ بھی سکتے ہیں۔ بہت سارا فرنچ، جرمن اور Spanishادب انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے ایسا ادب پاکستان میں بسنے والے ادیبوں کی دسترس میں نہیں ہے۔ بعض لوگ یورپ کے سفر کے دوران چند کتابیں خرید کر لے جاتے ہیں لیکن اکثر لوگ ان کتابوں سے محروم ہیں مغرب میں بسنے والے ادیب نہ صرف مغربی ادب کا مطالعہ کر سکتے ہیں بلکہ مغربی طرزِ زندگی کا قریب سے مشاہدہ اور تجربہ بھی کرسکتے ہیں اور پھر مشرقی اور مغربی تجربہ کو ملاکر سوچ بھی سکتے ہیں۔ اس دور کے مسائل عالمی ہیں اور ہمیں ان کا عالمی حل تلاش کرنا ہوگا۔ عالمی مسائل کا عالمی حل تلاش کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی مقامی شناخت کو بھول جائیں۔ میں پاکستانی شناخت کے بغیر بین الاقوامی شناخت حاصل نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ میری اپنی دھرتی ماں کے ساتھ وفاداری بھی بہت ضروری ہے۔

مغرب میں زندگی گزارنے سے ہم مغرب کی زندگی میں کچھ اضافے کرسکتے ہیں اور وہ ماحول ہماری زندگی میں کچھ اضافے کر سکتا ہے۔ بعض دفعہ دونوں طرف غلط فہمیوں کی دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں اور بعض حقدار اپنے حق سے محروم رہ جاتے ہیں لیکن اگر کوئی ادیب سچا ہے اور اعلیٰ پیمانے کا ادب تخلیق کررہا ہے تو اسے کوئی بھی

نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مغرب پا بلو نرودا اور نجیب محفوظ کو نظر انداز نہ کر سکا اگرچہ ان کا تعلق تیسری دنیا سے تھا۔ اگر کسی ادیب کی تخلیقات جاندار ہیں تو انہیں جلد یا بدیر کامیابی حاصل ہو گی۔

سہیل: آپ اردو مرکز میں کام کرنے سے اپنی تخلیقی زندگی پر اثرات پر روشنی ڈال رہے تھے۔

افتخار: میری تخلیقی صلاحیتوں کا کچھ حصہ تو انتظامی امور کی نذر ہو گیا مغرب میں رہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے عالمی ادب کے مطالعہ کا موقع ملا۔ پاکستان یا ہندوستان میں رہ کر تو ہم ایک دوسرے کے ادب کا مطالعہ بھی نہیں کر سکتے۔ لندن میں رہ کر مجھے نہ صرف پاکستان اور ہندوستان میں تخلیق ہونے والے اردو ادب کے پڑھنے کا موقع ملا بلکہ دوسری زبانوں کے ادب سے بھی آشنائی حاصل ہوئی۔ عالمی ادب کے مطالعہ کے بعد مجھے اپنے تخلیق کیے ہوئے ادب کا اندازہ ہوا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا لیکن یہ احساس ضرور ہوا کہ جب اتنا عظیم ادب تخلیق ہو رہا ہے تو پھر مزید لکھنے کا جواز کیا ہے اس احساس کی وجہ سے میں نے لکھنا کم کر دیا۔

''مہر دو نیم'' کی اکثر نظمیں انگلستان کے قیام کے دوران لکھی گئیں۔ میری شاعری عظیم شاعری نہیں ہے۔ لیکن میں نے سچ کہنے کی کوشش کی ہے۔ میں صرف اس وقت شعر کہتا ہوں جب مجھے تحریک ہوتی ہے اگر میرا ایک شعر بھی زندہ رہ گیا اور لوگوں کو دس سال بعد یاد رہا تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت انسان سمجھوں گا۔ میری خوشی کے لئے وہ ایک شعر ہی کافی ہو گا۔

سہیل: ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ آپ نے خاندانی زندگی بھی گذاری ہے

ایک شوہر اور باپ بننے نے آپ کی ادبی زندگی کو کیسے متاثر کیا؟

افتخار: یہ بات تو درست ہے کہ خاندان انسان کی زندگی کے ایک خلا کو پر کرتا ہے۔ خاندانی زندگی ایسی خوشیاں مہیا کرتی ہے جو کہیں اور سے نہیں مل سکتیں۔ میرے دو بچے ہیں اور میں انہیں ٹوٹ کر چاہتا ہوں۔ میں ان کی کامیابی اور خوشحال زندگی کے لئے دعاگو ہوں۔ میں ان کی کامیابیاں دیکھ کر پھولے نہیں سماتا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر میں شادی شدہ نہ ہوتا تو زیادہ ادب تخلیق کرتا۔ مجھے زندگی کے ایسے راستوں پر چلنے کا موقع ملتا جن پر میں ایک شادی شدہ انسان ہونے کے ناطے نہیں جاسکتا میرے خیال میں ایک ادیب کو نہ تو شادی کرنی چاہئے اور نہ بچے پیدا کرنے چاہئیں کیونکہ ان کاموں سے اس کی تخلیقی اور ادبی زندگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ خاندانی زندگی اسے محدود کرکے رکھ دیتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایک مسلمان ایک باپ اور ایک شوہر ہونے کے ناطے مجھے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں لیکن میں یہ باتیں ایک فنکار کی حیثیت سے کررہا ہوں اگر میں یہ بات نہ کروں گا تو اپنے آپ سے بددیانتی کررہا ہوں گا۔

مشرقی ادیبوں کے لئے ان کی شادیاں اور خاندانی زندگیاں پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہیں۔ آپ مغرب میں بسنے والے لوگوں کو دیکھیں وہ عمر بھر کبھی گھر کبھی رشتے، کبھی اپنا طرزِ اظہار بدلتے رہتے ہیں۔ وہ ایک آزاد زندگی گزارتے ہیں جبکہ مشرقی ماحول اور معاشرہ ہماری آزادی پر پابندیاں عاید کرتا رہتا ہے۔

آپ افتخار نسیم کو دیکھیں جو اب امریکہ میں رہ رہا ہے۔ وہ

ایک گے (Gay) مرد ہے۔ وہ میرا ایک قریبی دوست ہے۔ وہ ایک بہادر انسان ہے۔ دس سال پیشتر پنجاب کے ایک نوجوان میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ شاعری میں اپنے ہوموسیکشول ہونے کا اعلان کرتا اور اپنے محبوب کے ساتھ اپنے رومانوی تعلقات کے بارے میں غزلیں اور نظمیں لکھتا۔ ہمارے معاشرے میں اب بھی اسے غیر صحتمندانہ اور غیر فطری عمل سمجھا جاتا ہے۔ وہ ان تجربات کا اظہار صرف اسلئے کرسکا ہے کیونکہ وہ مغرب میں زندگی گزارتا ہے

پچیس سال پیشتر جب کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض نے اپنے رشتوں کے جسمانی پہلو کے بارے میں ادب تخلیق کرنا شروع کیا تو ان پر بہت سی پابندیاں عاید کی گئیں۔ وہ اب بھی معاشرے کے خوف سے نجانے کیا کچھ نہیں لکھ سکتیں۔ ہمارے معاشرے نے انہیں بہت دکھ دیے ہیں۔ انہیں اپنے تجربات کے اظہار کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ ہمارے معاشرے میں کوئی عورت اپنے Lesbian تجربات کے بارے میں لکھ سکتی ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا معاشرہ اس کی اجازت ہی نہیں دیتا۔

عورتوں کے مسائل اور جنسی مسائل کے علاوہ اور بھی کئی موضوعات ہیں جن پر ہمارے ماحول نے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ کیا پاکستان میں کوئی ایٹم بم بنانے کے خلاف ناول لکھنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ پاکستان کے دانشور بھی ایٹم بم بنانے کے حق میں دلائل پیش کرتے ہیں۔ اگر کسی نے ایسا ناول لکھا تو وہ غدار قرار دیا جائے گا۔ ہمارے ملک میں جس نے بھی کھل کر لکھا اس پر تنقید کی گئی۔ ممتاز مفتی اور سعادت حسن منٹو معتوب ٹھہرے۔ ہمارا معاشرہ بہت تنگ نظر

ہے۔

آپ ملک کی سیاسی صورتِ حال پر نگاہ ڈالیں۔ بے نظیر بھٹو الیکشن میں حصہ لے رہی ہیں۔ ان کے بارے میں جو مولویوں کے بیانات ہیں ان پر مغرب میں بسنے والے کبھی یقین نہ کریں گے وہ بیانات ہمارے معاشرے کے مولویوں کی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں وہ مولوی ہمیں سینکڑوں سال پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔ اگرچہ میں بھی خدا اور مذہب پر ایمان رکھتا ہوں لیکن جب وہ مولوی مجھے بتاتے ہیں کہ بے نظیر کافر ہوگئی ہے اور اس کا نکاح منسوخ ہوگیا ہے تو مجھے یقین نہیں آتا۔ ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ مجبور و مظلوم گروہ عورتوں کا ہے۔ ہندوستان میں عورتوں نے جہیز اور ذات پات کی تقسیم کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ مصر میں بھی عورتوں نے اپنی آزادی و خود مختاری کے لئے جدوجہد شروع کر رکھی ہے لیکن پاکستان میں عورتیں اب بھی زیرِ عتاب ہیں۔ روایت پرست لوگ انہیں اپنے حقوق سے محروم رکھے ہوئے ہیں وہ اب بھی اپنے جذبات، مسائل اور خوابوں کا اظہار نہیں کر سکتیں۔

سہیل: آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کی پرورش ایک غریب خاندان میں ہوئی آپ کو اپنے بچپن کی زندگی کے بارے میں کیا کچھ یاد ہے۔

افتخار: آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔ جب میں ٹیلی ویژن پر ''کسوٹی'' نامی پروگرام کیا کرتا تھا تو جو لوگ وہ پروگرام دیکھتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ میرا حافظہ بہت اچھا ہے۔ جب لوگ اس کی وجہ پوچھتے تو میں کہتا ''یہ خدا کی دین ہے''۔ میری غربت نے مجھے وہ بنا دیا ہے جو اب میں ہوں۔ ہمارے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ ہمارے گھر میں مٹی کے

تیل کے لیمپ جلا کرتے تھے۔ رات کو جب سب لوگ سو جاتے تھے تو میں اسکول کا سبق یاد کرنے کی کوشش کرتا تھا میں چیزوں کو بار بار دہراتا تاکہ وہ مجھے یاد رہیں۔ غریب طالب علم ہونے کی وجہ سے نہ تو میں کتابیں خرید سکتا تھا اور نہ ہی ان کی فوٹو کاپی کروا سکتا تھا اسی لئے مجھے سارا کام حافظے سے کرنا پڑتا تھا۔

آپ نے شاید غور کیا ہو کہ میری عینک کے شیشے بہت موٹے ہیں۔ بچپن میں میری نظر بہت کمزور تھی لیکن خاندان میں کسی کی بھی توجہ اس طرف نہیں گئی۔ بزرگوں میں سے کسی نے بھی میری نظر ٹیسٹ نہیں کروائی۔ نویں جماعت میں ایک دفعہ میرے استاد بدرالدین صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں بلیک بورڈ پر لکھا سوال حل کروں۔ میری نظر اتنی کمزور تھی کہ مجھے بلیک بورڈ ہی نظر نہ آرہا تھا۔ وہ میرے قریب آئے اور انہوں نے مجھے تھپڑ مارا جب میں نے کہا مجھے بلیک بورڈ نظر نہیں آرہا تو انہیں اچانک احساس ہوا کہ میں سچ بول رہا ہوں۔ وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس نے مجھے عینک تجویز کی۔ مجھے آج بھی وہ تاریخ یاد ہے جب مجھے عینک ملی۔ وہ ۲۷ر ستمبر ۱۹۵۷ء کا دن تھا۔ اس سے پہلے لاشعوری طور پر میں ان مضامین میں اچھا تھا جنہیں سمجھنے کے لئے بلیک بورڈ کی ضرورت نہیں تھی چنانچہ ادب اور تاریخ میرے محبوب مضامین تھے سائنس اور حساب میں میں کمزور تھا۔

سہیل: آپ نے یونیورسٹی میں کون سے مضامین لیے تھے؟

افتخار: میں نے پہلے اردو اور سوشیالوجی پڑھے اور پھر ہندی اور سنسکرت کا مطالعہ کیا۔ پھر میں لکھنؤ سے پاکستان چلا گیا۔

سہیل: آپ کس سال پاکستان گئے تھے؟

افتخار: ۱۹۶۵ء میں

سہیل: آپ کا پاکستان جانے کا تجربہ کیسا رہا۔

افتخار: میں خوش قسمت تھا کہ مجھے تعصبات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میرے پہلے بزرگ سلیم گیلانی تھے جو پنجابی تھے انہوں نے نہ صرف مجھے ملازمت دی بلکہ میری مدد بھی کی۔ میرے دوسرے مہربان اسلم اظہر تھے۔ وہ بھی پنجابی تھے۔ انہوں نے مجھے ٹیلی ویژن کے لئے تیار کیا۔ وہ میرے گرو تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ ایک نیک انسان تھے۔ انہوں نے مجھے کامیابی کی راہ پر ڈالا۔ ان کے بعد فیض صاحب اور قاسمی صاحب نے بھی میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

جب میں پاکستان آیا تو مجھے احساس ہوا کہ لوگ شاعروں اور ادیبوں کا احترام نہیں کرتے ان کا خیال تھا کہ صرف کند ذہن لوگ شاعری کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا تعارف کرواتا ''میں شاعر یا ناول نگار ہوں'' تو لوگ پوچھتے ''آپ اور کیا کرتے ہیں۔''

چنانچہ میں نے شاعری پر توجہ دینے کی بجائے ٹیلی ویژن میں نوکری حاصل کرلی۔ جب میں نے شاعری شروع کی اور ''فنون'' کے قاسمی صاحب نے مجھے جانے بغیر شاعری کو چھاپا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔

ایک اور دوست جس نے مجھے ایک شاعر کی حیثیت سے عوام سے متعارف کروایا وہ شفیع عقیل تھا جو میری شاعری کو 'جنگ' اخبار میں شائع کیا کرتا تھا۔

میں نے چونکہ میڈیا میں کام کیا ہے اس لئے میں پبلسٹی کے رازوں سے واقف ہوں۔ میرے نزدیک ہر فنکار اپنے آپ کو

پروموٹ (Promote) کر رہا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ انسان کو اپنی پبلسٹی میں خودداری سے کام لینا چاہئے اور اپنے اصولوں پر قائم رہنا چاہئے۔ میں اپنی نظمیں پہلے ''فنون'' میں چھپواتا تھا۔ جب وہ وہاں چھپ جاتی تھیں تو پھر میں شفیع عقیل کو بھیج دیتا تھا جنہیں وہ ''جنگ'' میں چھاپ دیتا تھا ''فنون'' میں خواص مجھے پڑھتے اور ''جنگ'' میں عوام۔ میرے لئے عوام تک پہنچنا بھی بہت اہم تھا کیونکہ میں ان کے لئے ہی لکھتا ہوں۔ شفیع عقیل مجھے ''جنگ'' میں عزت سے چھاپتا تھا۔

جن دنوں میں کراچی میں تھا وہاں مقامی ادیبوں کا ایک گروپ بن چکا تھا۔ میرا اس گروپ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں اچھے شاعروں کی قدر کرتا تھا چاہے وہ کسی شہر کے بھی ہوں۔ میں مجید امجد اور ظفر اقبال کی قدر کرتا تھا اس لئے نہیں کہ وہ پنجابی تھے بلکہ اس لئے کہ وہ اچھے شاعر تھے ادب میں کوئی کوٹا سسٹم نہیں ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فاروق حسن اچھا شاعر ہے کیونکہ وہ کینڈا میں رہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک اچھا شاعر ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ عبداللہ حسین اچھا نثر نگار ہے۔ کیونکہ وہ لندن میں رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبدالحسین ہمارے دور کے بہترین ناول نگاروں میں سے ایک ہے۔ ہم ان ادیبوں کی اس لئے قدر نہیں کرتے کہ وہ مغرب میں رہتے ہیں اور معذور ہیں۔ اطہر شاد بہت اچھا شاعر ہے اس لئے نہیں کہ وہ بلوچ ہے یہ علیحدہ بات کہ وہ ایک اچھا بلوچ شاعر ہے جو ایک ضمنی بات ہے اس کی کتاب ''سنگار'' پچھلے دس پندرہ سال کی شاعری کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔

سہیل: ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زندگی میں ایک خاص جاذبیت پائی جاتی ہے۔ میڈیا کی زندگی نے آپ کے عورتوں سے تعلقات کو کیسے متاثر کیا؟

افتخار: ٹیلی ویژن نے میری زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ میں ٹیلی ویژن کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ پاکستانی قوم بہت محبت کرنے والی قوم ہے میں بہت خوش تھا کیونکہ لوگ مجھے چاہتے تھے۔ میں جب پاکستان سے باہر آیا تب بھی لوگوں نے مجھے بہت عزت دی جب میں نے شاعری کرنی شروع کی تو لوگوں کا پہلا تاثر یہ تھا کہ ٹیلی ویژن کا افتخار عارف اب شاعری کرنے لگا ہے لیکن ایک دفعہ میرے بزرگ سلیم احمد نے کہا ''افتخار عارف تمہیں میڈیا اور ادب میں سے ایک کو چننا ہوگا'' میں نے کہا کہ میں ایک ادیب کے حوالے سے مقبول ہونا چاہتا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ ٹیلی ویژن کی شہرت صرف ایک نسل کی شہرت ہے جو دس سال سے زیادہ قائم نہیں رہتی۔ سلیم احمد نے مشورہ دیا کہ شاعری کے بارے میں میرا رویہ سنجیدہ ہونا چاہئے۔

خالد! میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ مارشل لا کی حکومت کے دوران مجھے پاکستان بلایا گیا کہ میں ٹیلی ویژن کے پروگرام بناؤں۔ جب بے نظیر بھٹو وزیراعظم بنیں اور اسلم اطہر ٹیلی ویژن کا چیرمین بنا تو اس نے بھی مجھے دعوت دی۔ اخباروں نے بھی یہ خبر چھاپی کہ افتخار عارف واپس آرہے ہیں لیکن میں نے جانے سے انکار کردیا اب میں ٹیلی ویژن میں ادب کے حوالے سے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

سہیل: میں آپ سے پوچھ رہا تھا کہ ٹیلی ویژن کی زندگی نے آپ کے عورتوں سے تعلقات کو کیسے متاثر کیا؟

افتخار: میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ باقی صحت مند نوجوانوں کی طرح

میں بھی عورتوں کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا پڑتا۔ میں کئی عورتوں کے قریب آیا ان سے تعلقات قائم کیے۔ اب میں ان رشتوں کے بارے میں کھل کر بات کرتے شرماتا ہوں کیونکہ میرے بچے جوان ہیں۔ اب مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں ان عورتوں کے بارے میں اظہارِ خیال کروں جو کسی اور کی بیویاں بن چکی ہیں اور بچوں کی مائیں ہیں۔ میں ان کی زندگیوں کو متاثر نہیں کرنا چاہتا۔

سہیل: آپ نے شادی کا فیصلہ کیسے اور کب کیا؟

افتخار: میری شادی کا فیصلہ میری پیدائش سے پہلے ہی خاندان والوں نے کر رکھا تھا۔

سہیل: وہ کیسے؟

افتخار: میری والدہ اور خالہ نے ایک دوسرے سے وعدہ کر رکھا تھا کہ ان کے بچوں کی ایک دوسرے سے شادی ہوگی۔ چنانچہ میری شادی میری کزن سے ہوگئی اور اس کے بھائی کی شادی میری بہن سے ہوئی ۔ میں ہندوستان میں پلا بڑھا۔ میری بیوی پاکستان میں جوان ہوئیں۔ مجھے بتادیا گیا تھا کہ میری شادی میری کزن سے ہوگی اور ایسا ہی ہوا۔

سہیل: اپنی شادی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

افتخار: میری بیوی ایک سادہ مزاج کی نیک عورت ہے۔ وہ بہت ہی اچھی ماں ہے۔ کسی بھی عورت کا مجھ جیسے پیچیدہ انسان کے ساتھ نباہ کرنا بہت دشوار ہے۔ ادیب ویسے بھی مشکل قسم کے انسان ہوتے ہیں میں کبھی کبھار آدھی رات کو خوبصورت نظم پڑھ کر یا کلاسیکی موسیقی

سن کر رونے لگتا ہوں۔ مجھے موسیقی سے بے حد لگاؤ ہے۔ میں مہدی حسن، استاد بندو خان، امانت علی، سلامت علی اور کئی دیگر فنکاروں سے مل چکا ہوں وہ ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے ہیں۔ میرے دفتر میں ادیب، شاعر، موسیقار اور علماء سب جمع ہوا کرتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے وہ سب مختلف نظریات کے مالک تھے لیکن وہ اپنے اپنے موقف کے بارے میں سنجیدہ اور سچے تھے۔

سہیل: جب آپ اپنے ماضی کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو کیا آپ اپنے آپ کو ایک کامیاب انسان تصور کرتے ہیں؟

افتخار: میں نہیں جانتا کہ کامیاب انسان کون ہوتا ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ عالمی سطح پر ادب کی اہمیت کم ہوتی جارہی ہے اور میں یہ دیکھ کر افسردہ ہو جاتا ہوں۔ مغرب میں بھی ادبی رسالوں کی وہ اہمیت نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ سنجیدہ ادبی کتابوں اور شاعری کے مجموعوں کا بھی یہی حال ہے۔ فکشن کاروبار کی کامیابی کی وجہ سے کامیاب ہے اگر کوئی ادیب بیسٹ سیلر (Best Seller) لکھ کر بڑے بڑے پبلشرز کو رام کرلیتا ہے تو وہ کامیاب ہے ادیبوں نے اپنے ایجنٹ رکھے ہوئے ہیں جو ان کی کتابوں کو دوسری ضرورت کی اشیاء کی طرح بیچتے ہیں۔ ادب اب کاروبار بن چکا ہے مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ میں ایک چھوٹے سے ملک کا چھوٹا سا شاعر ہوں۔ بدقسمتی سے وہ ملک بھی ہمیشہ بحران کا شکار رہتا ہے۔ اگر دنیا میں پاکستان کی کوئی قدر نہیں تو میری قدر کیا ہوگی۔ پاکستان میں بہت سے -Talent ed) ادیب موجود ہیں جن سے ہم بے خبر ہیں وہ سندھی، پنجابی او دیگر زبانوں میں لکھتے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک مں لوگ

برازیل، فرانس اور چین کے ادیبوں سے تو واقف ہیں لیکن اپنے ملک کے شاعروں سے واقف نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں تخلیق ہونے والا ادب بین الاقوامی مارکٹ میں صحیح طریقے سے پیش نہیں کیا جاتا۔ اگر وہ ترجمہ ہوتا بھی ہے تو بھونڈے طریقے سے اور اپنی ہی قوم کے لوگوں میں تقسیم ہوتا ہے وہ ادب (Ghettos) کا ادب بن جاتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ہم اپنے ادب کے معیاری تراجم کر کے بین الاقوامی مارکٹ میں پیش کریں تاکہ دنیا بھر کے لوگ اسے پڑھ سکیں اور ہم بھی اس پر فخر کر سکیں۔

سہیل: آپ کا اگلے چند سالوں کا کیا پروگرام ہے؟

افتخار: میں مغرب میں رہ رہا ہوں لیکن میں مغربی ادیب نہیں ہوں میں پاکستانی ادیب ہوں۔ میں ایک پاکستانی بن کر خواب دیکھتا ہوں جب میں ''مٹی'' کی بات کرتا ہوں تو میں گرد و غبار کی بات نہیں کر رہا ہوتا۔ ''مٹی'' میری تاریخ ہے، میری آئیڈیالوجی ہے۔ میرا ایمان ہے۔ مٹی سے میری قدریں، یادیں اور خواب وابستہ ہیں۔ میں انشاء اللہ واپس پاکستان جاؤں گا اور پاکستان کی مختلف زبانوں میں افہام و تفہیم بڑھانے کی کوشش کروں گا۔ میرے لئے پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو سب قومی زبانیں ہیں اور برابر کی عزت کی حقدار ہیں۔ ان زبانوں میں ادب کا عظیم سرمایہ موجود ہے۔ ہم سب کو ایک دوسرے کی تخلیقی صلاحیتوں کو تحریک دینی ہے تاکہ ہم اعلیٰ ادب تخلیق کر سکیں اور پھر اسے مغربی دنیا کو پیش کر سکیں۔ ایسا کرنے سے ہمارے ملک، زبان اور ادب کو قدر و منزلت ملے گی۔

غریب ملکوں کی زبانیں کیا

اور

کلچر کیا

اشفاق حسین سے انٹرویو

ٹورانٹو، دسمبر ۱۹۹۰ء

سہیل: اشفاق میاں! ویسے تو آپ سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرنا ہے لیکن چونکہ ہماری ملاقات سب سے پہلے اردو انٹر نیشنل کے حوالے سے ہوئی تھی اس لئے کیوں نہ گفتگو کا آغاز اسی سے ہو۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ اردو انٹر نیشنل کا خیال آپ کے ذہن میں کیسے آیا اور اس کی داغ بیل کیسے پڑی؟

اشفاق: یہ ایک طویل کہانی ہے۔ میں پہلے کچھ باتیں پس منظر کے طور پر بیان کردوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ساری عمر یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ میں جزوقتی ادیب ہوں یا کل وقتی۔ جب میں زندگی کے گذشتہ بیس سالوں پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ نجانے وہ میرے مطالعے کا اثر تھا تجربے کا یا ماحول کا کہ مجھے نوجوانی میں ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ میرا Medium of Expression شاعری ہے۔ چنانچہ میں نے اس میدان میں dedicated انداز میں قدم رکھا شفق تخلص بھی رکھا لیکن جب یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد میں

Literary activities میں involve ہوا تو میں نے شاعری سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اگر کوئی شفق کہہ کر بلاتا تو میں جواب نہ دیتا۔ میں اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ میرا شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس کنارہ کشی میں کچھ حد تک کامیاب بھی ہوا لیکن لٹریچر سے علیحدہ ہونے کے باوجود بھی میں اپنے آپ کو پوری طرح علیحدہ نہ کرسکا کیونکہ میرا سوشل سرکل وہی رہا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میرے دوست بدل جاتے، میں اور چیزوں میں دلچسپی لیتا، فلم یا کھیل کے رسالے پڑھتا۔ لیکن میں پھر بھی ادبی رسالے ہی پڑھتا۔ اگرچہ میں ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۰ء تک مشاعروں میں شریک نہ ہوا اور محفلوں میں شعر نہ پڑھے لیکن پھر بھی اٹھنا بیٹھنا ادبی شخصیتوں کے ساتھ ہی رہتا اور اس طرح میں اپنے آپ کو ادبی کاروائیوں سے in touch پاتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے آپ پر اور دوسروں پر یہ ثابت کرسکوں کہ میں ادب سے لاتعلق ہوچکا ہوں لیکن میں اس کوشش میں فیل ہوگیا اور مجھے اپنی شکست کا اندازہ شمالی امریکہ آنے کے بعد ہوا۔ میں جب ۱۹۸۰ء میں کینڈا آیا تو دو چار محفلوں اور مشاعروں میں گیا اور بس لیکن جب ایک سال کے بعد میں واپس پاکستان گیا اور دوستوں سے ملا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھ میں اور میرے دوستوں میں ایک خلیج حائل ہوگئی ہے مثلاً وہ جب کسی نئی کتاب کا ذکر کرتے تو مجھے اس کا پتہ ہی نہ ہوتا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر ایک سال کے بعد یہ حال ہے تو اگر میں کینڈا میں پانچ سات سال رہنے کے بعد جاؤں گا تو مجھے کچھ پتہ ہی نہ رہے گا۔ اب تو کینڈا میں صورتِ حال بدل گئی ہے لیکن دس سال پہلے ماحول بالکل مختلف تھا۔ جو لوگ یہاں دس سالوں سے رہ رہے ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ اس وقت تک نہ تو لوگوں کو نئی کتابوں کی خبر ہوتی تھی نہ رسالوں کی۔

مجھے جب یہ احساس ہونے لگا کہ میں ادبی فضا سے کٹا ہوا ہوں تو میں نے سوچا کہ اگر میں ایک رسالہ نکال لوں تو اس سے ادبی ماحول سے رابطے کی ایک صورت بھی نکل آئے گی اور میرا شوق بھی پورا ہوتا رہے گا۔

اسی دوران فیض صاحب بھی شمالی امریکہ آئے تھے اور مجھے ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے ان سے رسالہ نکالنے کا ذکر کیا تو انہوں نے اشارتاً میری حوصلہ افزائی کی۔ جب ان سے اگلے سال دوبارہ ملاقات ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی حوصلہ افزائی رسمی نہ تھی بلکہ وہ تعاون کرنے کو بھی تیار تھے جب ہمارا پہلا شمارہ نکلنے لگا تو مجھے اندازہ ہوا کہ پاکستانی ادیبوں سے تو میرا direct رابطہ تھا لیکن ہندوستان کے ادیبوں سے براہِ راست مراسم نہ تھے چنانچہ جب میں نے فیض صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے active role ادا کیا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ فیض صاحب تساہل پسند آدمی ہیں چیزوں کو lightly لیتے ہیں لیکن اس موقع پر وہ تاثر غلط نکلا۔ اردو انٹرنیشنل کے سلسلے میں ان کی شخصیت کا دوسرا رخ میرے سامنے آیا۔ جب Letter head چھپ گئے تو انہوں نے ایک خط علی سردار جعفری کو اور ایک محمد حسن کو لکھا تاکہ وہ ہم کو تعاون کر سکیں، پھر کہنے لگے کہ ایک دو رسالے نکل آئیں گے تو یہ سلسلہ چل پڑے گا۔

چنانچہ اس طرح اردو انٹرنیشنل کا آغاز ہوا۔

سہیل: اردو انٹرنیشنل کے سلسلے میں اور کن کن لوگوں نے آپ کی حوصلہ افزائی اور عملی طور پر مدد کی؟

اشفاق: جب لوگوں کو ایک تصویر نظر آتی ہے تو اس میں کئی رنگ بھرے ہوئے ہوتے ہیں کچھ نمایاں ہوتے ہیں اور کچھ نمایاں نہیں ہوتے کسی تصویر میں جتنے رنگوں کے Shades ہوں وہ اتنی ہی اچھی لگتی

ہے۔

اردو انٹر نیشنل نے اردو ادب کے ان بیجوں کو جو ۱۹۸۰ء کی دہائی سے پہلے اس ماحول میں بوئے گئے تھے ایک تناور درخت بننے میں مدد دی۔ رسالہ نکلنے سے تین چار سال پہلے ۱۹۷۸ء میں فیض صاحب یہاں آچکے تھے اس وقت کچھ مشاعرے ہوئے ہوں گے کچھ ادبی کاروائیاں ہوئی ہوں گی ۱۹۸۰ء میں بھی فیض اور ایلس آئے تھے۔ اس زمانے میں پہلی دفعہ جو شعراء ہندوستان سے آئے تھے ان میں علی سردار جعفری، اخترالایمان اور کیفی اعظمی شامل تھے چنانچہ مقامی لوگوں کو ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا۔ اس وقت تک فاصلوں کا احساس کافی تھا۔ جب پاکستان اور ہندوستان سے شعراء اور ادیب شمالی امریکہ آنے لگے تو ایک ادبی فضا پیدا ہوئی اور لوگوں میں کچھ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ رسالہ نکالنے کے لئے جو ماحول چاہئے تھا وہ پیدا ہو چکا تھا اور جب ماحول پیدا ہو جائے تو ایک بڑے Project کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

بنیادی طور پر رسالہ نکالنے میں ٹورانٹو کی دو شخصیتیں میرے بہت قریب رہیں ایک ڈاکٹر عبدالقیوم لودھی تھے جو ٹورانٹو میں سوشیالوجی کے پروفیسر تھے اور Progressive نقطۂ نظر کے حامی تھے دوسری طرف نئے لوگوں میں عابد جعفری ہمارے ساتھ تھے وہ ''امروز'' اخبار نکالا کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ Pure Literary Activity میں بھی Involve ہونا چاہتے تھے چنانچہ شروع میں یہاں پر عابد جعفری اور قیوم لودھی نے میری مدد کی اور میرے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔

سہیل: جب اردو انٹر نیشنل کے ایک دو شمارے نکل آئے تو اردو دنیا سے کس قسم کا Response آیا؟

اشفاق: اردو دنیا سے جو Response آیا، وہ حیرت انگیز تھا ویسے تو آپ کو

بھی اندازہ ہے کیونکہ آپ بھی اس میں involve تھے کہ مجھے کس قسم کے خطوط آیا کرتے تھے میں ان میں سے بہت سے چھاپتا بھی نہ تھا کیونکہ ان میں میری ذاتی تعریف کے بہت سے پہلو نکلتے تھے اور میں سوچا کرتا تھا کہ کہیں لوگ مجھے کانوں میں تو نہیں گھسیٹ رہے۔ لوگوں نے اسے ضرورت سے زیادہ سراہا چنانچہ ایسی -Re sponse نے بھی اس پروجیکٹ کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔

سہیل: اردو انٹرنیشنل کے آپ نے خصوصی نمبر بھی نکالے اور بعض شماروں میں خصوصی گوشے بھی شامل کیے۔ ان باتوں کا خیال آپ کو کیسے آیا؟

اشفاق: اس سے پہلے کہ میں اس سوال کا جواب دوں میں ایک پچھلے سوال کے بارے میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں آپ نے جب پوچھا تھا کہ کن شخصیتوں نے میرے ساتھ تعاون کیا تو میں نے صرف ٹورانٹو کی شخصیات کا ذکر کیا تھا۔ مجھے رسالہ نکالنے میں پاکستان اور ہندوستان سے بھی کافی Support ملی تھی۔ ابتداء میں ہمارے دوست پروفیسر حسن عابد نے بڑا Role ادا کیا۔ وہی کتابت کرواتے تھے اور رسالے کے بارے میں بہت سی چیزوں کا خیال رکھتے تھے میں ان کا بہت احسان مند ہوں۔

جب کوئی بڑا پروجیکٹ شروع ہوتا ہے تو اپنے گھر والوں اور قریبی دوستوں سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور پھر لوگ اس میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میرے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ پھر کچھ ایسے نام تھے جو بظاہر نظر نہ آتے تھے لیکن درپردہ بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے ان میں محمد علی صدیقی تھے، آغا سہیل تھے شارب ردولوی تھے قمر رئیس تھے علی

سردار جعفری تھے افتخار عارف تھے ان سب نے ہر قدم پر مدد کی۔ اس طرح ایک ٹیم بن گئی تھی۔ مجھے لوگوں سے تعاون میری امیدوں سے زیادہ ملا تھا۔ دوستوں کا ایک سرکل بن گیا تھا۔ 'افکار' کے صہبا لکھنوی صاحب نے مدد کی۔ جب ہم اردو انٹرنیشنل کی پہلی کاپی جوڑ رہے تھے تو صہبا صاحب وہاں موجود تھے انہوں نے Approval دی تھی صہبا صاحب نے جو عملی تعاون کیااس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ لیکن میری آنکھیں ان لمحوں کی گواہ ہیں۔

آپ نے جو پوچھا کہ خاص نمبر کا خیال کیسے آیا تو ہمارے دوستوں میں ایک نام ڈاکٹر قمر عباس ندیم کا تھا۔ وہ مجھ میں اور حسن عابد کے درمیان ایک Link تھے۔ جن دنوں میں ادب سے کنارہ کش ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا ان دنوں میں محمد علی صدیقی، قمر عباس ندیم، علی حیدر ملک، اکرام بریلوی، جون ایلیا اور کئی دیگر دوستوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اس دور میں ادب کے بارے میں میرے رویے کو سنجیدہ بنانے میں قمر عباس ندیم کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کی شخصیت نے مجھ پر بہت سے اثرات مرتب کیے تھے وہ میرے دوست تھے انہوں نے محبت سے میری کئی خامیوں کو دور کیا تھا۔ میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ ان کی جلدی موت سے اردو ادب ایک بڑے ادیب اور افسانہ نگار سے محروم ہو گیا اور میں یہ بات رسمی طور پر نہیں کہہ رہا۔ وہ چونکہ میرے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اس لئے میں اس پر زیادہ بحث نہیں کروں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ جب میں پہلا شمارہ نکال رہا تھا تو میں نے سوچا کہ دوستی کا یہ فرض ہے کہ ہم قمر عباس ندیم کی شخصیت پر کچھ لکھیں۔ جب شخصیتیں قد آور ہو جاتی ہیں تو سب نمبر نکالتے ہیں فیض پر اقبال پر تو سب ہی خصوصی نمبر نکالتے ہیں لیکن ایسے لوگ جن میں صلاحیتیں تھیں لیکن وہ کسی وجہ سے اپنا کام پورا نہ کر سکے ان کو بھی نظر انداز نہیں کرنا

چاہئے بلکہ Apreciate کرنا چاہئے چنانچہ دوستی کے حوالے سے بھی اور ادب کے حوالے سے بھی میں نے پہلے شمارے میں قمر عباس ندیم پر ایک گوشہ مرتب کیا اور اس کا نام رکھا ''صحبتِ گل'' بہت سے لوگوں نے اسے سراہا وہ گوشہ اس لحاظ سے لوگوں کو پسند آیا کہ اس میں کوئی غرض نہ تھی۔ لوگ تو یہ بھی سوچتے ہیں کہ جب کوئی اڈیٹر کسی شخصیت پر نمبر نکال رہا ہوتا ہے تو اس کی اپنی کیا غرض ہوتی ہے۔

''صحبتِ گل'' نکالنے کا مقصد اپنے جذبات کا اظہار اور قمر عباس ندیم کی خدمات کو سراہنا تھا۔

وہ گوشہ نکالنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مجھے اپنے رسالے میں کچھ ایسی بات رکھنی چاہئے کہ وہ باقی رسالوں سے مختلف رہے آج کل جو رسالے نکلتے ہیں ان میں کچھ غزلیں کچھ نظمیں کچھ افسانے کچھ مضامین جمع کر دیے جاتے ہیں۔ قمر عباس ندیم کے گوشے کو لوگوں نے Appreciate کیا تو میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے سوچا کہ رسالے میں کچھ سنجیدہ مطالعے کا پہلو رکھنا چاہئے اس لئے اس سے اگلا شمارہ بیروت کے بارے میں تھا۔ جن میں فیض صاحب کی اور فراز کی نظمیں شامل تھیں۔ میں نے ان سب کو سیاہ حاشیے کے ساتھ چھاپ دیا۔ وہ ایک بڑے مقصد کے لئے ایک چھوٹا سا Contribution تھا۔ اس طرح ہمارے رسالے نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔

اسی دوران پاکستان کلچر کے موضوع پر ایک کانفرنس ہو رہی تھی میں نے اس کے کچھ Papers حاصل کیے اس طرح ایک شمارہ پاکستانی ثقافت کے حوالے سے چھاپا ثقافت کا مسئلہ تو ہم Immi-grants کیلئے ایک Sensitive Issue تھا ہی لیکن پاکستان میں بھی ۱۹۷۱ء کے بحران کے بعد Pakistani Identity اور Cultural Crisis کو شدت سے محسوس کیا گیا تھا وہ 70s کا خاص موضوع تھا۔

جس نمبر پر مجھے خاص طور پر خوشی ہوئی وہ جنوبی افریقہ کا

نمبر تھا اس میں کچھ نیلسن منڈیلا کے حوالے سے کچھ فرازؔ کی نظموں کے حوالے سے مضامین اور نظمیں جمع کی گئیں ایک فیضؔ کی نظم افریقہ کے بارے میں تھی ایک کہانی آپ نے اس موضوع پر لکھی تھی۔ ویسے تو اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن چند چیزیں جمع کر کے ایک نمبر نکالنا بہت خوشی کی بات تھی۔

اس کے بعد سبطِ حسن کے بارے میں ایک گوشہ نکالا بہر حال کوشش یہ تھی کہ بعض شماروں میں ایسے گوشے ہوں کہ وہ نمبر یاد رہیں۔

سہیل: اردو انٹر نیشنل کے اب تک کتنے شمارے نکل چکے ہیں؟

اشفاق: ہم نے سال میں تین شمارے نکالنے کا سوچا تھا ہم نے ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۸ء تک تیرہ شمارے نکالے تھے۔ بعد کے شماروں میں تو آپ بھی شامل تھے۔

سہیل: آج کل آپ فیض نمبر کی تیاریاں کر رہے ہیں وہ نمبر کس مرحلے میں ہے؟

اشفاق: ۱۹۸۸ء سے جو ہمارا اردو انٹر نیشنل نہیں نکلا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں نے 'فیض نمبر' نکالنے کا اعلان کر دیا تھا لیکن جس قسم کا نمبر میں نکالنا چاہتا تھا وہ ہو نہیں پا رہا تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ ''اردو انٹر نیشنل'' کے نام سے ہی کراچی سے ایک رسالہ نکلنے لگا ہے میں نے سوچا کہ چلو سلسلہ تو آگے بڑھ رہا ہے۔ 'فیض نمبر' کا چونکہ میں اعلان کر چکا ہوں اس لئے میں کئی حوالوں سے Committed ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے کتابی صورت میں پیش کر سکوں اس کا ۹۰ فی صد کام مکمل ہو چکا ہے امید ہے اگلے سال تک وہ میرے

سامنے آجائے گا اس میں کئی چیزیں نئی ہوں گی۔

سہیل: میں نے پچھلے چند سالوں میں یہ بھی محسوس کیا ہے کہ شمالی امریکہ میں جہاں کہیں بھی فیض صاحب کا نام آتا ہے چاہے وہ کانفرنس ہو یا سیمینار آپ کا ذکر بھی ضرور آتا ہے۔ آپ کے فیض صاحب کے ساتھ اس خصوصی رشتے کا آغاز کیسے ہوا؟

اشفاق: فیض صاحب کے نام کے ساتھ جب لوگ مجھے associate کرتے ہیں تو میں اسے اپنے لئے بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے چاہنے والوں کی فہرست طویل ہے اور وہ چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں عاشقانِ فیض کی فہرست میں اگر میرا نام بھی آجائے تو میری خوش قسمتی ہے فیض صاحب سے عقیدت کے بہت سے حوالے ہیں۔ شخصیت کے حوالے سے بھی اور اس ماحول کے حوالے سے بھی جس میں میں پلا بڑھا۔ میرا بچپن ایک غریب گھرانے میں گزرا تھا۔ مجھے کچی آبادی کے مکینوں کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جب آپ گندی نالیوں میں پلے بڑھے ہوں اور میں یہ بات محاورتاً نہیں کہہ رہا تو انسان اپنے ماحول کو تبدیل کرنے کے بارے میں سوچتا ہے۔ ماحول کیسے تبدیل ہونا چاہئے اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں آنی چاہئیں مجھے اس کا پتہ نہیں تھا لیکن اتنا احساس تھا کہ Present Setup میں کچھ نہ کچھ خامی ہے کچھ نہ کچھ کجی ہے۔

اس زمانے میں مجھے شاعری کا بھی شوق تھا اور سیاست کا بھی۔ ہمارے علاقے میں .N.S.F کی ایک ذیلی تنظیم بن گئی تھی اس کے Banner پکڑنے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ میں طلباء کی سیاسی کاروائیوں میں ایک لیڈر کی حیثیت سے نہیں ایک ورکر کی

حیثیت سے involve تھا۔ وہ ایوب خان کے زوال کا زمانہ تھا۔ اور طلباء بہت active ہو گئے تھے۔ انہی دنوں اخباروں میں لندن سے طارق علی کی تصویریں اور پیرس سے جنرل ڈیگال اور طلباء کی جنگ کے بیانات چھپا کرتے تھے۔ پاکستان میں بھی طلباء پر زیادتیاں ہو رہی تھیں۔ کئی طالب علموں کو شہر بدر کر دیا گیا تھا۔ بہر حال ان حالات میں میں آہستہ آہستہ Anti Establishment لوگوں اور گروہوں کے قریب آتا گیا۔ عین ممکن تھا کہ ان دنوں میں پوری طرح سیاست میں ہی چلا جاتا لیکن شاعری نے مجھے بچائے رکھا مجھے ادب کے Pro-gressive نقطۂ نظر میں زیادہ کشش نظر آئی۔ اس موقع پر میں فیض صاحب سے متاثر ہوا۔ پتہ چلا کہ وہ جیل بھی گئے۔ میں نے ان کی شخصیت اور شاعری کو پڑھا تو مجھے ان میں ایک توازن ملا۔ انہوں نے سیاست اور ادب کے درمیان ایک متوازن نقطہ نظر اپنا رکھا تھا۔

یہ سب باتیں تو پس منظر کے طور پر ہوئیں پیشِ منظر کے طور پر یہ ہوا کہ ۱۹۷۴ء میں جب میں یونیورسٹی میں تھا تو یونیورسٹی میں ایک طالب علم کو تھیسس (Thesis) لکھنے کا موقع ملتا تھا خوش قسمتی سے اس سال مجھے اس کا موقع ملا۔ چنانچہ میں نے فیض صاحب کی شخصیت پر تھیسس لکھا اس طرح مجھے فیض صاحب کو اور اس دور کے دیگر Contemporaries کو تفصیلاً پڑھنے کا موقع ملا۔ اسی دوران Progressive Movement کے مطالعہ کا بھی موقع ملا کیونکہ اس کے بغیر فیض صاحب کا مطالعہ بہت مشکل تھا۔ اس مطالعہ کے بعد ۱۹۷۶ء میں میری کتاب ’’فیض۔ ایک جائزہ‘‘ کے نام سے شائع ہوئی۔

میری تھیسس کی جانچ پڑتال کرنے والوں میں پروفیسر ممتاز حسین شامل تھے انہوں نے مشورہ دیا کہ اسے کتابی صورت میں چھپوادو۔ میں طالب علم ہونے کے ناطے Shy تھا میں نے کہا کہ میں نے تو ادھر ادھر سے پڑھ پڑھا کر یہ چیزیں لکھی ہیں۔ ممتاز صاحب کا کہنا تھا کہ اگر Perfectionism کی طرف جاؤ گے تو نہ تو کچھ لکھ سکو گے نہ چھپواسکو گے کہنے لگے "آپ طالب علم ہیں اس لئے آپ کی پہلی کوشش کو لوگ سراہیں گے۔ پرابلم تو ہماری اسٹیج پر ہوتی ہے جب ایک ایک لفظ پر لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں آپ چھاپیں گے تو اس کی تاریخی حیثیت ہو جائے گی۔ ظفرالحسن صاحب کو پتہ چلا تو انہوں نے بھی حوصلہ افزائی کی پھر محمد علی صدیقی، حسن عابد، قمر عباس ندیم، آغا سہیل وغیرہ نے بھی حوصلہ بڑھایا اور میں نے وہ کتاب چھپوادی اب جبکہ وقت کے دریا سے بہت سا پانی بہہ گیا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ واقعی ابتدائی کوشش کی ایک اہمیت رہے گی۔ فیض صاحب کے بارے میں جو بھی تحقیق کرے گا وہ اس کتاب کا حوالہ دے گا اور اس کو اولیت حاصل ہوگی ویسے تو اول یا دوئم میں کوئی بات نہیں لیکن دل کو خوش رکھنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے۔

میں اپنی اس کتاب سے زیادہ مطمئن نہ تھا۔ بعض لوگوں نے تو فیض صاحب پر پی۔ایچ۔ڈی۔ کے Thesis لکھے ہیں اور اکثر میری کتاب کا حوالہ آتا ہے جو ایک طالب علم کی کوشش کے لئے بہت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے کام کی بجائے فیض صاحب کے نام کی زیادہ برکت تھی۔

شاید انہی وجوہات کی بنا پر جب شمالی امریکہ میں ان کی باتیں

ہوتی ہیں تو میرا نام بھی آتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ اردو انٹر نیشنل کی مجلسِ مشاورت میں بھی ان کا نام تھا۔

اتفاق یہ ہے کہ جب میری کتاب چھپی تھی اس وقت تک مجھے فیض صاحب سے ملنے کا موقع نہ ملا تھا کیونکہ میں بڑا Shy تھا اور وسائل بھی نہ تھے۔ ٹورانٹو میں مجھے فیض صاحب اور ایلس سے ملنے کا موقع ملا جب انہیں قریب سے دیکھا تو مجھ پر ان سے عشق کی سی کیفیت پیدا ہوگئی انہوں نے ذاتی طور پر مجھے کبھی مایوس نہیں کیا ان کے انتقال کے بعد رائٹرز فورم کی طرف سے فیض صاحب کے بارے میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ اب میں ایک تو اردو انٹر نیشنل کا فیض نمبر نکالنا چاہتا ہوں اور ایک ان پر علیحدہ سے کتاب چھاپنا چاہتا ہوں تاکہ فیض صاحب کے بارے میں میری کچھ Contribution ہو سکے۔

سہیل: اشفاق میاں! اردو انٹر نیشنل کے ساتھ ساتھ آپ نے پچھلے دس سالوں میں شمالی امریکہ میں بہت سی ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں کے انعقاد میں بھی Active role ادا کیا ہے کیا یہ آپ کے شوق کا فطری ارتقا تھا یا کسی Plan کے ساتھ ہوا تھا؟

اشفاق: میں تو دراصل پاکستان کی ادبی کاروائیوں سے بھاگا تھا بلکہ کراچی آرٹس کونسل میں ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک کام کرنے کے باوجود میں نے کسی مشاعرے میں دو شعر بھی نہ پڑھے تھے۔ میں نے اپنے پہلے شعری مجموعے کا، جو ''اعتبار'' کے نام سے چھپا تھا، نوے فی صد سے زیادہ حصہ نہ کہیں پڑھا تھا اور نہ کہیں چھپنے کو بھیجا تھا۔ بس اپنے دو چار دوستوں کو سنا دیا کرتا تھا۔ اسی لئے جن لوگوں کی نگاہ سے

''اعتبار'' نہیں گزرا ان کے لئے تو سارا کلام ہی نیا ہے۔ میں تو -Ac
tivitiesسے کٹ گیا تھا۔ میرا تو کبھی خیال بھی نہ تھا کہ رسالہ بھی
نکالوں گا مشاعروں کا بھی خیال نہ تھا لیکن جب ادبی معلومات میں کمی
کا احساس ہوا تو اس کو Bridgeبنانے کے لئے رسالہ نکالا۔ پھر
ہندوستان اور پاکستان سے ادیب آئے۔ مشاعروں کی داغ بیل پڑی،
کانفرنس منعقد ہوئیں اور ایک ادبی ماحول بنتا چلا گیا۔ انہی دنوں
رائٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈینز -Writers Forum of Pakis)
tani Canadians)معرضِ وجود میں آیا۔ میں اس کا فاؤنڈر
پریذیڈنٹ (Founder President) تھا۔ آرگنائزیشن کچھ کام کرنا
چاہتی تھی۔ چنانچہ ہم نے ۱۹۸۳ء میں مشاعرہ کروایا اس مشاعرے
کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں گا کر پڑھنے والا کوئی نہ تھا اس
میں منیر نیازی، کشور ناہید، جگن ناتھ آزاد، شان الحق حقی اور افتخار
عارف شامل تھے قاسمی صاحب طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہ
آسکے۔ اس تقریب کا مقصد یہ تھا کہ شمالی امریکہ میں ایک سنجیدہ
ادبی فضا پیدا ہو۔ شعر لکھنا ایک بات ہے لیکن جب اس پر تنقید ہو،
تحسین ہو، تبادلہ خیال ہو تو نئے نئے خیال بھی سامنے آتے ہیں۔

اس مشاعرے کے بعد کئی اور مشاعرے منعقد ہوئے کئی
کانفرنسوں کا اہتمام ہوا۔ اگرچہ ان کاروائیوں میں میں Forefront پر
تھا لیکن اس میں سب دوستوں کی مدد شامل تھی۔ اب تو میں اس میں
Involve نہیں ہوں لیکن ماشاء اللہ شمالی امریکہ کے ہر بڑے شہر میں
سال میں ایک دو مشاعرے ہونے لگے ہیں۔ اس طرح ان کاروائیوں
کا پھل تو آیا ہے۔

سہیل: آپ کے خیال میں اردو انٹرنیشنل، مشاعروں اور کانفرنسوں کی کاروائیوں نے آپ کے اپنے تخلیقی سفر کو کیسے متاثر کیا ہے؟

اشفاق: میرا خیال ہے کہ ان کاروائیوں کا میری اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر زیادہ اچھا اثر نہیں پڑا۔ اور میرا اپنا Literary Contribution کم ہوا۔ اب پتہ نہیں کہ اگر میں ان کاروائیوں میں Involve نہ ہوتا تو زیادہ لکھتا یا کم۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن پچھلے دو سالوں میں جبکہ میں نے رسالے اور مشاعروں کی کاروائیوں کو کم کردیا ہے میرا اپنا تخلیقی کام بڑھ گیاہے اور تین چار کتابیں ترتیب پارہی ہیں۔ ان میں سے ایک شاعری کا مجموعہ ہے اور ایک مضامین کا۔

ان Activities کا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف تقاریب پر مضامین لکھنے پڑے جن کی وجہ سے پندرہ سولہ مضامین کا مجموعہ جمع ہوچکا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان Activities کی وجہ سے Contemprary شاعروں، دانشوروں اور ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے ان ملاقاتوں سے بہت کچھ سیکھا ہوگا اور اپنی شخصیت میں ان تجربات کو سمویا ہوگا۔

رسالہ نکالنے میں وقت تو صرف ہوا لیکن اس سے آگاہی رہی کہ باقی لوگ کیا لکھ رہے ہیں۔ نقصان یہ ہوا کہ میں خود زیادہ نہ لکھ سکا لیکن اس میں میرے تساہل کا بھی دخل ہے اس دوران میرا تیسرا مجموعہ چھپ جانا چاہئے تھا لیکن اب وہ تیار ہے اور جلد چھپ جائے گا۔ بہرحال دیر آید درست آید۔ جب میں ۱۹۸۰ کی پوری دہائی کو دیکھتا ہوں اور اپنی Contributions کی طرف نگاہ کرتا ہوں تو

اپنے آپ کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا۔

سہیل: ہر ادیب اور شاعر کے لکھنے کا ایک انداز ہوتا ہے ایک Style ہوتا ہے بعض مسلسل لکھتے رہتے ہیں بعض کبھی کبھار لکھتے ہیں بعض کو جب تک ایک خاص قسم کی تحریک نہ ہو وہ نہیں لکھ پاتے آپ کے لکھنے کا کیا انداز ہے؟

اشفاق: جہاں تک شاعری کا تعلق ہے میں Regular لکھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جب جی چاہا لکھ دیا جب جی چاہا نہ لکھا۔ کبھی ہفتے میں تین چار چیزیں لکھ لیتا ہوں اور کبھی مہینوں کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے چیزیں Incidentsاور Feelings جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جب موڈ بنتا ہے تو ان سب چیزوں کا اظہار ہو جاتا ہے۔

سہیل: کس قسم کی چیزیں آپ کو تحریک دیتی ہیں مثال کے طور پر آپ کی ایک خوبصورت نظم اپنے بیٹے کے نام ہے کیا آپ کو یاد ہے کہ اس کا پس منظر کیا تھا اور کس چیز نے آپ کو وہ نظم لکھنے پر اکسایا؟

اشفاق: جیسے میں نے ابھی ذکر کیا تھا میرے ذہن میں چیزیں جمع ہوتی رہتی ہیں میں نے جو نظم اپنے بیٹے کے لئے لکھی تھی وہ ایک ذاتی نوعیت کی نظم ہے میں اپنے بچے کے ساتھ دو تین سال گزار چکا تھا پھر ایک دن جب میری بیوی اور بیٹا کہیں گئے ہوئے تھے اور میں گھر میں اکیلا تھا میرا موڈ بنا اور میں نے وہ نظم لکھ دی۔ مجھے تفاصیل یاد نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جب میں لکھنے بیٹھا ہوں گا اس وقت تک مجھے اندازہ نہ ہوگا کہ میں کیا لکھنے والا ہوں ایک کیفیت طاری ہوئی ہوگی کچھ بچے کی یاد آئی ہوگی کچھ دنیا کی بے ثباتی کا اندازہ ہوا ہوگا کچھ زندگی کے مقصد کے بارے میں سوچ رہا ہوں گا یہ سب سوال

میرے ذہن میں کہیں نہ کہیں ہوں گے جو نظم میں بظاہر کہیں نہیں ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ میں نے ان سب باتوں کے بارے میں سوچ کر نظم کہی ہو میرا خیال ہے کہ یہ سب چیزیں میرے ذہن میں کہیں نہ کہیں پکتی رہی ہوں گی۔ میں نے سوچا ہوگا خاندان میں اضافہ ہوا ہے بچہ ہوا ہے کبھی ہم بھی بچے تھے بچے جوان ہوتے ہیں بوڑھے ہوتے ہیں مر جاتے ہیں زندگی کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اکثر انسان زندگی کے مختلف مراحل پر ان مسائل کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں میرے اندر وہ سب چیزیں جمع ہوتی رہیں اور پھر ایک لمحے میں جب بچے کی یاد آئی یا اپنی بے ثباتی پر رونا آیا تو سب کچھ کاغذ پر اتر آیا۔ ممکن ہے اپنے آپ کو تسلی دے رہا ہوں کہ میں تو ختم ہو جاؤں گا لیکن میرا بچہ دنیا میں رہے گا مجھے تفاصیل یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ اس کیفیت میں بیٹھا اور پندرہ بیس منٹ میں وہ پوری نظم لکھ ڈالی لیکن یہ تو ایک عام سی بات ہوئی اس نظم میں ایک اور Angle یہ ہے کہ اس میں ہر Immigrant نسل کے ایک مسئلے کا ذکر بھی ہے اگرچہ میں نے شعوری طور پر نہیں سوچا لیکن میرے لاشعور میں ضرور ہوگا کہ اگلی نسل کا مستقبل کیا ہوگا کیا ہم ان پر اپنا Cultural Heritage مسلط کریں گے یا انہیں اس ماحول میں کھلا چھوڑ دیں گے یا دونوں کے درمیان ایک توازن قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ میرے خیال میں یہ مسائل ہم سب کے مسائل ہیں اپنی زبان کا مسئلہ، کلچر کا مسئلہ۔ ہمیں بہت سی اپنی روایتیں اچھی بھی لگتی ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ غلط ہیں وہ غلامی کے دور کی جاگیردارانہ نظام کی روایتیں ہیں ہمیں ان کے غلط ہونے

کا احساس بھی ہے لیکن پھر بھی ہم ان سے جڑے رہتے ہیں۔ کہنہ اور فرسودہ روایات کو توڑنا ایک Immigrant Parent کا اہم مسئلہ ہے۔ جب میں نے اپنے بیٹے کے نام نظم لکھی تو دراصل وہ نئی نسل سے خطاب تھا جو ذاتی حوالے سے آیا تھا۔

اکبرالہ آبادی نے لندن میں نظمیں لکھیں اقبال نے جاوید نامے میں اپنے بیٹے کے حوالے سے نظمیں لکھیں لیکن وہ سب دوسرے ماحول میں تھیں میں نے اس نظم کو لکھنے کے بعد غور کیا کہ ہمارے ہاں اور بہت سے لوگوں نے نئی نسل اور بچوں کے موضوع پر بہت سی چیزیں لکھی ہیں ان میں ان کیفیات اور مسائل کے مختلف شیڈز (Shades) ملتے ہیں

میری نظم میری اس وقت کی Feeling کا اظہار اور مختلف مسائل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

سہیل: نظم لکھنے کے بعد آپ کو کس قسم کی Feeling ہوتی ہے؟

اشفاق: ہر نظم یا غزل کے بعد تو نہیں لیکن بعض نظموں اور غزلوں کے بعد، جن میں یہ احساس ہو کہ میں اپنی Feelings بیان کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں بہت خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک فطری خوشی۔ بیٹے کے نام نظم لکھنے کے بعد بھی مجھے اس قسم کی خوشی ہوئی کیونکہ میں اپنی Genuine Feeling کے اظہار میں کامیاب ہوا تھا۔ نظم لکھنے کے بعد ایک Relaxed Feeling کا احساس ہوا۔

سہیل: بیٹے کی بات چلی ہے تو کچھ خاندان کے بارے میں باتیں ہو جائیں آپ پچھلے دس سال سے ایک Family Life گزار رہے ہیں بیوی ہے، بچے ہیں، گھر ہے، ان سب چیزوں نے آپ کی تخلیقی زندگی کو

کس طرح متاثر کیا ہے؟

اشفاق: Family Life چاہے پاکستان میں ہو یا شمالی امریکہ میں تخلیقی زندگی پر اثرانداز ہوتی ہی ہے۔ شمالی امریکہ آنے سے فرق یہ پڑا کہ بیوی کے بارے میں میرے رویے میں بہت تبدیلی آئی عورتوں کے بارے میں جو میرے نظریات تھے ان میں کچھ ہل چل پیدا ہوئی۔ پاکستان میں ہوتا تو ممکن ہے میں بھی اپنی بیوی سے اسی طرح پیش آتا جس طرح دادا میری دادی کے ساتھ اور میرے والد میری والدہ کے ساتھ پیش آتے تھے اگرچہ ان میں محبت تھی لیکن وہ ماحول عورتوں کے ساتھ انصاف نہ کرتا تھا۔ یہاں آکر مجھے اپنی بیوی کا ہی نہیں اور عورتوں کے مسائل کا بھی احساس ہوا اور اس نے بھی مجھے اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کیا۔ اس طرح غیر منصفانہ چیزیں کم ہوئیں۔ بہت سی چیزیں جو بچپن سے شخصیت کا حصہ بن جائیں وہ جاتی تو نہیں لیکن کم ہو رہی ہیں۔ اسی لئے بیوی کے بارے میں میرا وہ رویہ نہیں ہے جو شاید پاکستان میں ہوتا۔ اہم بات یہ ہے کہ جب ایک طرف سے تبدیلی ہوتی ہے تو دوسری طرف سے بھی تبدیلی ہوتی ہے شادی تو ادارہ بھی دو شخصیتوں کا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میری فیملی میری تخلیقی زندگی میں کبھی آڑے نہیں آئی بلکہ اس سے Encouragement ہی ہوئی ہے۔

جس زمانے میں میں رسالہ نکالا کرتا تھا اس دوران ہوتا یہ تھا کہ جب میرے بچے نو یا دس مہینے کے ہو جاتے تھے اور Crawl کرنے لگتے تھے تو میرے لئے لکھنے پڑھنے کا کام مشکل ہو جاتا تھا۔ Frus-tration بھی ہوتی تھی لیکن Disturb ہونے میں بھی ایک Pleas-

ure ہے۔

میری بیوی نے میرے ساتھ بہت Cooperate کیا بلکہ میں بیوی کے حوالے سے اپنے آپ کو خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں۔

سہیل: خاندان کی بات چلی ہے تو اس خاندان کے بارے میں کچھ بتائیں جس میں آپ پیدا ہوئے اور پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے؟

اشفاق: وہ ماحول تو آج کے ماحول سے بالکل مختلف تھا میں کراچی کی ایک جھگیوں کی بستی میں پیدا ہوا تھا۔ کچی آبادی تھی۔ ہمارے خاندان میں سال سوا سال کے بعد ایک بچے کا اضافہ ہو جاتا تھا اور ایک بچہ پیدا ہونے کے دوران ہی میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میں غربت کے ماحول میں پلا بڑھا۔ اس ماحول میں ناز نخروں کی کوئی گنجائش نہ تھی اس ماحول میں Survival سب سے بڑی قدر تھی۔ میرے والدین، بہن بھائی سب اس ماحول میں Struggle کر رہے تھے۔ رات کی سردی میں بغیر گرم کپڑوں کے رہنا بذاتِ خود ایک مسئلہ تھا۔ ان حالات کے اپنے تقاضے تھے۔ بعض دفعہ تو ہم دنوں بلکہ ہفتوں تک والد صاحب کی شکل نہ دیکھتے تھے۔ ہمارے صبح اٹھنے سے پہلے والد صاحب کام پر چلے جاتے تھے اور شام کو ہمارے سونے کے بعد لوٹتے تھے۔ ان حالات میں ہم نے جن دشواریوں کا سامنا کیا ہو گا اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے والدین کا تعلق بنارس اور جونپور کے روایتی خاندانوں سے تھا۔ ہمارا گھرانہ مسلمان تھا کچھ ادب اور شعر و شاعری سے شوق بھی تھا۔ اس خاندان کے لوگ ادیب عالم اور منشی فاضل کیا کرتے تھے۔ مڈل تک کی تعلیم بھی

بہت سمجھی جاتی تھی ویسے خاندان میں شعر و شاعری کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ خاندان میں اگر شادی بیاہ کا موقع ہوتا اور خاندان کے بزرگ بیٹھے ہوتے تو اکثر شاعری کی باتیں کیا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی، میرے بچپن میں، جب کوئی سوشل فنکشن ہوتا تو ہمارے بزرگ مذہب کی، پاکستان کی، مسلم لیگ کی، اور ادب کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اب میں اپنے خاندان کو دیکھتا ہوں تو ان موضوعات کے علاوہ ہر موضوع پر گفتگو ہوتی ہے۔ اب باتیں دولت بنانے اور سفارش کرنے کی ہوتی ہیں۔ ہمارے بزرگوں کے پاس دولت نہیں ہوتی تھی لیکن ان کے چہروں پر اطمینان نظر آتا تھا۔ تمام مشکلات کے باوجود تلخیوں کا احساس نہ ہوتا تھا۔ انہی خاندانوں کے بچے اب فخر کرتے ہیں کہ انہیں اردو نہیں آتی ایک ہی Generation میں قدریں بہت بدل گئی ہیں۔ ہمارے بزرگ بیٹھتے تھے تو بچوں سے کہتے تھے چلو میاں بیت بازی ہو جائے اور ہم بچے اس میں مشغول ہو جاتے تھے چاہے ہمیں دو چار اشعار ہی آتے ہوں۔ بچے تو بنیادی طور پر توجہ چاہتے ہیں چنانچہ ہمیں شعر و شاعری کی وجہ سے بزرگوں کی توجہ ملتی تھی ویسے تو ہمارے بزرگ مار دھاڑ سے بھرپور شاہکار بزرگ تھے ان کا بہت رعب ہوتا تھا اور بچے بزرگوں سے خوف کھاتے تھے غصے میں آتے تو ایک چماٹ رسید کر دیتے لیکن انہی بزرگوں کو اشعار سناتے تو وہ خوش ہو جاتے اس طرح شعر و شاعری بچوں اور بزرگوں کے درمیان ایک Bridge کا کام کرتی تھی۔

سہیل: آپ کا اسکول کا زمانہ کیسے گزرا؟

اشفاق: وہ زمانہ تو بہت برا گزرا۔ جس مہینے اسکول کی فیس جمع کرانی ہوتی

اور اگر گھر والوں کے پاس فیس نہ ہوتی تو کہتے چلو اگلے سال اسکول میں داخل کروادیں گے۔ پہلی دوسری تیسری جماعت کی باتیں تو مجھے یاد نہیں پانچویں جماعت کی کچھ دھندلی سی یادیں ہیں ہمارا ا سکول اتنا دور تھا کہ بس میں بیٹھ کر جانا پڑتا تھا اور بس کا دو آنہ کرایہ ملتا تھا ایک آنہ جانے کا ایک آنہ آنے کا یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے میں اسکول سے بھاگ جایا کرتا تھا میں سوچا کرتا تھا کہ جب میں ان دو آنوں کی پھلکیاں، چھولے اور چنے کھا سکتا ہوں تو بس والوں کو دینے کا کیا فائدہ۔ تعلیم حاصل کرنے کا چکر میری سمجھ میں نہ آتا تھا لیکن یہ بھی تھا کہ جب پڑھتا تو دل لگا کر پڑھتا اسکول میں کبھی فیل نہیں ہوا۔ چھٹی جماعت میں چالیس طلباء میں میری چوتھی پوزیشن آئی تھی ۶۷۔۶۶ء میں میں نے میٹرک کر لیا تھا۔

وہاں جو اساتذہ ملے ان میں سے کچھ پرانی وضع کے تھے شیروانی پہنا کرتے تھے ان کے رویوں سے لگتا تھا کہ معلمی کو ایک عبادت سمجھتے ہیں انہوں نے تعلیم میں دلچسپی دلوائی یہ تو اب میں سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے اس وقت تو وہ بے نام کیفیتیں تھیں۔

میٹرک کرنے کے بعد نوکری کی فکر ہوئی اور شام کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کلرکی مل گئی تو کچھ عرصہ وہ بھی کرلی۔ پھر میں نے بی۔ اے۔ کا امتحان دیا۔ سب دوست اور خاندان والے چاہتے تھے کہ میں اسٹنٹ سپرٹنڈنٹ آف پولیس (A.S.I.) بن جاؤں۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ لیکچرر بننا ہے۔ یونیورسٹی ان دنوں شام کے وقت ہوتی نہ تھی پرائیویٹ میں کرنا نہ چاہتا تھا۔ میں دل لگا کر محنت سے ایم۔اے۔ کرنا چاہتا تھا۔ آخر میں

نے نوکری چھوڑ کر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ مجھے پتہ تھا کہ میری پوزیشن آئے گی۔ اس وقت میں نے کسی کی کوئی بات نہیں سنی جو میرے اپنے دل میں آیا وہی کیا کیونکہ مجھے اردو ادب سے شوق تھا میری ایم۔اے۔ میں سیکنڈ پوزیشن بھی آئی فیض پر کتاب بھی لکھی اب وہ سب باتیں سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ میں نے اپنے دل کی بات مانی۔

پھر ایک سال گورنمنٹ کالج کورنگی میں پڑھایا۔ پھر اس کا شوق بھی ختم ہوگیا۔

سہیل: اسکول اور کالج کی زندگی میں کیا آپ Shy تھے یا Outgoing؟

اشفاق: میری Personality شروع ہی سے Shy رہی ہے۔ آج بھی لوگ جب مجھے مشاعرہ Conduct کرتے یا تقریر کرتے دیکھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ یہ کیسے Shy ہو سکتا ہے لیکن میں خود جانتا ہوں کہ میں کتنا Shy ہوں۔

سہیل: اگر آپ Shy تھے تو ٹیچر بننے کا اور طلباء و طالبات کو لیکچر دینے کا شوق آپ کو کیونکر ہوا؟

اشفاق: ٹیچر بنتا تو میرا آئیڈیل تھا۔ ہو سکتا ہے Shy ہونے کی Degrees ہوں یونیورسٹی میں جب طلباء نے کہا کہ اگلے سال شفق زیدی کو وائس پریذیڈنٹ بنائیں گے تو میں بہت گھبرایا وہ تو مجھے ریڈیو کی بزمِ طلباء میں مشاعروں میں پڑھتا دیکھتے تھے لیکن اپنے دل کا حال تو میں ہی جانتا تھا میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ الیکشن کا وقت آیا میں Unapposed جیت گیا اور Vice President بن گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ فلاں شخص کو جنرل سکریٹری بناؤ تا کہ کچھ کام ہو سکے میں

اکیلا تو کچھ نہ کر سکوں گا چنانچہ جنرل سکریٹری بھی بن گیا۔ سب سے زیادہ جھگڑا جائنٹ سکریٹری کی پوسٹ کا ہوا۔ جب اسٹوڈنٹس یونین بن گئی تو رسمِ حلفِ وفاداری کا انتظام کیا گیا۔ سندھ کے وزیرِ تعلیم اور وائس چانسلر بھی آگئے جب سب پہنچ گئے تو مجھ پر گھبراہٹ اور شرمندگی کا دورہ پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں تقریر سے گھبرایا اور مہمانوں کی بوتلیں ٹھنڈی کرنے کے بہانے ادھر ادھر بھاگ گیا۔ میں جانتا تھا کہ وائس چانسلر اور باقی لوگ میرا انتظار نہ کریں گے چنانچہ فنکشن ختم ہوگیا اور میں بغیر حلف اٹھائے Vice President بن گیا۔ بات یہ تھی کہ میں Shy تھا اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ جناب آپ تو Vice President تھے آپ کیسے Shy ہو سکتے ہیں۔ ہر انسان تضادات کا مجموعہ ہے میرے اندر بھی کچھ تضادات ہوں گے۔

سہیل: اسکول اور کالج کے زمانے میں آپ کی ادبی مصروفیات کا کیا عالم تھا؟

اشفاق: ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۶ء تک میں سکول میں تھا۔ وہاں سے ایک رسالہ نکلا کرتا تھا میرا بھی جی چاہا کہ اس میں کچھ لکھوں چنانچہ میں نے ''انصاف کرکٹ کلب'' کے بارے میں ایک نظم لکھی وہ نظم Reject ہوگئی البتہ اسکول کے نصاب میں نویں جماعت میں پہنچتے ہی غزل پڑھائی جاتی تھی غالبؔ کا شعر تھا۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

سال بھر تک مجھے سمجھ نہ آیا کہ یہ ''فر'' کیا ہے ''یاد آیا'' تو سمجھ آتا

تھا لیکن 'فر' سمجھ نہ آتا تھا بعد میں پتہ چلا کہ وہ ''فریاد آیا'' ہے۔
لیکن غزل پڑھنے سے اردو ادب کا مزا آنے لگا۔ اس سے پہلے تو ہم پہاڑ اور گلہری کی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ میرؔ اور غالبؔ ہمارے لئے بڑے نام تھے ان کی غزلیں اپنی کتاب میں پڑھنے سے غالبؔ کا تو کم اپنی Greatness کا زیادہ احساس ہوتا۔ اس طرح آہستہ آہستہ Literary Taste Develop ہوتا رہا۔ اسی دوران اعلیٰ پیمانے کے افسانے' پڑھے پریم چند کے افسانے' قاسمی کے افسانے میٹرک اور انٹر میں شاعری اور نثر دونوں پڑھے انٹر کے Advanced Urdu کے کورس میں جتنے Paper تھے ان سب میں میری Distinction تھی اس سے اندازہ ہورہا تھا کہ دلچسپی بڑھ رہی ہے میں اردو کی کتابوں کو درسی کتابیں بلکہ ذاتی کتابیں سمجھ کر پڑھتا تھا۔

سہیل: کیا آپ کا خاندان مذہبی تھا؟ اور ان کے عقاید نے آپ کی شخصیت کو کیسے متاثر کیا؟

اشفاق: والد صاحب سے تو کبھی ملاقات ہی نہ ہوتی تھی وہ تو دن بھر ملازمت کے جھگڑوں میں الجھے رہتے تھے والدہ غربت کے ماحول میں روایتی زندگی گزارتی تھیں۔ جمعرات کی رات کو اگر بتی جلانا نوحے پڑھنا ان کا معمول تھا میرے والدین عملی طور پر تو نہیں البتہ Culturally مذہبی تھے۔ ہمارے خاندان میں نوحوں اور مجلسوں کی کافی روایت تھی جن میں مرثیے بھی پڑھے جاتے تھے اور مرثیوں کا شاعری سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق تو تھا ہی۔

جیسے سب غریب خاندان کہتے تھے پڑھو لکھو اور اللہ سے کامیابی کی دعا مانگو وہ ہماری مشکلات کم کرے اس طرح ہمارے

خاندان والے بھی کرتے تھے۔ میں ان کی باتوں پر زیادہ توجہ نہ دیتا تھا۔ میرے والدین کی یہ خواہش تھی کہ میں میٹرک پاس کرلوں اس زمانے میں میٹرک کی بڑی اہمیت ہوتی تھی اس سے White Collar Job مل جاتا تھا وہ چاہتے تھے کہ میں بس کنڈکٹر نہ بنوں اور کلرک بن جاؤں جو ان دنوں ایک بڑی بات تھی۔

سہیل: پاکستان سے کینیڈا آنے کا فیصلہ کن حالات میں ہوا؟

اشفاق: اس زمانے میں میں آرٹس کونسل میں کام کررہا تھا لیکن ذہنی طور پر میرا Political Involvement کافی بڑھ گیا تھا۔ سیاست میں نہیں لیکن سیاسی نظریوں سے۔ ان دنوں مارشل لا لگ چکا تھا اور کرفیو لگنے لگے تھے دو دو مہینے کرفیو لگا رہتا مجھے وہ پورے شہر کو قید کرنے کی طرح لگتا تھا چونکہ ان کے پاس اتنے بڑے جیل خانے نہیں تھے اس لئے وہ پورے شہر میں کرفیو لگا دیتے تھے کرفیو کا ماحول میرے لئے بہت تکلیف دہ تھا اس کی کوئی Logic ہی نہ تھی۔ اگر شہر میں فسادات ہوں تو بجائے اس کے بارے میں کوئی Dialogue ہو یا Political Solution تلاش کریں سارے شہر کے لوگوں کو چوبیس گھنٹے کے لئے بند کردیتے تھے کرفیو جس سوسائٹی میں عام ہوجائے وہاں کے عوام پریشان ہوجاتے ہیں چنانچہ میں بھی پریشان تھا۔ ضیاء الحق نے مارشل لا لگایا تو حالات اور بھی ابتر ہوگئے۔ مارشل لا تو پہلے بھی لگا تھا لیکن ضیاء الحق کے مارشل لا نے کچھ نئی چیزیں Introduce کرنی شروع کردیں Islamization کا عمل تیز ہوا۔ آرٹس کونسل میں ہر ہفتے نیا Directive آجاتا مثال کے طور پر ہر خط اور ہر تقریب کا آغاز بسم اللہ سے ہو۔ پھر ان چیزوں میں

Contradictions بھی نظر آتے تھے کہاں ایک طرف ڈانس اور گانوں کا پروگرام اور دوسری طرف ابتدا بسم اللہ سے ہو مجھے اپنا Job کرتے ہوئے اپنے اندر ایک Hypocracy نظر آ رہی تھی اس دور میں آرٹ میں بھی تصویریں بنانے کی بجائے Caligraphy کو فروغ دیا گیا۔ آرٹس کونسل میں آپ Nude Paintings کی نمائش نہیں کرا سکتے تھے۔ مجھے اپنے Job میں جو مزا آیا کرتا تھا وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا پھر ماہِ رمضان آیا تو ہوٹلوں پر پردے ڈال دیے جاتے اور پھر چھاپے پڑنے لگے۔

مجھے احساس ہوا کہ صرف حکومت میں ہی نہیں معاشرے کے طرزِ زندگی میں تبدیلیاں آنے لگی ہیں اور ان کا رخ Funda-mentalism کی طرف ہے چنانچہ میں اس ماحول سے نکل بھاگنے کی تدبیریں تلاش کرنے لگا۔ جب ماحول سے Disillusionment ہوا تو وہاں سے چلے جانے کا سوچنے لگا مجھے لگ رہا تھا کہ سوچ پر، فکر پر اور رویوں پر جبر بڑھتا جا رہا ہے۔

سہیل: لیکن پاکستان سے نکلنے اور کینڈا آنے کا آخری فیصلہ کیسے ہوا؟

اشفاق: میرا پہلے خیال جرمنی جانے کا تھا تیاری بھی کر لی تھی لیکن ہمارے گھر والے مصر تھے کہ شادی کر کے جاؤ لیکن مجھے شادی کر کے اور بیوی کو پاکستان میں چھوڑ کر جانا گوارا نہ تھا۔ لوگوں کو یہ احساس تو اب ہوا ہے کہ لڑکے گھر سے جائیں گے تو واپس نہیں آئیں گے لیکن پہلے تو یہ امید ہوتی تھی کہ وہ تعلیم حاصل کر کے واپس آ جائیں گے۔ انہیں یہ ڈر ضرور رہتا تھا کہ کہیں پڑھ پڑھا کر کسی انگریز سے شادی نہ کر لیں۔ میرے ذہن میں تو واپس آنے کا کوئی

ارادہ ہی نہ تھا آخر فیصلہ یہ ہوا کہ خاندان میں ہی شادی ہو جائے اور میں کینیڈا چلا آؤں لیکن پھر یہ پتہ چلا کہ مجھے شادی کے تین مہینے کے اندر اندر جانا پڑے گا اس طرح جرمنی جانے کی بجائے کینیڈا چلا آیا۔

سہیل: آپ نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا کہ پاکستان سے نکلنے سے کچھ ہی عرصہ پہلے آپ کی کتاب ''اعتبار'' بھی چھپی تھی۔

اشفاق: یہ ۱۹۷۹ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت تک میری صرف فیضؔ والی کتاب چھپ چکی تھی لیکن اس کا بھی زیادہ ذکر نہ تھا کیونکہ کتاب کا ذکر بھی Personal Lobby کی وجہ سے ہوتا ہے مجھے اس وقت اتنے زیادہ لوگ جانتے بھی نہیں تھے۔ جب ملک چھوڑنے کا فیصلہ ہو گیا تو سوچا کہ نئے ملک میں نجانے کیسا ماحول ہو کیوں نہ میں جتنی چیزیں لکھ چکا ہوں انہیں Compile کر کے چھپوادوں۔

سہیل: آپ کہہ رہے تھے کہ آپ نے اپنی نظمیں اور غزلیں کبھی کسی نوٹ بک میں نہ لکھی تھیں۔

اشفاق: ہاں مجھے اپنی ساری نظمیں اور غزلیں زبانی یاد تھیں۔ مجھے تو فیضؔ صاحب کا پورا کلام زبانی یاد تھا۔ چنانچہ ایک دن بیٹھ کر میں نے ساری کتاب لکھ ڈالی اس کی کتابت کروائی، چھپوائی اور دوستوں میں تقسیم کر دی۔

سہیل: پاکستان میں تو آپ کالج میں پڑھاتے رہے اور آرٹس کونسل کے ساتھ منسلک رہے کینیڈا آنے کے بعد ملازمت کا کیا سلسلہ ہوا؟

اشفاق: آپ تو کینیڈا میں رہتے ہیں آپ کو اندازہ ہے۔ پاکستان میں میری Specialized Field زبان و ادب پڑھانا تھا اور آرٹس کلچرل سنٹر

کے ساتھ کام کرنا تھا لیکن غریب ملکوں کی زبانیں کیا اور کلچر بھی کیا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ کوئی ایسا کورس کرلوں جس کی کینڈا میں ضرورت ہو چنانچہ Travel کا کورس پسند آیا کیونکہ اس میں سفر کرنے کی صورتیں بھی نکل آتی ہیں اور انسان ملک سے باہر ہو تو سفر کرنے کا بھی شوق ہوتا ہے اور ٹریول ایک نعمت نظر آتی ہے چنانچہ میں نے ٹریول میں ڈپلوما لیا اور ٹریول ایجنسی کے ساتھ منسلک ہوگیا اور اب تو اپنا کاروبار شروع کردیا ہے اس کا فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان جانے کے مواقع ملتے رہے اگر کسی اور ملازمت میں ہوتا تو پاکستان جانے کے وسائل نہ ہوتے۔

اس بزنس کا فائدہ یہ ہوا کہ مشاعروں یا کانفرنسوں میں شریک ہونے کی بھی سہولت رہی اور مواقع ملتے رہے

میرا بزنس بھی زیادہ تر پاکستانی اور انڈین کمیونٹی سے ہے اس طرح Community Involvement بھی بڑھتا رہا۔

سہیل: آپ ایک زمانے میں شفق زیدی کے نام سے لکھتے تھے کینڈا آکر وہ نام اشفاق حسین میں کیسے تبدیل ہوگیا؟

اشفاق: یہ کینڈا آکر نہیں ہوا۔ یونیورسٹی میں شفق زیدی کے نام سے لکھتا تھا لیکن جب شاعری سے دل اچاٹ ہوگیا تو میں نے شاعر کے طور پر متعارف ہونا بھی پسند نہ کیا۔ آپ شفق زیدی کے نام سے متعارف ہوں تو لوگ پوچھتے ہیں "تو کیا آپ شعر بھی کہتے ہیں؟" لیکن اگر اشفاق حسین کہہ متعارف تو کسی کو امید نہیں ہوتی۔ I did not want to be recognized as a poet میں نے ۱۹۷۵ء میں ہی شفق زیدی کا نام چھوڑ دیا تھا۔ اور مشاعروں سے چھٹی کرلی

تھی۔ وہ تو پھر کینڈا آکر دوبارہ ان Activities میں -Involve ment بڑھی۔

سہیل: آپ جب اپنے پاکستان اور کینڈا کے پندرہ بیس سالوں کے ادبی سفر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو کس قسم کا احساس ہوتا ہے؟

اشفاق: انسان وقت کے ساتھ ساتھ Mature ہوتا ہے اور اس کا نقطہ نظر بدلتا ہے مجھے اپنے پچھلے دس سال زیادہ Productive نظر آتے ہیں۔ ٹورانٹو میں ادبی فضا بنی، رسالہ نکالا، ٹی وی سے پروگرام کیا، رائٹرز فورم بنایا، شاعری کے ترجمے کی کتاب چھپی، کمیونٹی میں -Involve ment بڑھا اور اب تین چار کتابیں زیر ترتیب ہیں۔ میری تساہل پسند طبیعت کو دیکھتے ہوئے یہ بہت کام ہے۔

سہیل: اگلے چند سالوں میں کوئی ایسی خواہش یا Ambition ہے جو پچھلے چند سالوں میں پوری نہ ہو سکی۔

اشفاق: اگرچہ میں ہمیشہ شاعری کرتا رہا ہوں لیکن مجھے نثر سے ایک خاص قسم کی ذہنی قربت رہی ہے۔ کینڈا کی زندگی کے بہت سے -Experi ences شاعری میں بیان نہیں ہوسکتے شاعری میں کھل کر بات نہیں ہو سکتی اس لئے میرا Fiction کی طرف جانے کا خیال ہے لیکن اس کے لئے جو محنت کی ضرورت ہے اس کے لئے میں ابھی تیار نہیں لیکن جب یہ بند ٹوٹے گا تو وہ زندگی کے تجربے جو شاعری میں اس کی Diction And Limitations کی وجہ سے بیان نہیں ہوسکے شاید Fiction میں بیان ہوسکیں اب تک میری نثر تنقیدی مضامین کی نوعیت کی ہے لیکن میں تخلیقی نثر لکھنا چاہتا ہوں میرا خیال ہے کہ میرے اندر صلاحیت ہے اور میں لکھ سکتا ہوں۔ جب کاروبار کی

مصروفیات کم ہوں گی۔

سہیل: کیا ہماری اس گفتگو میں کوئی ایسا اہم پہلو رہ گیا ہے جس پر آپ اظہارِ خیال کرنا چاہیں۔

اشفاق: نہیں۔ یہ تو ایک بے تکلف گفتگو تھی ہماری تو تھوڑی سے زندگی ہے اور تھوڑی سے Contribution ہے۔ اس لئے تھوڑے سے وقت میں بیان ہو جاتی ہے۔

سہیل: شکریہ

اشفاق: شکریہ

☆☆
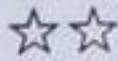
سب رشتوں میں

ایک توازن

رکھنا پڑتا ہے

تمیرا رحمان سے انٹرویو

نیویارک اکتوبر ۱۹۷۰ء

سہیل: حمیرا! آپ سے گفتگو تو کئی موضوعات پر ہو سکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہم اپنے انٹرویو کا آغاز آپ کی شاعری سے کریں۔ مجھے اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ بعض دفعہ بہت کچھ کہتی ہیں اور بعض دفعہ کم یا بالکل کچھ نہیں کہتیں۔ آپ کے خیال میں وہ کون سے عوامل ہیں جو آپ کی تخلیقی زندگی اور شاعرانہ اظہار کو متاثر کرتے ہیں؟

حمیرا: اس کا کوئی نپا تلا فارمولا تو ہے نہیں۔ البتہ یہ ہے کہ شاعروں سے ملوں یا شعری نشستوں میں جاؤں تو اندر ہی اندر کچھ جمع ہونا شروع ہوتا رہتا ہے۔ ان محفلوں کے بعد مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں کچھ نہیں کہتی۔ میں نے جو چیزیں Absorb کی ہوتی ہیں وہ میرے اندر کھلبلی مچا رہی ہوتی ہیں۔ لیکن وہ باہر نہیں آ رہی ہوتیں لیکن اس وقفے کے بعد جو چیزیں باہر آتی ہیں وہ میرے اپنے انداز سے باہر آتی

ہیں اگر میں فوراً ہی کہوں تو ہو سکتا ہے کہ میرے ہمعصروں یا دوستوں کا زیادہ اثر ہو کیونکہ بعض دوستوں کے اشعار تو مجھے بہت پسند آتے ہیں یہ علیحدہ بات کہ حافظہ اچھا نہیں ہے اس لئے بہت سے اشعار یاد نہیں رہتے البتہ بعض دفعہ تاثر ذہن میں رہتا ہے اور بعض دفعہ وہ میرے اشعار میں آ بھی جاتا ہے۔

سہیل: بعض ہفتوں کی تیاری کے بعد جب آپ لکھنے لگتی ہیں تو وہ لکھنے کا عمل کیسے شروع ہوتا ہے کیا شعوری طور پر کوئی چیز تحریک دیتی ہے؟

حمیرا: کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے کچھ اندر سے گونج سی آنے لگتی ہے میں جھلانے بھی لگتی ہوں۔ اس سے میرے گھر والے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ میں دراصل ایک گھریلو قسم کی عورت ہوں لیکن میں نے اپنے خاوند یا بچوں پر ایک شاعرہ کا امیج (Image) کبھی نہیں ڈالا ہے۔ ہمارا جو حلقہ ہے اس میں میں نے شاعروں کی برادری کو اور دوستوں کی برادری کو الگ الگ رکھا ہے میں ان کو ایک ساتھ بلاتی بھی نہیں۔ میری جو دوستوں کی برادری ہے اس کا ایک بڑا حصہ میرے خاوند کے حوالے سے ہے ان میں سے بعض کو تو یہ پتہ بھی نہیں کہ میں شعر کہتی ہوں بلکہ بعض دفعہ کچھ لوگوں کو پتہ چلا تو انہوں نے گلہ بھی کیا کہ آپ نے آج تک بتایا کیوں نہیں۔ لیکن میری یہ عادت ہے بس۔ ان دو حلقوں کو علیحدہ علیحدہ رکھتی ہوں کیونکہ مجھے ورثے میں شاعری نہیں ملی ہے۔ میرے والدین کو شوق تو بہت تھا لیکن ادیبوں شاعروں میں زیادہ اٹھنا بیٹھنا نہیں تھا نہ ہی مشاعروں میں آنا جانا زیادہ تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنے بزرگوں کو

صرف گھریلو انداز میں دیکھا ہے وہی چیز ہمارے اندر ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ انسان اپنی ماں کی طرح Behave کرنے لگتا ہے بلکہ بہت سی چیزیں جو انسان نوجوانی میں Resent بھی کرتا ہے اور ماں سے لڑتا بھی ہے بعد میں خود وہی کرنے لگتا ہے۔ بعض دفعہ تو جملے تک وہی آنے لگتے ہیں اور پھر احساس ہوتا ہے کہ یہی تو وہ باتیں تھیں جن کے بارے میں ہم جھگڑتے رہتے تھے۔

مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگتی ہے اور احساس ہوتا ہے کہ میرے اندر جو گھریلو عورت ہے وہ گھریلو مصروفیات کو محسوس کرتی ہے اور پھر میرے اندر کی شاعری فرصت کے لمحے تلاش کرتی ہے۔ بعض دفعہ ایک لفظ یا ایک مصرع Haunt کرنے لگتا ہے اور اس مصرعے کے ساتھ ایک یقین اور تحفظ کا بھی احساس ہوتا ہے کہ میں نے وہ چیز کھوئی نہیں ہے۔ کبھی کبھار تو مجھے خوف سا آنے لگتا ہے کہ کیا مجھ سے وہ چیز چھن رہی ہے کیا گھریلو عورت مجھ پر حاوی ہو رہی ہے اور شاعرہ مر رہی ہے لیکن جب میں اپنی تخلیق مکمل کر لیتی ہوں تو ختم کرنے کا احساس مجھے اعتماد دیتا ہے۔

سہیل: تو کیا آپ ان تخلیقی لمحوں میں اپنے آپ کو گھریلو مصروفیات سے Isolate کر لیتی ہیں۔

حمیرا: مجھے اس کی Planning کرنی پڑتی ہے۔ فلاں وقت میرا میاں کام پر جائے گا اور میری بچی سو رہی ہو گی تو مجھے کچھ وقت اپنے لئے مل جائے گا وہ میرے ذاتی لمحے ہوں گے۔

سہیل: یہ جو آپ کا تخلیقی موڈ بنتا ہے یہ کتنا عرصہ رہتا ہے؟

حمیرا: مختلف ہوتا ہے بعض دفعہ تو چند لمحوں میں ہی غزل ہو جاتی ہے۔

بعض دفعہ کئی ہفتے لگ جاتے ہیں۔ میں اپنے آپ پر کبھی دباؤ نہیں ڈالتی۔ یہ نہیں کہ مطلع ہوگیا ہے تو اب پوری غزل ختم کر کے ہی چھوڑوں جیسے میرے کئی دوست کرتے ہیں وہ کیفیت خود ہی آہستہ آہستہ کہلواتی رہتی ہے۔

سہیل: بہت سے شاعر تو پوری غزل ایک ہی نشست میں لکھ لیتے ہیں۔

حمیرا: زمانۂ طالب علمی میں ایسا ہوتا تھا۔ وہ ایک خاص طرح کی ترنگ ہوتی تھی ایک خاص قسم کی سرشاری کا احساس ہوتا تھا کیونکہ اس وقت تو ہم اندر کے شاعر کو دریافت کر رہے تھے۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ میں شعر بھی کہہ سکتی ہوں۔ ہمیں شاعری وراثت میں تو ملی نہیں تھی میری چند سہیلیاں تھیں ان کے والدین اچھے شعر کہتے تھے تو وہ جانتی تھیں کہ وہ شعر کہہ سکتی ہیں لیکن میں نے کبھی شاعر بننے کا نہیں سوچا تھا میری والدہ کو جب پتہ چلا تھا کہ میں نے اشعار لکھے ہیں تو وہ بہت حیران ہوئی تھیں۔ اور خوش بھی ہوئی تھیں انہوں نے مجھے کہہ دیا تھا کہ اگر تمہارا رجحان اس طرف ہے تو شوق سے آگے بڑھو مجھے اس میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ میرا کلام دیکھ کر مشورے بھی دیتی تھیں حالانکہ وہ شاعرہ نہیں تھیں لیکن میری حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔

سہیل: کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ نے تین چار غزلیں ایک ہی کیفیت میں لکھ دی ہوں۔

حمیرا: ہاں کئی بار ہوا۔ زیادہ تر اس زمانے میں جب نئی نئی شاعری شروع کی تھی۔ لیکن وہ Quality کی بات نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس وقت یہ احساس نہیں تھا کہ ہمارا رنگ الگ ہونا چاہیے۔

سہیل: جب آپ غزل ختم کرلیتی ہیں تو کیسا محسوس کرتی ہیں؟

حمیرا: مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میرے اندر کی شاعرہ ابھی زندہ ہے کیونکہ میرا وقفہ بعض دفعہ چھ آٹھ مہینے طویل ہوتا ہے کئی دفعہ خوف سا رہتا ہے اگرچہ کئی دفعہ ہوچکا ہے کہ میں لوٹ آتی ہوں لیکن پھر بھی دھڑکا لگا رہتا ہے اور خلا کا احساس رہتا ہے کہ کچھ ہو نہیں رہا۔ اس وقت میں دعائیں مانگنے لگتی ہوں اور جب غزل یا نظم کہہ لیتی ہوں تو پھر شکر بھی ادا کرتی ہوں۔

سہیل: جب غزل یا نظم کہہ لیتی ہیں تو سب سے پہلے کسے سناتی ہیں؟

حمیرا: مجھے نئی چیز سنانے کی خوشی ہوتی ہے اس لئے میں دوستوں کی محفل کا انتظار کرتی ہوں بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ چار پانچ محفلیں ہوگئیں اور کوئی نئی چیز نہیں لکھی تو پھر میں بہت پرانی چیز تلاش کرتی ہوں ایسی چیز جو دوستوں نے نہ سنی ہو تاکہ ان کے لئے نئی ہو۔ میں ایک ہی چیز بار بار نہیں سنانا چاہتی۔ تو ہوتا یہ ہے کہ اگر دو تین نئی غزلیں لکھی ہیں تو جی تو چاہتا ہے کہ وہ سب کی سب سنادوں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ چند دن بعد ایک اور محفل ہوئی تو اس میں کوئی نئی چیز سنانے کے لئے نہیں ہوگی۔

میں اپنے دوستوں میں زاہد اور طلعت کو سب سے پہلے سناتی ہوں ہمارے میاں اکثر آخر میں سننے والوں میں سے ہوتے ہیں یہ نہیں کہ وہ حوصلہ نہ بڑھاتے ہوں یا سمجھتے نہ ہوں ایسی کوئی بات نہیں لیکن ایک عجیب سا حجاب سا ہوتا ہے کہ میں ان کو کیا سناؤں وہ بھی محفل میں سنتے ہیں بلکہ بعض دفعہ تبصرہ بھی کرتے ہیں۔

سہیل: اگر آپ نیویارک سے دور کسی چھوٹے سے شہر میں رہ رہی ہوتیں تو

کیا آپ کی تخلیقی زندگی مختلف ہوتی؟

حمیرا: نیویارک کی جو ادبی فضا ہے وہ زیادہ تخلیقی نہیں ہے۔ یہاں انجمنیں بہت سی بن گئی ہیں اور میری اپنی بہت سی مصروفیات ہیں گھریلو مصروفیات کی وجہ سے ادبی محفلوں میں بہت کم جاتی ہوں پچھلے دنوں اس ماحول میں کھنچاؤ بھی بہت تھا اب امید ہے کم ہو جائے گا۔ جہاں تک تخلیقی اظہار کا تعلق ہے وہ تو اگر میں کسی گاؤں میں بھی رہ رہی ہوتی تو شاید ایسا ہی ہوتا کیونکہ میں بہت سی محفلوں میں ویسے ہی نہیں جاتی البتہ ظفر زیدی سوسائٹی کا قیام دوستی کے حوالے سے تھا۔ ظفر زیدی کے دوستوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ ایک سوسائٹی بنانی چاہئے اس کی وجہ سے سالانہ محفلیں شروع ہوئیں لیکن وہ ایک اور ہی سلسلہ ہے۔

سہیل: میں ظفر زیدی سے کبھی ملا نہیں البتہ ان کی شاعری سے میں نے In-spiration حاصل کی ہے آپ تو ظفر زیدی سوسائٹی میں بہت فعال ہیں کیا آپ بتائیں گی کہ اس سوسائٹی کی بنیاد کیسے پڑی؟

حمیرا: ظفر کی طبیعت کچھ اس قسم کی تھی کہ اپنے بارے میں زیادہ نہیں سوچتے تھے اگر کسی کو انہوں نے دوست کہہ دیا تو اس کے لئے جان اور دل نکال کر رکھ دیتے تھے۔ اگر وہ کسی کام کا Commitment کر دیتے تو پھر چاہے دس ہزار مصیبتوں سے گزرنا پڑے وہ کام ضرور کرتے تھے ویسے بہت لاأبالی طبیعت کے مالک تھے اپنے لئے پریشان نہیں ہوتے تھے کہتے تھے ''اللہ مالک ہے کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا'' روزگار نہیں مل رہا تو زیادہ تلاش بھی نہیں کر رہے۔ بہت شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ اگر Job Interview کے

لئے جی نہیں چاہا تو نہیں گئے پھر آخری دنوں میں Sufism کی بہت باتیں کیا کرتے تھے ایک دفعہ سحر، مامون اور میں ظفر کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ظفر کہنے لگے کہ دوست بھی کچھ دن یاد رکھتے ہیں پھر بھول جاتے ہیں۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہوتا کہ بہت دیر تک یاد رکھا جاسکے۔ اور یہ باتیں ان کے مرنے سے چند ہفتے پہلے ہوئی تھیں چنانچہ یہ باتیں ان کے مرنے کے بعد ہمیں Haunt کرنے لگی تھیں اور ہم سوچنے لگے تھے کہ خدا ان سے یہ باتیں کہلوا رہا تھا۔ اس کے بعد ہم نے ان کا کلام جمع کیا۔ اگرچہ وہ اپنے اشعار سناتے رہتے تھے لیکن انہوں نے کوئی ڈائری وغیرہ نہیں بنائی تھی مختلف پرزوں، کاغذوں پر لکھتے تھے اور اپنے بیگ (Bag) میں ڈال لیتے تھے جسے وہ ''ملبہ'' کہا کرتے تھے ایک ٹاٹ کا جھولا تھا جس میں وہ سب چیزیں بھری رہتی تھیں۔ محفل میں جاتے تو اس جھولے میں سے وہ کاغذ نکال لیتے جو پڑھنا ہوتا باقی اس جھولے میں لٹکا رہتا۔ اگر کسی اور چیز کی فرمائش آتی تو سارے کاغذ نکالتے اور ٹٹولتے رہتے تاکہ مطلوبہ غزل یا نظم مل جائے۔ بعد میں مجھے کافی مشکل ہوئی لیکن میں نے سوچا کہ اگر ان کا کلام فوراً جمع نہیں کروں گی تو بعد میں یہ پرزے بکھر جائیں گے۔ ایک اور مشکل یہ تھی کہ اگر انہیں کسی اور کا شعر پسند آگیا تو وہ بھی ایک پرزے پر لکھ کر اسی ''ملبے'' میں ڈال دیتے تھے اگرچہ اکثر اس پر شاعر کا نام لکھ دیتے تھے لیکن بعض دفعہ نہیں بھی لکھتے تھے تو پھر ہم نے سوچا کہ ایسا شاعر جس نے اس قسم کا شعر لکھا ہو کہ ؎

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے

جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایا جائے

ان کے کلام میں ہمہ گیر کیفیات ہیں اور اجتماعیت کا پہلو ہے ان کی شخصیت ایسی تھی کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی اپنے اس شعر پر عمل کرتے گزار دی۔ وہ زندگی جو صرف تینتیس سال پر ہی محیط تھی ان کی زندگی انکے شعر کا جواز بنی اور ان کی موت اس شعر کی تشریح تھی۔ جب ہم دوستوں کو احساس ہوا کہ ایسے شخص کو جسم کی موت کے ساتھ نہیں مرنا چاہئے چنانچہ دوستوں نے مل کر پہلے ۱۹۸۴ء میں ایک نجی محفل کا انتظام کیا اور پھر ۱۹۹۵ء میں ہم نے ظفر زیدی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور ان کی شاعری کا مجموعہ چھپوایا۔ اس طرح ظفر زیدی نیویارک کی شناخت بن گیا ایسا شخص روز روز پیدا نہیں ہوتا اور ایسی موت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی۔ اب ہر سال اس محفل کا اہتمام ہوتا ہے اور دوست بڑے شوق سے شرکت کرتے ہیں۔

سہیل: میں جب نیویارک کے بارے میں سوچتا ہوں اور آپ کی شخصیت کا خیال آتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کی شخصیت میں ایک Buffering Quality ہے جو لوگوں میں افہام و تفہیم پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے اور مل جل کر کام کرنے کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ کیا یہ خصوصیت آپ کی شخصیت کا شروع ہی سے حصہ تھی یا نیویارک آکر اجاگر ہوئی ہے؟

حمیرا: یہ میری نیچر (Nature) میں ہی ہے۔ میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ میرے بہن بھائی مجھ سے بڑے تھے۔ جب میں اسکول میں آئی تو وہ گھر سے جا چکے تھے اور میرے ذمے گھر کے اور باہر

کے بہت سے کام آگئے میری طبیعت میں بردباری اور سنجیدگی آگئی۔ میں سمجھداری سے اور سوچ سمجھ کر بات کیا کرتی تھی اگر محلے کی کوئی لڑکی اسکول کا کام نہ کرتی تو اس لڑکی کی امی میری امی سے کہتی کہ حمیرا سے کہو کہ اس لڑکی کو سمجھائے یہ میری بات نہیں مانتی لیکن حمیرا کی مان لے گی اور یہ بات بھی تھی کہ میں بات منوالیتی تھی یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں میری ذات کا حصہ بنتی چلی گئیں جب دو لوگوں میں لڑائی ہو اور میں انہیں ملوادوں تو مجھے ایک اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔

سہیل: مجھے آپ کے بارے میں یہ بات بھی اچھی لگتی ہے کہ لوگ آپ کو پسند ہی نہیں کرتے آپ کا احترام بھی کرتے ہیں کئی دفعہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ عورتوں کو معاشرتی طور پر بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے ان مسائل کا حل تلاش کرلیا ہو۔ کیا آپ کے خیال میں عورت ہونے کے ناطے آپ کو ایسے مسائل یا رویوں (Atitudes) سے واسطہ پڑتا ہے جو اگر آپ مرد ہوتیں تو نہ پڑتا؟

حمیرا: مغرب میں مردوں کا عورتوں کے بارے میں رویہ مشرق کی نسبت مختلف ہے اگر میں پاکستان میں ہوتی تو بہت سے مرد ایسے نکل آتے جو میری بات کو غور سے نہ سنتے لیکن مغرب میں Women's Li-bration کا اتنا تو اثر ہے کہ اکثر مرد عورت کی بات کو سنجیدگی سے سنتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں اکثر انصاف کا ساتھ دیتی ہوں۔ چاہے وہ میرا مخالف ہی کیوں نہ ہو میں ہمیشہ غیر جانبداری کا اظہار کرتی ہوں اور Fair رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں مسائل کو ایک

خاص فاصلے سے دیکھتی ہوں، دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں اور حتی الامکان کوشش کرتی ہوں کہ مصالحت کی صورت نکل آئے لیکن اگر محسوس کرتی ہوں کہ دوسرا شخص کسی صورت بھی رضامند ہونے کو تیار نہیں ہے تو پھر پیچھے ہٹ جاتی ہوں اور اگر کوئی تیسرا شخص اس معاملے میں پوچھتا ہے تو میں اپنی Fairرائے کا اظہار کردیتی ہوں اور میرا یہ رویہ شروع سے ہی ایسا رہا ہے۔ جب پاکستان میں کوئی یہاں کے شاعروں کے بارے میں پوچھتا ہے تو میں تمام اختلافات کے باوجود انصاف سے کام لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں شاعری کے بارے میں رائے دیتے وقت ذاتی اختلافات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ اگر کسی شخص نے کوئی قابلِ ذکر کام کیا ہے تو میں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ میرا خیال ہے اس بات کی لوگ قدر کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ لوگوں میں اعتماد Developہونے لگتا ہے۔

سہیل: اپنا مجموعۂ کلام ''اندمال'' چھپوانا کیا آپ کی اپنی خواہش تھی یا دوستوں کا مشورہ تھا۔

حمیرا: اشفاق نے اس کی بات شروع کی تھی اور مشورہ دیا تھا کہ آپ کی کتاب اب آجانی چاہئے اس سے پہلے نہ تو میں نے اپنا کلام ایک جگہ جمع کیا تھا اور نہ پرکھا تھا کہ وہ چھپنے کے قابل ہے یا نہیں۔ میں سوچا کرتی تھی کہ دوڈھائی سو چیزیں تو ہوں تاکہ کتاب چھپ سکے۔ اشفاق نے کہا کہ سو سوا سو صفحے ہوجائیں تو کافی ہیں۔ اس وقت نہ تو مجھے کتابت کا اور نہ چھپوانے کا اندازہ تھا کیونکہ وہ میری پہلی کتاب تھی۔ اشفاق کو اس کے تجربات تھے چنانچہ ایک دن انہوں نے بیٹھ

کر مجھے یہ سب باتیں سمجھائیں۔ انہی دنوں محمد علی صدیقی آئے ہوئے تھے ان سے بھی بات ہوئی انہوں نے بھی مدد کرنے کا وعدہ کیا اس طرح حوالے بنتے چلے گئے۔ جب راستے استوار ہوتے چلے گئے تو میں نے سوچا کہ چلو اب تو کتاب آہی جانی چاہئے۔

سہیل: آپ کی کتاب کس سال چھپی تھی؟

حمیرا: میری کتاب ۱۹۸۵ء میں ہندوستان سے اور ۱۹۸۶ء میں پاکستان سے چھپی تھی۔

سہیل: کتاب کے چھپ کر آنے کا تجربہ کیسا تھا؟

حمیرا: پہلی کتاب کی Thrill تھی جو ہر ادیب اور شاعر کو ہوتی ہے وہ سرشاری ایک سال تک رہی۔ مضامین لکھے گئے رسم اجرا ہوئی لیکن پھر بھی احساس ہوا کہ وہ واقعی میری تعریف کر رہے ہیں یا اس وجہ سے سراہ رہے ہیں کہ میں باہر سے گئی ہوئی ہوں یا اس لئے کہ اپنے ماحول سے کٹ کر شعر کہہ رہی ہوں۔ اس کے بعد پھر اپنا تجزیہ بھی کیا۔ کئی لوگوں نے کہا کہ دوسری کتاب بھی آجانی چاہئے لیکن میں نے سوچا کہ پہلی اور دوسری کتاب میں تھوڑا سا فاصلہ ہونا چاہئے تاکہ جو تجزیہ میں کر رہی ہوں اس کا فرق واضح ہو جائے۔ اگر میری شاعری میں جان ہے تو پانچ چھ سالوں میں مجھے بھی اور دوسرے لوگوں کو بھی اندازہ ہو جائے گا۔ اگر شاعری میں جان ہی نہیں تو دوسری کتاب چھپوانے کا فائدہ ہی کیا۔ جب پہلی ہی ناکام ہوگئی تو دوسری کا کیا چھپوانا۔ وہ تجربہ ابھی تک تو ٹھیک لگ رہا ہے۔

سہیل: آپ کو جو اپنی کتاب پر Feedback ملا تو کیا اس سے آپ کے

سامنے آپ کی شاعری کا کوئی ایسا پہلو سامنے آیا جو کتاب چھپنے سے پہلے آپ کی نگاہوں سے اوجھل تھا؟

حمیرا: جب کتاب نقادوں کے ہاتھوں میں جاتی ہے تو وہ چیزوں کو اپنے انداز سے سمجھتے ہیں اگرچہ ہم نے کسی اور انداز میں لکھی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار ہمارا تجربہ اور سوچ کا انداز نقادوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اگرچہ انسان نقادوں کے حوالے سے تو نہیں لکھتا لیکن نقادوں کی رائے سے مدد ملتی ہے۔

سہیل: آپ کو اپنی شاعری کا کون سا پہلو زیادہ عزیز ہے؟

حمیرا: میرا خیال ہے ہمیں وہی پہلو سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے جس میں دل کی بات پوری کی پوری شاعری میں آجائے۔ بعض لمحے پورے کے پورے شعر میں اتر آتے ہیں جو پہلو سب سے سچا ہوتا ہے وہی اچھا لگتا ہے۔

سہیل: آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ کے اندر کی جو گھریلو عورت ہے وہ شاعرہ کو متاثر کرتی رہتی ہے کیا شاعرہ گھریلو عورت کو بھی متاثر کرتی ہے یا نہیں؟

حمیرا: نہیں کرتی کیونکہ میں نے شاعرہ کو گھریلو عورت پر حاوی نہیں ہونے دیا میں اس معاملے میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے شوہر بھی ایسا ملا جس نے کبھی میری شاعری کو Threat نہیں محسوس کیا۔ یہ نہیں سوچا کہ اگر اس کا نام ہو جائے گا تو میں اس کے حوالے سے پہچانا جاؤں گا جیسے کئی اور مردوں کے ساتھ یہ مسائل ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ مجھے سسرال بھی بہت اچھا ملا۔ میرا سسرال بڑا ہے۔ میری اپنے تو صرف دو بھائی ہیں لیکن نسیم کے خاندان میں

چالیس پینتالیس افراد ہیں۔ شروع میں میرے بھائی کو فکر تھی کہ اتنے بڑے گھرانے میں کیسے گزارا ہو گا لیکن میرا سسرال بہت Open mindedاور Broadmindedہے وہ میری سنتے ہیں، سمجھتے ہیں اور پھر اس کو Promote بھی کرتے ہیں کہتے ہیں دیکھو ہماری بھاوج یہ کہہ رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ بات بہت کم شاعرات کو نصیب ہوئی ہے چنانچہ مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے اور فخر بھی ہے اس لئے میں جو چاہتی ہوں کہہ لیتی ہوں بہت سی شاعرات ایسی ہیں جو معاشرتی دباؤ کی وجہ سے دل کی بات نہیں کہہ سکتیں۔

سہیل: آپ خاندان کی بات کر رہی تھیں۔ کیا آپ اپنے بچپن کے بارے میں کچھ بتائیں گی آپ کا بچپن کہاں اور کس ماحول میں گزرا؟

حمیرا: میں ملتان میں پلی بڑھی میرے والدین ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے میرے والدین بہت وسیع النظر قسم کے لوگ تھے ان کا رویہ ہندوستان سے آئے ہوئے اکثر مہاجروں کے رویے سے مختلف تھا۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ہم پاکستان کے جس ماحول میں آئے ہیں ہمیں ان سے بہت کچھ سیکھنا بھی چاہئے اور انہیں اپنی روایات دینی بھی چاہئیں۔ باقی خاندان یا تو نئے ماحول کو کمتر سمجھتے تھے یا اپنے ماضی سے کچھ دینے سے گریزاں تھے لیکن ہمارے والدین نے اپنی شناخت برقرار رکھی۔ ہمارے والد خود تو شاعر نہیں تھے لیکن Eng-lish Literatureپڑھاتے تھے ہماری والدہ نے اس دور میں تھرڈ ایر تک پڑھا تھا اور انہوں نے ریڈیو اسٹیشن پر کام بھی کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ معاشرتی کاروائیوں سے شخصیت بنتی ہے۔ مجھ پر

کبھی یہ دباؤ نہیں رہا کہ تم پنجابی یا ملتانی نہیں سیکھو گی جو دباؤ بہت سے ہندوستانی گھرانوں کے بچوں پر ہوتا تھا اور ان کے والدین کہتے تھے کہ تمہاری زبان خراب ہو جائے گی۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میری دوستی کا حلقہ بڑھا جب اردو بولنے والے اور زبانیں بولتے ہیں تو اردو میں اور زبانوں کے الفاظ جذب ہو جاتے ہیں اور زبان امیر ہوتی ہے اردو تو ہے ہی لشکری زبان اس میں فارسی عربی کے اثرات تو ہیں ہی اگر اس میں پنجابی اور ملتانی کے اثرات شامل ہو جائیں تو کیا مضائقہ ہے اگر میں نے اردو شاعری کو ان زبانوں کے الفاظ نہیں دیے تو کم ازکم ان جذبات (Feelings) کا اظہار ضرور کیا ہے جو اس ماحول نے مجھے دیے تھے۔

میں نے ملتان ریڈیو پر پانچ سال کام کیا تھا میں حمیرا اخلاق کے نام سے کام کیا کرتی تھی۔ پہلے والد صاحب کو لوگ پروفیسر اخلاق کے نام سے جانتے تھے بعد میں بعض لوگ انہیں حمیرا اخلاق کے والد کے حوالے سے جاننے لگے۔ بہت سے والدین اس بات کو Mind کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں تھا والد صاحب اس بات پر فخر کرتے تھے کہ میری بچی اس طرح سے مشہور ہو رہی ہے۔

سہیل: تو اس لحاظ سے بھی آپ خوش قسمت ہیں۔

حمیرا: ہاں بہت خوش قسمت۔ میری یہ بدقسمتی تھی کہ میرے والدین کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور تین دن میں دونوں رخصت ہو گئے۔

سہیل: اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟

حمیرا: میں اٹھارہ سال کی تھی

سہیل: کیا وہ بیمار تھے؟

حمیرا: میری والدہ کو پہلے سے (Asthama) کی تکلیف تھی وہ کراچی آئی ہوئی تھیں پھر ان کو Complications ہو گئیں۔ ان کی کیفیت صحیح طور پر Diagnose نہیں ہوپائی اور ان کا صحیح علاج نہ ہو سکا۔ میرے والد ملتان میں تھے وہ جس دن کراچی پہنچے اسی دن اچانک والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میرے والد کو بہت Shock ہوا۔ میرے والدین کی عمروں میں بارہ سال کا فرق تھا۔ میں نے اپنے والدین کو کبھی پاس پاس بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ ان میں ایک عجیب قسم کا حجاب اور جھجک تھی۔ ایک تو عمر کا فرق تھا دوسرے مزاجوں کا لیکن کوئی الجھاؤ نہیں تھا کوئی پریشانی یا جھگڑا بھی نہیں تھا۔ جیسے میرے سسر میری ساس کے بارے میں جذبات کا اظہار کرتے ہیں اگر وہ ساڑھی پہن کر آتی ہیں تو اس کی تعریف کرتے ہیں لیکن میرے والدین میں یہ نہیں تھا وہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتے تھے ہمارے گھر کے سب معاملات میری امی نبٹاتی تھیں بچوں کے رشتے ہوں یا شوپنگ کے فیصلے میری امی کرتی تھیں میرے والد کو اس Loss کا اتنی شدت سے احساس ہوا کہ انہیں Stroke ہو گیا وہ -Co ma میں چلے گئے اور پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ ان دونوں کی موت میرے لئے بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس کے بعد میرے بھائی مجھے لیبیا لے گئے میں ان کے پاس ایک سال رہی پھر میں لندن چلی گئی اور کچھ عرصہ بی بی سی (B.B.C.) کے ساتھ کام کیا۔

سہیل: میں تھوڑی دیر کے لئے اسکول کی زندگی کی طرف لوٹتا ہوں۔ اسکول کے زمانے کی کس قسم کی یادیں آپ کے ذہن میں محفوظ ہیں۔

حمیرا: اسکول کی یادیں سب اچھی ہی ہیں۔ ہمارا شہر چونکہ چھوٹا سا تھا اس لئے وہ خوبصورت یادیں ہیں اس کا تصور شاید اب نہیں کیا جاسکتا۔ چھوٹے شہروں میں بھی اب وہ بات نہیں رہی ہے۔ اگر محلے کی کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو سارا محلّہ اس کے لئے جہیز بنارہا ہوتا کوئی کپڑوں میں ستارے لگا رہا ہے کوئی گوٹا ٹانک رہا ہے۔ وہ چیز اب نہیں ملتی۔ وہ لڑکیاں جو محلے میں ملتی تھیں وہی اسکول بھی جاتی تھیں۔

سہیل: تو آپ لڑکیوں کے اسکول جاتی تھیں۔

حمیرا: پانچویں جماعت تک لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔ اس کے بعد علیحدہ علیحدہ۔

سہیل: اساتذہ کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا تھا؟

حمیرا: اچھا تھا۔ میری جو اسکول کی ٹیچر تھیں وہ بھی لکھنے لکھانے کی بہت شوقین تھیں انہوں نے محسوس کیا تھا کہ یہ لڑکی مضمون لکھتی ہے تو اس کی اپج مختلف ہوتی ہے اس میں تخلیقی صلاحیتیں ہیں وہ میری بہت حوصلہ افزائی کرتی تھیں اور الگ بلا کر تعریف کرتی تھیں۔

سہیل: یہ کس کلاس کی بات ہے؟

حمیرا: ساتویں آٹھویں جماعت میں۔ پہلے میری چیزیں خود پڑھتی تھیں پھر کہتی تھیں کہ ساری کلاس کو سناؤ۔ شاعری کا احساس تو مجھے میٹرک میں ہوا۔ لیکن پتہ نہیں چل رہا تھا کہ صحیح کہہ رہی ہوں یا نہیں۔ والدین میں بھی کوئی شاعر نہیں تھا۔ ڈر بھی لگتا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہمارے والد کے ایک رفیقِ کار تھے عاصی کرنالی صاحب وہ اس زمانے کے Established شاعر تھے روایتی انداز

میں کہتے تھے انہیں خبر ملی کہ حمیرا شعر کہتی ہے تو انہوں نے کہا کہ اسے کہو کہ اپنا کلام دکھائے میں پڑھنا چاہتا ہوں کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔ میں نے انہیں ایک غزل لکھ کر بھیج دی انہوں نے وہ غزل ''ناقابل تصحیح'' لکھ کر واپس بھیج دی میں سمجھی کہ بالکل گئی گزری ہے۔ بعد میں کہنے لگے کہ میں نے تو وہ مذاق میں لکھا تھا میں تو بالکل ڈر گئی تھی۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے اور میں سمجھی کہ بالکل غلط ہے۔ ویسے انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا وہ مجھ سے بیٹیوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ میں ایک ہفتہ تک پریشان رہی۔ میں نے سوچا لعنت بھیجو اس شاعری پر اب میں کچھ نہیں لکھوں گی۔ اس کے بعد جب وہ ملے تو کہنے لگے کہ تم نے پھر کچھ نہیں بھیجا میں نے کہا اب اور کھچائی کرنے کے موڈ میں ہیں میں نے آپ کو غزل امی ابو سے چھپ کر بھیجی تھی۔ کہنے لگے اس کا مطلب ہے تم میری بات ہی نہیں سمجھی۔ کہنے لگے یہی تو شاعری کا مطلب ہے آپ کچھ لکھیں اور لوگ کچھ سمجھیں۔

اس کے بعد میں نے کبھی کسی کو کچھ نہیں دکھایا وہ ایک ہفتے کا کرب ساری عمر کے لئے کافی تھا۔

سہیل: درحقیقت انہوں نے آپ کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

حمیرا: ہاں! بہت! کالج میں بھی میں مشاعروں میں حصہ لیتی تھی اور ٹرافی جیتتی تھی اس سے بھی حوصلہ بڑھا۔

سہیل: آپ نے اپنا کلام چھپوانا کب شروع کیا تھا؟

حمیرا: ان دنوں کراچی سے ایک ڈائجسٹ نکلا کرتا تھا جس کا نام تھا خواتین ڈائجسٹ انہوں نے ایک شاعرات نمبر نکالا تھا جو Women's Lib

کے بارے میں تھا۔ مجھے عورتوں کے مسائل کا پورا احساس تو نہ تھا لیکن میں نے ایک آزاد نظم لکھ کر بھیج دی۔ انہوں نے وہ نظم چھاپ دی۔ اگرچہ وہ نظم عورتوں کے رسالے میں چھپی تھی لیکن ہمارے محلے کے لڑکوں نے پڑھ لی اور ہمارے ابا کو جا کر دکھادی۔ وہ ابا کے اسٹوڈنٹس تھے۔ اباجان بہت ناراض ہوئے کیونکہ اس نظم میں میں نے مردوں کو بہت ہی خراب انداز میں پیش کیا تھا اباجان نے کہا ''ہر معاشرے کی اپنی روایات ہوتی ہیں تمہیں اس عمر میں اس قسم کی چیزیں نہیں لکھنی چاہئیں'' میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن یہ احساس ہوا کہ اس نظم میں ضرور کوئی چیز ہوگی جو رسالے والوں نے چھاپ دی ہے اس کے بعد تین چار سال تک بالکل نہیں چھپی۔ پھر میں لندن گئی تو اپنا کلام رسالوں میں بھیجنا شروع کیا۔''

سہیل: ملتان ریڈیو میں کام کرنے نے آپ کی سوچ یا شاعری کو کیسے متاثر کیا تھا؟

حمیرا: گھر سے باہر نکلنے سے مختلف لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے ذہن کھلتا ہے خوداعتمادی آتی ہے شخصیت میں نکھار آتا ہے۔ وہاں جو لڑکیاں Comparing کرتی تھیں وہ پروڈیوسر نے جو لکھ دیا وہی پڑھ دیتی تھیں لیکن میں اس میں کچھ ترمیم کردیتی تھی۔ میں شروع سے خوش قسمت رہی ہوں۔ پروڈیوسر بھی برا نہ مناتے تھے اور مجھے پروگرام میں تبدیلی کی اجازت دیتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجھ میں صلاحیت ہے بعض دفعہ تو میں ان کا پورا پیراگراف کاٹ کر نیا لکھ دیتی تھی۔ میں ایک شعر ایک نغمہ کا پروگرام کیا کرتی تھی جس کا نام ''آبشار'' تھا۔ میں شعر پڑھنے کے بعد ایسا ماحول پیدا کرتی تھی کہ

ڈرامائی عنصر شامل ہو جاتا تھا۔ وہ پروگرام دو سال تک چلتا رہا۔ اور جب میں وہاں سے چلی گئی تو پروگرام بھی بند ہو گیا۔ سامعین نے وہ پروگرام کسی اور انداز میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ پروگرام ایسے معیار پر پہنچ گیا تھا کہ کسی اور کا اسے Maintain کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

سہیل: لیبیا میں ایک سال رہنے کا تجربہ کیسا تھا؟

حمیرا: وہ ایک اچھوتا تجربہ تھا۔ میں پہلی پہلی دفعہ ملک سے باہر نکلی تھی۔ وہاں ماحول تو پاکستانی لوگوں کا ہی تھا لیکن پاکستانی مقامی لوگوں سے بالکل نہیں ملتے تھے بلکہ ان سے گھبراتے تھے لیبیا جا کر مجھے صحرا کے حوالے سے اور ہجرت کے حوالے سے ذرا بیداری کا احساس ہونے لگا تھا۔

سہیل: لندن کتنا عرصہ رہیں؟

حمیرا: چار مہینے

سہیل: تو آپ ان چار مہینوں میں ہی بی بی سی سے منسلک ہو گئیں۔

حمیرا: چونکہ میں پاکستان میں پانچ سال ریڈیو کے ساتھ منسلک تھی اسلئے مجھے لیبیا کی ایک سال کی ریڈیو سے جدائی اچھی نہ لگی تھی چنانچہ لندن پہنچتے ہی میں نے بی بی سی کو انٹرویو دیا اور انہوں نے مجھے فوراً قبول کر لیا۔ میرا لندن کا تجربہ بہت اچھا رہا۔

سہیل: اس پورے ریڈیو کے دور میں کوئی ایسی شخصیت تھی جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟

حمیرا: میں جب ملتان میں تھی تو میں کشور ناہید کو بہت سنا کرتی تھی وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ مجھے ان کے Comparing کا انٹرویو لینے کا

انداز بہت پسند تھا ان کے اندر خلوص بھی ہے اور Boldness بھی۔ جو وہ سوچتی ہیں وہ کہہ دیتی ہیں۔ رشتوں میں کھری ہیں میں نے لاشعوری طور پر ان سے اثرات قبول کئے ہیں۔ میں انہیں نیویارک میں ملی تو میں نے اس کا ذکر کیا تھا۔

سہیل: ان کا Reaction کیا تھا؟

حمیرا: وہ سن کر بہت خوش ہوئیں۔

سہیل: لندن کے چار مہینوں کے بعد کیا ہوا؟

حمیرا: میں کراچی گئی اور میری شادی ہو گئی منگنی تو اس زمانے میں ہی ہو گئی تھی جس زمانے میں میں لیبیا میں تھی میرے خاوند میرے بھائی کے کلاس فیلو ہیں انہوں نے اکٹھے ہی فارمیسی (Pharmacy) کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ہماری Arranged Marriage تھی۔ میں نے اسکول کے زمانے میں انہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان سے شادی ہو گی نسیم نے اپنے والدین پر چھوڑا ہوا تھا کہ انتظام کر دیں۔ ان کی امی نے مجھے پسند کیا۔ میرے بھائی سے بات کی۔ میرے بھائی نے ان کی امی سے کہا کہ لڑکے سے پوچھیں وہ کہنے لگے کہ لڑکے نے رضامندی دے رکھی ہے لیکن میرے بھائی نے کہا کہ وہ رضامندی تو General تھی اب خاص میری بہن کے لئے پوچھیں اگر وہ ہاں کر دیں تو پھر میں اپنی بہن سے پوچھوں گا۔ ہمارے میاں نے کیا کیا کہ ایک خط میرے بھائی کو لکھا اور کہا کہ میں نے حمیرا کو بہت بچپن میں دیکھا تھا۔ اب نہیں جانتا کہ ان کے خیالات کیسے ہیں۔ ممکن ہے ان کے ذہن میں کوئی اور شخص بھی ہو۔ آپ حمیرا سے پوچھ لیں اگر انہیں یہ رشتہ پسند نہیں

آیا تو آپ مجھے چپکے سے بتادیں اور میں اپنی والدہ کو انکار کردوں گا اس سے ہماری بارہ سال کی دوستی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ دونوں خاندانوں کے تعلقات متاثر نہیں ہوں گے۔ اور بات میرے سر آجائے گی۔ میرے بھائی نے مجھے وہ خط دکھادیا مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی اور میں نے اقرار کردیا۔ اس خط سے احساس ہوا کہ اس آدمی میں ہمیں Project کرنے کی صلاحیت ہے وہ Stand لے سکتا ہے۔

سہیل: آپ کی شادی کس سال ہوئی؟

حمیرا: ۱۹۷۸ء میں

سہیل: شادی کے بعد آپ کراچی کتنا عرصہ رہیں۔

حمیرا: چند ماہ۔ نسیم پہلے سے ہی امریکہ میں تھے چنانچہ میں بھی یہاں چلی آئی۔

سہیل: اس کے بعد آپ نیویارک میں ہی رہیں۔

حمیرا: ہاں۔

سہیل: آپ کو شادی شدہ زندگی کیسی لگی۔

حمیرا: مجھے بہت مطمئن زندگی لگی۔ مجھ پر کسی قسم کا Pressure نہیں تھا نسیم کی شخصیت میں بھی یہ تھا کہ ان کے خاندان میں ان کی بات بہت وزن رکھتی ہے حالانکہ یہ خاندان میں تیسرے نمبر پر آتے ہیں۔ ان کی بات منصفانہ سمجھی جاتی ہے کبھی کوئی غلط بات نہیں کرتے۔ ان کی بیوی ہونے کی وجہ سے مجھے بھی عزت ملی میں نے ایک شعر کہا ہے ؎

یہ تیرے قرب سے کیا مرتبہ ملا ہے

مجھے

ہر ایک شخص محبت سے دیکھتا ہے مجھے

سسرال میں Trust Develop کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اب تو سسرال میں بھی مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

سہیل: ایسا لگتا ہے جیسے سسرال میں سب سے معتبر آپ ہی ہیں؟

حمیرا: اور اس بات پر مجھے فخر بھی ہے۔

سہیل: شادی کے بعد آپ کی ریڈیو سے Involvement نہیں رہی۔

حمیرا: نہیں۔ نیویارک میں ہر چیز پرائیویٹ ہے چنانچہ ہر چیز Rent کرنی پڑتی ہے۔ یہاں کے نظام میں بات نہیں بنی۔

سہیل: شادی کے کتنے عرصے کے بعد آپکے ہاں بچے پیدا ہوئے۔

حمیرا: انعام شادی کے پونے پانچ سال کے بعد پیدا ہوا۔

سہیل: ماں بننے کا تجربہ کیسا تھا۔

حمیرا: بڑا عجیب و غریب تجربہ تھا۔ سب والدین اپنے بچوں سے یہی کہتے ہیں کہ "جب تم ماں باپ بنو گے تو تمہیں اس کا احساس ہوگا کہ اولاد کیا چیز ہوتی ہے" اس جملے کی سچائی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب انسان خود ماں باپ بنتا ہے اس تجربے کو انسان De-scribe نہیں کر سکتا۔ میرے پاس اگر ایک گلاس پانی رہ گیا ہے اور مجھے سخت پیاس لگی ہے لیکن پھر بھی اگر میرا بچہ پانی مانگے گا تو میں اسے دوں گی خود ایک گھونٹ بھی نہیں پیوں گی چاہے اس کی پیاس کی نوعیت مجھ سے بہت کم ہو یہ عجیب سی Feeling ہے۔ یہ بچہ میرے وجود کا ایک حصہ ہے اور اس کا حق مجھ پر سب سے زیادہ ہے۔ انسان اپنی بہت سی چیزوں کو اولاد کی خاطر بھول جاتا ہے اولاد

ہوتی ہے تو انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔

سہیل: بچے پیدا ہونے کے بعد آپ کی ازدواجی زندگی پر کیا اثر پڑا؟

حمیرا: شروع میں نسیم کو خدشات تھے کہ بچے ہونے کے بعد میں بٹ جاؤں گی کہا کرتے تھے کہ تم بچوں کو زیادہ توجہ دوگی میری طرف توجہ کم ہو جائے گی ایک حد تک ایسا ہوتا بھی ہے رشتوں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اور رشتوں میں ایک Balance رکھنا پڑتا ہے۔ ایک بڑے گھرانے میں ماں بھی ہوتی ہے ساس بھی، شوہر بھی اور بچے بھی سب رشتوں میں ایک توازن رکھنا پڑتا ہے۔ ہمارے گھر میں بھی آہستہ آہستہ ایک Balance Develop ہو گیا جس میں نسیم نے بڑا تعاون کیا۔

سہیل: کیا شادی اور ماں بننے کے تجربات نے آپ کی شاعری کو متاثر کیا؟

حمیرا: تجربات کا اثر تو پڑتا ہی ہے جوں جوں انسان کے تجربات بدلتے ہیں ان کا اثر شاعری میں آتا ہے اور وہ اثر میری شاعری میں بھی آیا میں نے ماں کے حوالے سے بھی شعر کہے ہیں اور بیوی کے حوالے سے بھی اور بعض جگہ وہ میری شناخت بھی بنے ہیں۔

سہیل: اس پورے دور میں کیا آپ کسی ادبی تحریک سے متاثر ہوئی ہیں؟

حمیرا: اگر مجھے کوئی ادیب یا شاعر پسند ہے تو میں اس سے ملتی ہوں اور تبادلۂ خیال کرتی ہوں چاہے وہ کسی تحریک سے بھی منسلک ہو۔ میں ان سے عقیدت سے ملتی ہوں۔

سہیل: آپ کے خیال میں اردو میں جو عورتیں ادب تخلیق کر رہی ہیں انہیں کس قسم کے مسائل کا سامنا ہے۔

حمیرا: ان پر معاشرتی دباؤ بہت ہے وہ بہت کچھ نہیں لکھ سکتیں، جو وہ لکھنا

چاہتی ہیں اس سے انہیں بہت Frustration ہوتی ہے۔ بعض دفعہ وہ اذیتیں اور تکلیفیں برے طریقے سے سامنے آنے لگتی ہیں بعض عورتوں پر سسرال کا دباؤ ہے بعض پر میاں کا دباؤ ہے۔ بعض کی شادی اس لیے نہیں ہوئی کہ وہ کھلی کھلی باتیں لکھ دیتی ہیں۔ ایسی بات نہیں کہ عورتیں لکھتی نہیں ہیں لیکن انکی بہت کم تعداد سامنے آتی ہے۔

سہیل: آپ کے خیال میں پاکستان میں رہنے والی عورتوں اور امریکہ میں بسنے والی عورتوں میں کیا فرق ہے؟

حمیرا: Way of Life مختلف لگتا ہے۔ یہاں کی پاکستانی خواتین پر اور طرح کے Pressures ہیں انہیں Job بھی کرنا پڑتا ہے اور گھر کا کام بھی ۔پاکستان میں نوکر مل جاتے ہیں جس سے جسمانی آرام میسر آجاتا ہے اگر امریکی لوگوں سے ہم Arranged Marriage کی بات کرتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان سے سو سال پیچھے ہیں لیکن مجھے اپنی روایات پر فخر ہے ہمارے ہاں رشتوں کا احترام ہے۔

سہیل: کیا آپ کا خاندان مذہبی تھا؟

حمیرا: ہاں! میرے والدین مذہبی تھے لیکن مذہب کو لبرل انداز میں لیتے تھے اور ان اقدار کا عملی اظہار بھی کرتے تھے۔

سہیل: کیا نوجوانی میں آپ بھی مذہبی تھیں؟

حمیرا: ہاں میں بھی مذہبی تھی۔

سہیل: کیا امریکہ آکر آپ کے مذہبی خیالات میں فرق آیا؟

حمیرا: تبلیغی جماعت کی طرح کے مذہبی تو ہم تھے نہیں۔ جو اقدار ہمیں پہلے پسند تھیں وہ اب بھی پسند ہیں۔

سہیل: آپ کا آئندہ کے چند سالوں کا کیا پروگرام ہے؟

حمیرا: میرا ارادہ نثر لکھنے کا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ افسانے لکھوں لیکن ابھی جو گھر کا ماحول ہے اس میں بہت مشکل ہے جب بھی مجھے وقت ملے گا میں افسانے لکھنے کی کوشش کروں گی کیونکہ میں نے شروعات افسانے سے کی تھی چند افسانے اخباروں میں چھپے بھی تھے میرا خیال ہے کہ اگر میں کوشش کروں گی تو وہ صلاحیتیں لوٹ کر آ بھی سکتی ہیں لیکن اس کے لئے وقت درکار ہے۔

سہیل: میں اب آپ سے آخری سوال پوچھتا ہوں۔
جب آپ اپنے کئی سالوں کے ادبی سفر کی طرف نگاہ اٹھاتی ہیں تو کیا آپ کو Satisfaction کا احساس ہوتا ہے؟

حمیرا: اگر بالکل Satisfaction کی Feeling آجائے تو سفر رک جاتا ہے ابھی مجھے اور بہت کچھ کرنا ہے البتہ اس بات کی Satisfaction ہے کہ میرے دوستوں نے، شوہر نے اور سسرال نے میری مدد کی ہے ایک پورے گھرانے نے میرا ساتھ دیا ہے میں اسی لحاظ سے خوش قسمت رہی ہوں۔

سہیل: کیا کوئی اہم بات میں پوچھنا بھول گیا۔

حمیرا: نہیں آپ نے بہت کچھ پوچھ لیا۔ شکریہ

سہیل: شکریہ۔

☆☆

ہم نے اپنی

کشتیاں جلا دی

تھیں

نسیم سید سے انٹرویو

کنگسٹن ۱۹۹۰ء

سہیل: نسیم صاحبہ! میں آپ کی طرف آتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ پچھلے پانچ سال میں شمالی امریکہ میں جس ادیب یا شاعر نے لوگوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ شاید آپ کی ذات ہے۔ کیا آپ بتائیں گی کہ آپ کی اردو ادب میں اس درجہ Involvement کیسے شروع ہوئی؟

نسیم: میں اردو ادب سے طویل عرصے تک بالکل کٹ چکی تھی۔ جب مجھے دوبارہ تحریک ہوئی تو اس ماحول میں دوبارہ آگئی۔ شادی کرنے سے پہلے تو میں شاعری کیا کرتی تھی بلکہ کئی پروفیسروں کی پیشین گوئی تھی کہ میں اس میدان میں کافی آگے تک جاسکتی ہوں لیکن شادی کے بعد میرا ماحول بالکل بدل گیا۔ میں ایک ایسے ماحول میں آگئی جہاں شاعری کرنے والی عورت کو آوارہ اور بدمعاش سمجھا جاتا تھا چنانچہ بارہ تیرہ برس تک میں ادب سے بالکل کٹی رہی لیکن میرے

اندر ہی اندر بہت کچھ پکتا رہا۔ نہ تو مناسب ماحول تھا نہ مواقع تھے۔ ادب سے ناطہ کٹ گیا تھا۔ جب کینڈا چلی آئی تو حالات بدل گئے مجھے ابھی یہاں آئے تین مہینے ہی ہوئے تھے کہ میرے بھائی عباس زیدی کے ہاں مشاعرہ ہوا جس میں مجھے بھی دعوت ملی۔ وہ مشاعرہ دراصل ہماری بہن شمیم بلگرامی کے اعزاز میں تھا۔ اس محفل میں میری آپ سے عابد جعفری اور اشفاق حسین سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس مشاعرے کے لئے میں نے بھی ٹھوک ٹھاک کر ایک غزل لکھ ڈالی۔ اس کے بعد میرے ذاتی حالات اتنے بدلے کہ مجھے پھر سے سانس لینے کا موقع ملا۔ سوچنے کی اجازت ملی اور پھر میں لکھتی چلی گئی۔ میرا خیال ہے کہ میری تحریریں چونکہ اکثر اوقات معاشرتی مسائل کے بارے میں ہوتی ہیں اس لئے ہو سکتا ہے لوگوں کو متوجہ کرتی ہوں۔

سہیل: کیا یہ شعوری فیصلہ تھا کہ آپ دوبارہ ادب میں Involve ہوں گی یا جوں جوں حالات بدلتے گئے آپ لاشعوری طور پر زیادہ سے زیادہ Involve ہوتی چلی گئیں؟

نسیم: یہ شعوری فیصلہ بالکل نہیں تھا۔ پہلی غزل بھی مذاقاً ہی لکھی تھی لیکن جب میں نے اپنی نظم ''دسویں عورت'' کہی تو لوگوں نے Ap-preciate بھی کیا اور مجھے بھی احساس ہوا کہ میں دوبارہ لکھنے کے قابل ہو رہی ہوں تب میں نے شعوری طور پر کوشش کی اور جو موضوع میرے ذہن میں آیا میں اس کے بارے میں لکھتی رہی یہ بات نہیں تھی کہ میں فیصلہ کر کے آئی تھی کہ کینڈا جاکر دوبارہ شاعری کرنی ہے بلکہ مجھے تو ڈر تھا کہ کینڈا آکر ادب سے بالکل ہی

رشتہ کٹ جائے گا۔

سہیل: ہر ادیب اور شاعر کے تخلیقی عمل کا انداز جداگانہ ہوتا ہے آپ کو کس قسم کی چیزوں کی تحریک ہوتی ہے اور آپ کس وقت لکھتی ہیں۔

نسیم: برتن دھوتے ہوئے، جوگنگ (Jogging) کرتے ہوئے یا علی الصبح میں خود صبح چھ بجے اٹھ جاتی ہوں لیکن بچوں کو ساڑھے سات بجے تک نہیں جگاتی اس طرح مجھے صبح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اپنی میز پر بیٹھنے کو مل جاتا ہے۔ غزل تو میری برتن دھوتے ہوئے یا روٹی پکاتے ہوئے ہوتی ہے لیکن نظم یا تو میں رات دس سے گیارہ بجے تک یا صبح چھ سے ساڑھے سات بجے تک لکھتی ہوں نظم لکھنے کیلئے مجھے ایک جگہ جم کر بیٹھنا پڑتا ہے۔

سہیل: نظم یا غزل لکھنے کا تخلیقی عمل کس طرح شروع ہوتا ہے؟

نسیم: مثال کے طور پر جب میں نے ''دسویں عورت'' لکھی تو مجھے ذاتی طور پر Battered Homes کا تجربہ ہوا میں وہاں گئی بلکہ لے جائی گئی اور بہت حیران ہوئی میرا خیال تھا کہ مغربی ممالک میں عورتوں کی پٹائی نہیں ہوتی ہوگی لیکن جب میں Battered Home میں گئی تو وہاں سارا گھر ہی ان عورتوں سے بھرا پڑا تھا۔ کسی کا سر پھٹا ہوا تھا کسی کا ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے ان کی سوشل ورکر سے پوچھا تو وہ کہنے لگی کہ Every Tenth Woman is beaten Badly in this Country اسی طرح میں نے ایک اور نظم لکھی تھی جس کا نام تھا ''بوری بازار کے بچے'' میں جب بھی بوری بازار جاتی تھی تو وہ بچے آکر خوش آمدید کرتے تھے کہ ان سے کوئی چیز خریدلوں۔

میں نے اکثر نظمیں ان چیزوں کے بارے میں لکھی ہیں جنہوں نے واقعی میرے دل کو تکلیف پہنچائی ہے وہ باتیں دل میں پکتی رہتی ہیں اور پھر نظم کی صورت میں باہر آجاتی ہیں۔

سہیل: جب آپ Battered Home گئیں تو کیا یہ نظم اس کے فوراً بعد کہی یا کافی عرصے کے بعد۔

نسیم: نہیں فوراً تو نہیں کہی بلکہ مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد لکھی۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ مواد ذہن میں پکتا رہتا ہے جیسے میں نے اب ایک نئی نظم لکھی ہے ''میرے فنکار'' یہ نظم طویل عرصے سے میرے ذہن میں پک رہی تھی جس کا مواد یہ تھا کہ عورت کو صرف ظاہری خوبیوں کی وجہ سے Accept کیا جاتا ہے۔

سہیل: جب آپ لکھنے بیٹھتی ہیں تو کیا پوری نظم ایک ہی نشست میں ہو جاتی ہے؟

نسیم: اکثر ایسے ہی ہوتا ہے لیکن میں نظمیں لکھ کر اکثر چھوڑ دیتی ہوں کچھ دن وہ پڑی رہتی ہیں اور پھر جب میں اٹھاکر دیکھتی ہوں تو کچھ نہ کچھ ردوبدل تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

سہیل: جب نظم ختم ہو جاتی ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟

نسیم: پھر تو بہت اچھا محسوس ہوتا ہے

جب میں نے وہ نظم لکھی جو بچے کو مسجد کے آگے سنگسار کرنے کے بارے میں تھی تو مجھے وہ واقعہ سننے کے بعد کئی راتوں تک نیند نہ آئی تھی۔ نہ میں لکھ پاتی تھی نہ سو پاتی تھی کیونکہ میں ماں ہوں اور مجھے لگتا تھا جیسے میرے بچے کو کوئی پتھر مار کر قتل کر رہا ہے آخر وہ نظم لکھ لی تو یوں لگا جیسے وہ بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔

سہیل: نظم لکھ لیں تو سب سے پہلے کسے سناتی ہیں؟

نسیم: میں کسی کو نہیں سناتی۔ پہلے میں عباس کو سنایا کرتی تھی۔ میں اس بات کی قائل نہیں کہ کسی سے اصلاح لی جائے میں سمجھتی ہوں کہ انسان اپنی اصلاح خود بھی کر سکتا ہے۔

سہیل: میرا اشارہ اصلاح کی طرف نہیں تھا میرا اشارہ نظم یا غزل کو Share کرنے کی طرف تھا۔

نسیم: میں اکثر اوقات Share نہیں کرتی۔ لکھ کر رکھ دیتی ہوں اور کسی محفل یا مشاعرے کا انتظار کرتی ہوں۔ جیسے ''دسویں عورت'' لکھنے کے بعد میری خواہش تھی کہ ایسی محفل میں پڑھوں جہاں بہت سی عورتیں ہوں۔

سہیل: جب آپ بہت سی عورتوں کے سامنے اپنی نظمیں سناتی ہیں تو آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے؟

نسیم: پڑھتے وقت تو پتہ نہیں کیا محسوس کرتی ہوں لیکن جب پڑھ کر واپس آتی ہوں تو کئی عورتیں ملنے آتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ وہ کب سے وہ باتیں کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہ پاتی ہیں ''مزدور عورت'' یا ''دسویں عورت'' سننے کے بعد بہت سی عورتوں نے آکر ان موضوعات پر تبادلہ خیال کیا۔ ایک مشاعرے میں تو بوڑھی بوڑھی عورتوں نے آکر Autograph لیا اور مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اس لائق نہیں ہوں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی تو ہے جو ان عورتوں کی باتیں کہنے کے لائق ہے کوئی تو ہے جو ان کے جذبات کا اظہار کر رہا ہے۔ I Really Enjoy it.

سہیل: آپ کی نظمیں سن کر مردوں کا Reaction کیسا ہوتا ہے؟

نسیم: مردوں کا Reaction بھی بہت اچھا رہا ہے۔ آج تک صرف ایک موقع ایسا تھا جس میں ''دسویں عورت'' سننے کے بعد ایک مرد نے آکر اس کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ ''آپ کی نظمیں سن کر ان عورتوں پر جو گھروں میں بیٹھی ہیں بہت برا اثر پڑے گا۔ ہمارا تو معاشرہ ہی ایسا ہے'' لیکن عموماً پڑھے لکھے مرد انہیں پسند کرتے ہیں اور Appreciate کرتے ہیں۔

سہیل: تو کیا ان محفلوں میں پڑھ کر آپ کو بہت تقویت حاصل ہوتی ہے؟

نسیم: ہاں ہوتی ہے۔ عورتوں کے چہرے پر خاص قسم کی خوشی نظر آتی ہے۔ پچھلی دفعہ جب نیویارک میں ''مزدور عورت'' پڑھی تو بچیاں Tape لے کر آگئیں وہ میری نظم کو ٹیپ کرنا چاہتی تھیں اکثر لوگ عورتوں کے مسائل کو Touch نہیں کر رہے۔ میں چونکہ خود عورت ہوں تو شاید ان موضوعات پر بہت اظہارِ خیال کر سکتی ہوں۔

سہیل: میں نے سنا ہے کہ آپ اتنی مقبول ہوئیں کہ ایک مشاعرے میں آپ کو سینکڑوں میل دور سے ٹیلی فون پر نظم پڑھنے کو کہا گیا۔

نسیم: ہاں نیویارک سے دعوت آئی تھی۔ میں چونکہ جانہ سکی تھی اس لئے مشاعرے کے دوران میں نے اپنے گھر سے ٹیلی فون پر غزل سنائی تھی۔ ان دنوں تابش دہلوی، شاعر لکھنوی آئے ہوئے تھے پہلے تو میں نے Refuse کیا۔ کیونکہ ٹورانٹو میں ایک دفعہ ایسا ڈرامہ ہو چکا تھا کہ ایک شاعرہ کو Local فون آیا تھا لیکن انہیں یہ Feeling دی گئی کہ وہ Long Distance Call ہے میں پہلے سمجھی کہ شاید میرے ساتھ بھی کوئی Joke ہو لیکن پھر تابش صاحب نے کہا کہ

نہیں ہم خصوصی طور پر تمہارے اشعار سنیں گے اور داد دیں گے تب میں رضامند ہو گئی۔

سہیل: کیا یہ پچھلے چند سالوں کی اتنی مقبولیت آپ کے لئے Unex-pected تھی؟

تسنیم: ہاں بالکل Unexpected تھی کیونکہ بہت عرصے سے میرا ادب سے رابطہ کٹ چکا تھا۔ لیکن میں نے یہ دیکھا کہ جیسے آپ کو تیرنا آجائے تو آپ بھولتے نہیں اسی طرح شعروادب سے بھی ایک دفعہ رابطہ قائم ہو جائے تو ختم نہیں ہوتا۔ میں نے کوئی بارہ سال تک ایک شعر تک نہیں لکھا تھا۔ ایک کتاب ادب کی نہیں پڑھی تھی۔

سہیل: آپ کے خیال میں آپ کی مشاعروں اور محفلوں میں شمولیت سے آپ کی تخلیقی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟

تسنیم: Weekdays پر تو میں گھر کے اور Official کاموں میں مصروف ہوتی ہوں Weekdays پر جب وقت ملتا ہے تو میں ادب پر Con-centrate کر سکتی ہوں۔ مشاعروں میں جب میں عورتوں کے مسائل کے بارے میں نظمیں پڑھتی ہوں تو عورتوں کی بہت حوصلہ افزائی ہوتی ہے صرف خواتین ہی نہیں سب نوجوان اسے پسند کرتے ہیں اور مشاعرے کے بعد مجھ سے پتہ مانگنے آجاتے ہیں مجھے ان چیزوں سے تقویت ملتی ہے کہ کسی کے تو دل کو یہ باتیں لگ رہی ہیں۔

سہیل: آپ کی ادبی کاروائیوں کی وجہ سے کنگسٹن کو بھی اہم مقام مل رہا ہے۔ جب اردو کے ادیب اور شاعر کینڈا آتے ہیں تو اکثر اوقات

کنگسٹن آکر آپ کے پاس ٹھہرتے ہیں اس طرح آپ کی بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوتی ہے آپ نے ان ملاقاتوں کو کیسا پایا۔

نسیم: جب انسان ان ادیبوں اور شاعروں کے پاس بیٹھتا ہے اور ان کی باتیں سنتا ہے تو بہت کچھ سیکھتا ہے جیسے افتخار عارف سے، حمایت علی شاعر سے یا جون ایلیا سے باتیں ہوئیں تو بہت سی نئی چیزوں کا پتہ چلا۔ پچھلی دفعہ جب کچھ مہمان آئے تو بحر پر گفتگو شروع ہوئی۔ میں کھانا بنا رہی تھی لیکن ان کی بحث بھی سن رہی تھی میں نے اس دن ان مہمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ جوان کی شفقت ہے میں اسے Enjoy کرتی ہوں۔

سہیل: مجھے اکثر یوں لگتا ہے جیسے آپ کو غزل کی نسبت نظم سے زیادہ لگاؤ ہے کیا آپ کو شروع سے ہی نظم زیادہ پسند رہی ہے؟

نسیم: شروع سے ہی ہے۔ میں ساتویں جماعت میں تھی کہ ہمیں ''عورت'' پر شعر کہنے کی دعوت دی گئی۔ میں نے نظم کہنے کا انتخاب کیا بعد میں کالج میں بھی نظمیں ہی کہتی رہی۔ یونیورسٹی میں بھی فلسطین کے مجاہدوں کے بارے میں نظم لکھی تھی جو مقبول ہوئی۔ نظم میں انسان تسلسل سے بات کر سکتا ہے۔ میرے پاس موضوع ہیں۔ غزل کی بات اور ہے جیسے یہ شعر ؎

ہم نے کب آپ کی چاہت کی قسم کھائی ہے
ہم تو یہ بھی نہیں کہتے کہ شناسائی ہے

تو تک سے ہو گیا لیکن اس کے بعد شناسائی کی وجہ سے ہم قافیہ الفاظ تلاش کرنے پڑے اور غزل تکمیل کرنی پڑی۔ اسی لئے پانچ سے

زیادہ اشعار نہیں لکھ پاتی۔ نظم کہنے میں مجھے صحیح مزا آتا ہے

سہیل: آپ کی زندگی میں اور بھی ذمہ داریاں ہیں آپ کا گھر ہے، بچے ہیں یہ گھریلو ذمہ داریاں آپ کی تخلیقی زندگی کو کیسے متاثر کرتی ہیں؟

نسیم: میں نے اپنے گھر میں Day Care بنا رکھا ہے۔ کچھ ہسپتال کے مریضوں کا خیال رکھتی ہوں۔ ہسپتال کے سوشل ورکروں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ شام کو بچے اسکول سے آجاتے ہیں۔ ان کے کھانے کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اس سے فارغ ہو کر میں چھ بجے شام اپنی Aerobics کی کلاس میں چلی جاتی ہوں وہیں آٹھ بج جاتے ہیں میں ساڑھے آٹھ بجے واپس آتی ہوں تو کچھ وقت علی کے ساتھ گزارتی ہوں اگر نہ گزاروں تو جرمانہ ہو جاتا ہے کبھی انہیں کہانی سنانی ہوتی ہے کبھی ان کا کوئی مسئلہ سننا پڑتا ہے۔ اکثر اوقات وہ آدھ گھنٹے کے بعد چلے جاتے ہیں کبھی کبھار پرچہ بازیاں کرتے ہیں اور کوئی پرچہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ سونے سے پہلے جب تک میں کچھ پڑھ نہ لوں نیند نہیں آتی اس طرح میرا Schedule کافی Busy رہتا ہے۔

سہیل: لیکن آپ کے خیال میں آپ کی یہ گھریلو ذمہ داریاں آپ کی تخلیق زندگی کو کیسے متاثر کرتی ہیں؟

نسیم: میں بچوں کے ساتھ بہت Enjoy کرتی ہوں۔ مجھے گھر کے کام سے بالکل بوجھ کا احساس نہیں ہوتا۔ شاعری ایسی چیز ہے کہ انسان کا ذہن چلتا رہتا ہے پینٹر کو شاید بیٹھ کر تصویر بنانی پڑتی ہے، نثر نگار کو بیٹھ کر لکھنا پڑتا ہے لیکن شاعر دوسرے کام کرتے ہوئے بھی شعر تخلیق کرتا رہتا ہے روٹی پکاتے پکاتے شعر ہو جاتے ہیں۔ میں نے

چولہے کے پاس کاغذ پنسل رکھ چھوڑے ہیں۔

سہیل: آپ کے پاس جو مریض رہتے ہیں کیا ان کا تعلق کسی ہسپتال سے ہے؟

نسیم: ہاں مقامی Psychiatric Hospital سے۔

سہیل: کیا مریضوں کا خیال رکھنے میں آپ کو کسی قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

نسیم: نہیں۔ میرا خیال ہے وہ مریض مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ میری ایک مریضہ جب دوبارہ ہسپتال داخل ہوئی تو ایک دن میں اس سے ملنے گئی نرسوں نے بتایا کہ وہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی اپنے آپ کو کمرے میں بند رکھتی ہے۔ اس کے کمرے میں گئی تو پہلے تو برہم ہوئی کہنے لگی میرا اس سے کوئی تعلق نہیں لیکن آہستہ آہستہ وہ کھل گئی اور پھر دو گھنٹے تک بات کرتی رہی نرسیں بہت حیران ہوئیں اس کام سے مجھے یہاں کے مسائل کا پتہ چلتا رہتا ہے۔

سہیل: آپ نے یہ کام شروع کیسے کیا تھا؟

نسیم: میں نے پاکستان میں نفسیات میں بی۔اے۔ کیا تھا۔ کینڈا آکر میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس قسم کی ملازمت کروں گی میں نے یونہی Apply کردیا تھا میرا خیال نہیں تھا کہ وہ مجھے ملازمت دے دیں گے۔ دو تین انٹرویو ہوئے اور پھر انہوں نے اوکے کردیا۔ بعض دفعہ لگتا ہے کہ کوئی چیز آگے کام کررہی ہے۔ میرے حالات بگڑنے والے تھے چنانچہ اس ملازمت کا بہت فائدہ ہوا۔

سہیل: آپ مجھے اس لحاظ سے بھی مختلف لگتی ہیں کہ آپ کے بھائی اور بہن دونوں شعر کہتے ہیں آپ کے خاندان میں ایسا ادبی ماحول ہے جو

بہت کم شاعروں کو میسر آتا ہے۔ آپ کے خیال میں آپ کا خاندان آپ کی ادبی زندگی کو کیسے متاثر کرتا ہے؟

نسیم: خالد! مجھے اپنے بھائی کی وجہ سے بہت سہارا ہے۔ وہ بہت Encourage کرتا ہے۔ ویسے تو عباس اور شمیم ہی نہیں میرے بڑے بھائی بھی شاعر ہیں انگریزی میں لکھتے ہیں اور میرے والد بھی شاعر تھے لیکن ان کا دیوان کبھی نہیں چھپا۔ عباس کی نظر بڑی تنقیدی ہے جب ہم ایک دوسرے کو شاعری سناتے ہیں تو صرف واہ واہ کیلئے نہیں سناتے پچھلے دنوں شمیم آئی تھیں ہم نے ان کی نظموں پر بہت گفتگو کی۔ اس طرح ایک دوسرے کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔

سہیل: آپ نظمیں اور غزلیں تو کہتی ہیں کیا آپ نثر بھی لکھتی ہیں؟

نسیم: ہاں کبھی کبھار۔

سہیل: کیا جان بوجھ کر کبھی کبھار لکھتی ہیں یا وقت نہیں ملتا۔

نسیم: خالد! وقت بالکل نہیں ملتا۔ نثر کے لئے نہ صرف وقت چاہئے بلکہ جب تک آپ کے پاس کہنے کو کافی مواد نہ ہو آپ نثر نہیں لکھ سکتے میں اپنے آپ کو نثر لکھنے کا اہل نہیں پاتی۔ کالج کے زمانے میں تو رسالے کے لئے مقالے لکھا کرتی تھی لیکن پھر وہ عادت چھوٹ گئی۔ شاید میں کبھی دوبارہ نثر لکھنی شروع کردوں۔

سہیل: کیا کبھی کہانیاں بھی لکھیں؟

نسیم: افسانہ لکھا لیکن ادھورا چھوڑ دیا۔ میرا تنقیدی مضامین میں زیادہ دل لگتا ہے۔

سہیل: آپ نے والد صاحب کا ذکر تو کیا لیکن بچپن کی باتیں نہیں بتائیں۔ آپ کس قسم کے ماحول میں پلی بڑھی تھیں؟

نسیم: میں پیدا تو الہ آباد میں ہوئی تھی۔ میں ابھی چھوٹی سی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ہم اتنے مسائل کا شکار ہوئے کہ بیچ کے بہت سے سال کہیں کھو گئے کیونکہ ہمارے والد نے دوسری شادی کر لی تھی۔ مجھے اپنی زندگی گریڈ نائن (Nine) کے بعد سے یاد ہے اس سے پہلے کا کچھ یاد نہیں۔ عباس کے چہرے اور چھوٹی بہن کے دھندلے سے نقوش ہیں لیکن بیچ کے بہت سے سال Missing ہیں ہم میں سے کسی کو کچھ یاد نہیں۔

سہیل: کیا آپ سب بہن بھائی ایک ہی جگہ تھے؟

نسیم: ہاں ہم تو ایک جگہ تھے لیکن والد صاحب کا Transfer ہوتا رہتا تھا الہ آباد سے ہم ڈھاکہ گئے تھے لیکن مجھے تفاصیل یاد نہیں اس کے بعد ہم مغربی پاکستان میں رہے۔

ہماری بہن شمیم کی شادی تو بہت کم عمری میں ہی ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تیرہ سال کی ہی تھیں، پانچ سال میں پانچ بچے بھی ہو گئے۔ ہم بہت مختلف ہیں۔ وہ بہت Submissive اور میں بہت Strong رہی ہوں ہمارے اسکول میں پردے کے موضوع پر ایک مباحثہ ہوا تھا۔ پورا ماحول پردے والا تھا ہماری ہیڈ مسٹرس تک پردہ کرتی تھیں لیکن میں نے پردے کے خلاف تقریر کی اور انعام حاصل کیا۔

سہیل: اس وقت آپ کس کلاس میں تھیں؟

نسیم: ساتویں آٹھویں میں ہوں گی۔

سہیل: آپ کے والد صاحب آپ سے کیسا سلوک کرتے تھے؟

نسیم: وہ مجھے کچھ زیادہ ہی چاہتے تھے کالج میں مشاعرہ ہوا اور مجھے میراجی

کی کتاب انعام میں ملی انہوں نے فوراً کتاب کو پھاڑ ڈالا اور پرنسپل صاحبہ سے شکایت کی کہ آپ کے اسکول میں لڑکیوں کو کیا یہی سکھایا جارہا ہے۔ وہ بہت پرانے خیالات کے انسان تھے وہ بہت محبتی تھے لیکن انتہا پسند انسان تھے۔

سہیل: آپ کے والد صاحب کس قسم کی شاعری کیا کرتے تھے؟

نسیم: گھٹائیں اٹھ رہی ہیں ابر ہے بارش کا ساماں ہے
پلا ساقی پلا ساقی
اس قسم کی روایتی شاعری کرتے تھے لیکن عباس کا سہرا انہوں نے بہت خوبصورت لکھا تھا۔ ہمارے دادا بھی اخبار نکالا کرتے تھے۔

سہیل: اسکول کے زمانے کی کس قسم کی یادیں آپ کے ذہن میں محفوظ ہیں؟

نسیم: بڑی تکلیف دہ۔ میں کلاس میں پڑھائی میں بڑی تیز ہوا کرتی تھی میرے پاس صرف ایک کاپی ہوتی تھی ہماری والدہ ہماری پڑھائی کے حق میں نہ تھیں۔ اسکول میں داخلہ بھی کسی اور کی سفارش کرواکے لیا تھا اس کاپی میں پہلے اردو پھر مٹا کر حساب پھر مٹا کر کوئی اور مضمون لکھ لیتی تھی۔ ہمارا حلیہ بھی غریبوں جیسا ہوتا تھا۔ ہماری استانی ہمیں سزا دیتیں کہ دوسری کاپی کیوں نہیں خریدتیں۔ عباس کا بھی یہی حال تھا وہ تو سزا ملنے سے پہلے ہی میز پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ہم چھ بہن بھائی تھے وہ وقت بہت سخت گزرا ہے۔ کاپی کی وجہ سے مجھے کلاس میں بہت ذلیل ہونا پڑتا تھا۔ ہماری والدہ گرم کپڑے بھی کبھی نہ بناتی تھیں۔ سردیوں میں بھی روز کپڑے دھونے پڑتے تھے اور پھر کوئلے کی استری سے کپڑے استری کرنے پڑتے تھے۔ اسکول

میں اکثر سزا ملتی تھی کہ سویٹر کیوں پہن کر نہیں آتیں۔ ہماری والدہ کا ایک پرانا کوٹ تھا اگر بارش ہوتی تو ہم چھپا کر وہ لے جاتے تھے اس پر بھی گالیاں پڑتی تھیں۔ شاید انہی حالات کی وجہ سے میں بچپن سے ہی Tough ہو گئی تھی۔

سہیل: ہائی اسکول آپ کے لئے کیسا تھا؟

نسیم: اس وقت ہم کراچی آگئے تھے مجھے پڑھائی کا جنون تھا۔ اسکول میں سائنس کا ٹیچر نہیں تھا ہم طالبات نے مل کر والدین سے بات کی اور پرنسپل سے درخواست کروائی کہ ہمیں سائنس پڑھنی ہے چنانچہ ٹیچر کا انتظام کیا گیا لیکن پھر ٹیچر کی شکایت ہوگئی کہ لڑکیوں کو پڑھاتے ہوئے کلاس میں ہنستا ہے۔ میٹرک پاس کیا تو رشتہ آگیا اور سنا کہ شادی ہونے والی ہے۔ میں نے والد سے کہا کہ انہوں نے میری شادی کرنے کی کوشش کی تو میں آخری وقت انکار کر دوں گی۔

سہیل: تو پھر کیا ہوا؟

نسیم: گالیاں والیاں پڑیں لیکن رشتے کا انکار ہو گیا ہمارے بھائی جو لندن میں ہیں وہ بیچارے بہت Help کرتے تھے۔ پاپا نے کہا ’میرے پاس تو کالج کے پیسے نہیں ہیں‘‘ اتفاقاً جو داخلے کی آخری تاریخ تھی اس دن بھائی کے پیسے آگئے۔ والد صاحب ہنستے ہوئے آئے اور کہنے لگے ’’تمہاری قسمت اچھی ہے پیسے آگئے ہیں۔‘‘

سہیل: کالج میں آپ کے کیا مضامین تھے؟

نسیم: میں سائیکالوجی پڑھا کرتی تھی۔ پھر بزمِ ادب اور مشاعروں میں بھی حصہ لیا کرتی تھی اور انعام حاصل کرتی تھی میں نے اس زمانے میں،

ڈراموں میں بھی حصہ لیا تھا۔

سہیل: آپ نے شاعری کس زمانے میں شروع کی تھی؟

نسیم: اسکول میں تو ویسے ہی ہوتی تھی کالج میں آکر سنجیدہ ہوئی۔ ہماری ایک استانی تھیں۔ وہ بہت حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ میں نے ایک غزل لکھی تو کہنے لگیں کہ میں ایک شاعر کو دکھا کر لاتی ہوں۔ بعد میں کہنے لگیں کہ انہوں نے کہا ہے کہ اصلاح کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد میں کالج کی طرف سے مختلف مشاعروں میں جانے لگی۔ حیدر آباد کے ایک مشاعرے میں شرکت کی جس کے جج حمایت علی شاعر تھے۔ افسوس یہ ہے کہ اس دور کا کلام میرے پاس محفوظ نہیں۔

ہمارے مالی حالات خراب تھے۔ میں کالج کے بعد ٹیوشن پڑھانے چلی جاتی تھی۔

سہیل: یونیورسٹی میں آپ کے کیا مضامین تھے؟

نسیم: بی۔اے۔ میں اردو اور سائیکالوجی تھے پھر اردو میں ایم۔اے۔ کیا۔ اس دوران بھی دو رشتے آئے۔ میں ان دنوں خالہ کے پاس رہا کرتی تھی۔ میں نے ان سے بھی انکار کر دیا۔

سہیل: آپ کیا کہتی تھیں کہ میں نے شادی نہیں کرنی؟

نسیم: دراصل اور لڑکیوں کی طرح مجھے گھر بسانے اور بیوی اور ماں بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں اور لڑکیوں سے ہٹ کر کچھ زندگی میں کرنا چاہتی تھی۔

سہیل: جب آپ نے یونیورسٹی میں اردو لی تو آپ کے ذہن میں کیا تھا؟

نسیم: میں دراصل سائیکالوجی لینا چاہتی تھی میں سائیکالوجی میں

پی۔ایچ۔ڈی۔ کرنا چاہتی تھی مسئلہ یہ تھا کہ اگر میں سائیکالوجی لیتی تو مجھے یونیورسٹی میں شام سات آٹھ بجے تک ٹھہرنا پڑتا اور پھر میں ٹیوشن نہ پڑھا سکتی تھی اور ٹیوشن پڑھانا میری مالی ضرورت تھی چنانچہ میں نے اردو لے لی۔ اردو پڑھتے ہوئے سوچتی تھی کہ لیکچرر بن جاؤں گی لیکن لیکچرر شپ مجھے پسند نہ تھی۔

سہیل: جس زمانے میں آپ کالج اور یونیورسٹی میں تھیں کیا اس زمانے میں شمیم اور عباس لکھا کرتے تھے؟

نسیم: ہاں۔ شمیم کے مضامین مقامی اخباروں میں چھپا کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ شمیم نے شاعری کب شروع کی۔ انہیں کالج جانے کا موقع نہیں ملا۔انہوں نے گھر میں ہی منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان پاس کئے۔ ان میں بہت سی صلاحیت تھی۔

سہیل: کیا آپ گھر والوں کو اپنی شاعری سناتی تھیں؟

نسیم: نہیں۔ بس انہیں اتنا پتہ تھا کہ میں رسالے کی اڈیٹر تھی۔

سہیل: آپ کی شادی کب ہوئی؟

نسیم: جب میں ایم۔ اے۔ کی طالبہ تھی۔ میرے خاوند میرے رشتہ دار تھے۔

سہیل: شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟

نسیم: میں نے مشرقی عورت ہونے کی سزا پائی ہے۔ مجھے شاعری کرنے کی اجازت نہیں تھی اس لئے میں تقریباً پندرہ سال ادب سے دور رہی۔

سہیل: آپ کب کینڈا تشریف لائیں۔

نسیم: ہم ۱۹۷۰ء میں کینڈا آئے۔ ایک سال بعد میرے خاوند واپس جانا چاہتے تھے لیکن میں نے انکار کردیا مجھے اپنے بچوں کی تعلیم اور

مستقبل عزیز تھے۔ وہ اسکول میں بہت کامیاب تھے۔ میرے خاوند کو میری باتیں پسند نہ آئیں اور آخر ہم ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ ان دنوں مجھے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

سہیل: جب آپ ان مسائل سے گزریں تو کیا کینیڈین دوستوں کا ردِ عمل پاکستانی دوستوں کے ردِ عمل سے مختلف تھا۔

نسیم: خالد! میں تو کینڈا کی بہت احسان مند ہوں کینیڈین دوستوں نے میری بہت مدد اور حوصلہ افزائی کی ہے۔ ان کے ذاتی مسائل اپنی جگہ لیکن میرے ساتھ ان کا برتاؤ بہت Fair رہا ہے۔ پاکستانی دوستوں نے پیٹھ پیچھے تو باتیں کیں اور کہا کہ اسے عورت ہو کر ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن اس کے باوجود مجھے بظاہر Moral Support دی۔ اگرچہ میں نے خود کسی دوست سے Help نہیں مانگی۔ اگر کہیں جانا تھا تو ٹیکسی کر کے چلی گئی۔ کسی سے Ride نہیں مانگی۔ مدد تو سب سے ملی لیکن کینیڈین دوستوں کا سلوک بہت اچھا رہا ہے۔ مجھے آکر بہت اچھے تجربات ہوئے ہیں شروع میں تو میری انگریزی اتنی اچھی نہیں تھی اور میں اپنے آپ کو بہتر طور پر Express نہیں کر سکتی تھی لیکن پھر بھی کینیڈین دوستوں نے حوصلہ افزائی کی۔ اگر میں پاکستان میں ہوتی تو مجھے بہت سے طعنے سننے پڑتے۔ پاکستان میں Seperation کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھ پر چاروں طرف سے Pressure ہوتا۔ کینڈا میں رہنے کی وجہ سے میں ایک خوشحال زندگی گزار سکتی ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ بھوری جلد کی وجہ سے تعصب ہوتا ہے لیکن میرے بچوں کو اسکول میں یا باہر کسی برے سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ماشاءاللہ بہت اچھے ہیں، کامیاب ہیں میں جتنے بھی کینیڈینز

سے ملتی ہوں وہ میری قدر کرتے ہیں۔ ہمارے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔

سہیل: نسیم! اب ذرا آپکی ادبی زندگی کے بارے میں دوبارہ کچھ باتیں ہو جائیں کیا آپ محسوس کرتی ہیں کہ شاعرہ ہونے کی وجہ سے آپ کے ساتھ رسالوں میں، محفلوں میں اور مشاعروں میں مختلف سلوک ہوتا ہے اور اگر آپ مرد ہوتیں تو مختلف سلوک ہوتا۔

نسیم: بہت سے لحاظ سے مجھے تو یہ کہتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے کہ میں نے بارہ تیرہ برس تک مشرقی عورتوں کی طرح گھریلو زندگی گزاری ان دنوں میری دنیا بالکل تاریک تھی۔ میں تصوراتی طور پر یہ سمجھتی تھی کہ ہمارا شاعروں اور ادیبوں کا طبقہ معاشرے کا بہترین طبقہ ہے یہ Matureلوگ ہیں ایسی نظمیں اور تحریریں لکھتے ہیں کہ ان کی نظریں دور تک دیکھ اور سمجھ سکتی ہیں لیکن جب سے میں خود اس حلقے میں داخل ہوئی ہوں تو مجھے یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے کہ مجھے قدم قدم پر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ میں فلاں شخص سے ملوں یا نہ ملوں۔ مجھے کئی دوستوں نے کہا اور Sincerely کہا کہ تم عورت ہو فلاں فلاں شخص سے نہ ملا کرو۔ سارا ماحول ہی کچھ عجیب سا ہے میں نہیں سمجھتی کہ جو کچھ شاعری میں کہتے ہیں اسی طرح زندگی میں عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ میرا تجربہ اس معاملے میں تکلیف دہ ہے جیسے تم اور میں اکیلے بیٹھے یہ باتیں کر رہے ہیں اگر ہماری ادبی برادری کو یہ پتہ چل جائے تو مجھے کہے گی کہ دنیا اس بارے میں کیا سوچے گی یہ نہیں سوچتے کہ اگر میں خالد کے بارے میں کوئی اور خیالات رکھتی تو اس سے ملنے کے میرے پاس اور طریقے موجود ہیں۔ ''دنیا کیا سوچے گی'' مجھے یہ بار بار بتایا جاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ادبی برادری سمجھتی ہے کہ میری اپنی کوئی شخصیت نہیں ہے اپنے کوئی اصول نہیں ہیں۔ میرے اپنے کوئی نظریات نہیں ہیں۔

میں جب کسی سے ملتی ہوں تو بہت Frankly ملتی ہوں شرما کر، لجا کر، دوپٹہ اوڑھ کر نہیں ملتی۔ آپ سے بات کر رہی ہوں تو آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کروں گی جیسے میں عورتوں سے مسکرا کر بات کرتی ہوں ویسے ہی مردوں سے بات کرتی ہوں۔ میرے ایک دوست نے کہا ''فلاں شاعرہ کو دیکھو وہ کتنی نیک ہے'' وہ نہیں سمجھتے کہ ان کے سمجھانے سے میں نیک نہیں ہو جاؤں گی اور نیکی کا میرا معیار بھی علیحدہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہماری ادبی برادری میرے معیار پر پوری نہیں اتری۔

سہیل: کیا آپ کی تحریریں لوگوں کے ردِ عمل سے متاثر ہوتی ہیں؟

نسیم: میں وہ سب کچھ پڑھتی اور لکھتی ہوں جو میں پڑھنا اور لکھنا چاہتی ہوں جب میں یہاں آئی تھی تو مجھے مشورہ دیا گیا تھا کہ غزلیں کہو۔ نظموں کو کوئی پسند نہیں کرے گا۔ میں نے کہا اگر کوئی پسند نہیں کرے گا تو مجھے نہیں بلائے گا نہیں چھاپے گا۔ لیکن میں اس وجہ سے غزلیں نہیں لکھنا چاہتی تھی کہ باقی لوگ غزلیں لکھ رہے ہیں مجھے ان لوگوں سے جو مشاعروں میں کلام سننے آتے ہیں شاعروں کی نسبت زیادہ تقویت ملی ہے۔

سہیل: کیا آپ کے نظریات میں پچھلے چند سالوں میں کچھ تبدیلی آئی ہے؟

نسیم: ہاں بہت بدلے ہیں۔

سہیل: آپ کے جو نظریات پاکستان میں تھے ان کی نسبت اب کیا بنیادی تبدیلی آئی ہے؟

نسیم: تبدیلیاں تو بہت سی آئی ہیں مثال کے طور پر مذہبی نظریات میں تبدیلیاں آئی ہیں پاکستان میں نہ تو سنجیدہ موضوعات پر کسی سے گفتگو ہوتی تھی نہ کتابیں پڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ یہاں یہ کہ عباس سے بہت بحثیں ہوئیں پہلے میرے خیالات بہت کٹر تھے اور میں اس سے بہت الجھتی تھی۔

سہیل: کیا پاکستان میں آپ بہت مذہبی تھیں؟

نسیم: ہاں! اچھی خاصی مذہبی تھی لیکن بچپن سے میرے ذہن میں میرا ایک اپنا ذاتی مذہب تھا دل ہی دل میں سوالات اٹھتے رہتے تھے لیکن میں ان سوالوں کو دبادیا کرتی تھی سطح پر نہیں آنے دیا کرتی تھی۔

اب میں اس Sense میں ReLIgious نہیں ہوں جس طور سے پہلے تھی یہاں آکر مجھے کھل کر سوچنے کا موقع ملا اب جہاں مجھے Logic نظر نہیں آتی اس بات کو ذہن قبول نہیں کرتا۔

سہیل: مذہب کے جو بنیادی اعتقادات تھے کیا ان میں کوئی بنیادی تبدیلی آئی؟

نسیم: جگہ جگہ ضربیں لگی ہیں۔ دراڑیں پڑگئی ہیں۔

سہیل: کوئی ایک مثال دیں۔

نسیم: پہلے میں منتیں مانا کرتی تھی اب میں منتیں نہیں مانتی۔ مجھے نہیں لگتا کہ کوئی اوپر بیٹھا ہے جو ہماری منت ماننے سے فیصلے بدل دے گا اگر ایسا ہوتا تو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی سب مسائل منتیں ماننے سے ہی حل ہو جاتے۔

اس قسم کی بہت سی عادتیں بدل گئی ہیں لیکن خدا پر میرا اب بھی یقین ہے اگرچہ اس کا تصور روایتی نہیں لیکن دل یہ کہتا ہے

کہ کوئی Superpower ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ جیسے بچے کی تخلیق مجھے متحیر کرتی ہے انسان کا ذہن مجھے متحیر کرتا ہے۔ خدا کی ذات پر تو یقین ہے لیکن باقی بہت سے یقین بدل گئے ہیں۔

سہیل: پیغمبر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

نسیم: میں پیغمبر کا احترام کرتی ہوں انہوں نے انسانیت کی بھلائی کی کوششیں کیں۔ وہ لوگوں کیلئے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ خاص کر جنہوں نے لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے روکا ان کا بہت احترام کرتی ہوں۔

سہیل: آپ کی آئندہ چند سالوں میں کیا Ambitions ہیں؟

نسیم: میں جتنی زیادہ پڑھتی ہوں اتنی ہی اپنی جہالت کا اندازہ ہوتا ہے میں چاہتی ہوں کہ صرف نظم یا غزل کہنے سے آگے جاؤں اور صحیح قسم کا علم حاصل کروں علم تو ایک سمندر ہے اگلے چند سال تو بچوں کی ذمہ داریوں بہت ہیں اس کے بعد مجھے زیادہ وقت ملے گا۔

سہیل: آپ اپنی ادبی زندگی میں کسی شخصیت یا تحریک سے خصوصی طور پر متاثر ہوئی ہیں۔

نسیم: ترقی پسند تحریک سے ذہنی طور پر قریب رہی ہوں علی سردار جعفری اور اقبال کو شوق سے پڑھتی ہوں کالج کے زمانے میں ساحر کو بھی پڑھا کرتی تھی فیض کو تو دیوانگی کی حد تک چاہتی ہوں۔

سہیل: آپ جو شاعری کا مجموعہ مرتب کر رہی ہیں اس کا نام کیا ہے؟

نسیم: میری ایک مختصر نظم ہے

میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں
بس اتنا سمجھو

کہ بچپنے سے ابھی تلک میں
پرائے گھر میں ہی رہ رہی ہوں
زمین پیروں تلے نہیں ہے
مگر ابھی تک میں جی رہی ہوں

"پرائے گھر" کے تجربے کا شاید تمہیں اندازہ نہ ہو۔ جب میں لڑکی تھی تو بزرگوں سے سنا کرتی تھی "تمہیں پرائے گھر جانا ہے تم تو یہاں مہمان ہو، چڑیا ہو، اڑ کر چلی جاؤ گی" جب میں شادی کر کے آئی تو اپنے خاوند سے سنا" تم کونے میں پڑے پرانے جوتے کی طرح ہو اس کو جب چاہوں۔ ٹھوکر مار کر باہر پھینک دوں"

میرے مجموعے کا نام ہوگا "میں جی رہی ہوں"

سہیل: آخر میں کوئی ایسی خاص بات جو مجھ سے رہ گئی ہو۔

نسیم: آخر میں میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ ہماری جو شعرا کی برادری ہے انہیں اپنے ذہن کو ذرا وسیع کرنا چاہئے جیسی باتیں وہ لکھتے ہیں انہیں چاہئے کہ ان پر عمل کرنے کے بارے میں بھی سوچیں عورتوں کو کھلے دل سے اجازت دیں کہ وہ اپنے بارے میں خود فیصلے کر سکیں۔

سہیل: میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اتنا وقت دیا۔

نسیم: شکریہ۔

☆☆

ہر آزادی کی

قیمت ادا

کرنی پڑتی ہے

جاوید دانش سے انٹرویو

وھٹ بی (کینیڈا) ۱۹۹۰ء

سہیل: دانش میاں! آج باتیں تو بہت سے موضوعات پر کرنی ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے بات ''ڈرامے'' سے شروع کی جائے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پچھلے ایک سال میں آپ نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ پانچ چھ ڈرامے لکھ لئے۔اس کی کوئی خاص تحریک ہوئی یا کوئی خاص بات ۔ کچھ بتائیں؟

دانش: سہیل ایسا ہے کہ ڈرامہ اظہار کے لئے یا خود کو Express کرنے کے لئے میرا مؤثر اور بہترین طریقہ ہے۔ مصروفیت اور حالات کی وجہ سے پچھلے چند سالوں میں دو ایک ڈرامہ ہی میں لکھ پایا تھا اس سے میں بہت مطمئن بھی نہ تھا۔ میری خواہش تھی کہ شمالی امریکہ کے روزمرہ کے مسائل۔ ہجرت کے دکھ سکھ اور یہاں مقیم تارکِ وطن کی طرزِ زندگی پر ڈرامہ لکھوں، مگر میں اس کیلئے خود کو تیار نہیں پا رہا تھا۔ پچھلے سال میں نے تراجم کا سلسلہ شروع کیا۔ میں عالمی

ڈراموں کے تراجم کا ایک مجموعہ تیار کر رہا ہوں اس بہانے میں طبع
زاد ڈراموں کے کام کو جاری رکھنا چاہ رہا تھا۔ اسی دوران کلکتے سے
ہمارے دوست ف۔ س۔ اعجاز مدیر۔ ماہنامہ "انشا" نے فرمائش کی
کہ فوراً میں ایک مضمون شمالی امریکہ کی عید پر روانہ کروں۔ وہ کوئی
خاص نمبر عید پر نکال رہے تھے۔ میں نے انہیں لکھ بھیجا کہ میں
مضمون نگار تو ہوں نہیں اس خاص نمبر کے ساتھ انصاف نہیں
کر پاؤں گا۔ مگر ان کی ضد اور خواہش اپنی جگہ مسلم رہی۔ مجھے
اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ میں اس بہانے ایک ڈرامہ یہاں کی عید
پر لکھوں کہ تارکِ وطن یا مہاجرین کی عید یہاں کیسی ہوتی ہے۔
خود ہمارے گھر والے آج تک نہیں سمجھ پائے تھے کہ میری عید
کیسی گذرتی ہے۔ مگر اس ڈرامے ''عید کا کرب'' سے ہمارے گھر
والوں کو بھی اندازہ ہوا کہ پچھلے دس سالوں میں ہماری عید یا ہم
جیسے تارکِ وطن کی عید کس نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس طرح عید
نمبر کے لئے ڈرامہ ''عید کا کرب'' لکھا جو بہت کامیاب رہا اور کلکتے
کے علاوہ دہلی میں بھی شائع ہوا۔ اسے اسٹیج اور ٹی وی پر پیش کرنے
کی بھی بات چل رہی ہے۔ اس طرح ڈرامے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
پھر اسی دوران ایک دوست شادی کے لئے ٹورانٹو میں لڑکیاں دیکھ
رہے تھے اور ہر روز ایک نیا شگوفہ سناتے۔ ویسے ہندوپاک کی فیملی
کیلئے شادی ایک اچھا خاصا مسئلہ ہے یہاں۔ بس دوسرا ڈرامہ ''
کنوارے بھلے ''لکھا۔ اسے بھی دوستوں نے پسند کیا پھر تو جیسے کوئی
ٹھہرا ہوا بند ٹوٹ جائے۔ اور یکے بعد دیگرے پانچ چھ ڈرامے۔ جیسے
''اندھی ممتا، بھویا، بڑا شاعر چھوٹا آدمی'' وغیرہ لکھتا چلا گیا۔
''بھویا'' دہلی کے عصری ادب میں شائع ہوا اور پھر ان ڈراموں کا
ایک مجموعہ۔ ہجرت کے تماشے تیار ہو گیا۔ کلکتے میں ہی اس مجموعے

کے شائع ہونے کی بات چل رہی ہے دیکھئے کتنا وقت لگتا ہے!

سہیل: ہر رائٹر کا ایک اسٹائل ہوتا ہے، آپ ڈرامہ کیسے لکھتے ہیں۔ کسی تحریک کے بعد آپ کن مراحل سے یا کن مدارج سے گزرتے ہیں۔ ایک ہی نشست میں سب لکھ دیتے ہیں یا پھر......

دانش: ڈرمہ۔ ایک نشست میں لکھنا مشکل ہے۔ دو ایک شارٹ پلے ایسے ہوئے ہیں جو ایک نشست یا ایک رات میں مکمل کیا ہے میں نے۔ مگر عموماً ایک نشست میں ڈرامہ لکھ لینا بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ اردو میں بہت سارے ڈرامے ایسے بھی لکھے گئے ہیں جو محض ریڈیو کے لئے تھے یا کتابی ڈرامے تھے۔ جو ڈرامے کے فن سے Practically Involve ہے یعنی وہ ڈرامہ نویس جو خود ایکٹر یا ڈائریکٹر رہا ہے وہ بنیادی طور پر ڈرامہ اسٹیج کیلئے لکھتا ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ اس کا ڈرامہ کتاب کے کفن میں بند ہو کر دم توڑ دے۔ اس لئے جب ڈرامہ نگار کے ذہن میں کوئی پلاٹ یا منظر نامہ تیار ہوتا ہے تو پھر وہ ایک سلسلہ وار Process سے گذرتا ہے۔ اس کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ کس کیلئے ڈرامہ تیار کر رہا ہے یعنی اپنی "Audience" کے مزاج اور اسٹیج کی Feasibility کو ذہن میں رکھے پھر اسٹیج کرافٹ کے سہارے منظر نامے تیار کرتا جائے۔ یہ عجیب پروسیس دیگر صنف سے بہت مختلف ہے۔ میرے خیال میں افسانہ نگاری ناول اور انشائیے میں ادیب ایک پلاٹ کو سامنے رکھ کر اپنی کرافٹ میں شپ کے ساتھ اسے Treat کرتا ہے پھر اس کا مسئلہ ختم، کہ قاری اسے کس طرح پڑھے گا۔ مگر ڈرامے میں پلاٹ۔ کردار۔ مکالموں کے ساتھ ساتھ ہدایت کاری۔ لائٹنگ۔ سیٹ اور آڈینس کا بھی مسئلہ رہتا ہے۔ اسکرپٹ کے ساتھ اگر باقی ضرورتوں پر نظریا انصاف نہیں کر رہے ہیں تو وہ صرف ایک کتابی

ڈرامہ ہو کر رہ جائے گا اور اسٹیج نہیں ہو سکے گا۔

وقت اس لئے بھی لگتا ہے کہ ڈرامہ لکھتے وقت مجھے اس کی پیش کش کا بھی پورا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی کردار لکھتے وقت بھی یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ایسا کردار آپ کو ملے گا یا نہیں یا مطلوبہ سیٹ دستیاب ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے پرانے تاریخی ڈرامے جو ہیں وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتے جارہے ہیں۔ کیونکہ ان ڈراموں کے کاسٹیوم اور سیٹنگ اب اس قدر مہنگے ہوگئے ہیں کہ اردو کے پروڈیوسر اس کا خرچ نہیں برداشت کرسکتے۔ ٹی وی یا ریڈیو والے ''انارکلی'' وغیرہ کرلیں تو کرلیں اسٹیج پر تو اب یہ ممکن نہیں رہے۔ پھر وقت کے ساتھ ڈراموں کا مزاج اور اسٹائیل بھی بڑا مختلف ہوگیا ہے۔ آج سے بیس چالیس سال پہلے جو ڈرامے لکھے جارہے تھے۔ اب ان میں بہت بڑا تغیر آیا ہے ساری دنیا کے ڈراموں میں Abstract، سمبالک، مائم اور ڈانس فورم کے ذریعے ڈراموں کی مومنٹ میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ پراپ، سیٹ اور میک اپ کی ضرورتوں سے بھی ماڈرن ڈراموں کو بہت حد تک آزاد کردیا گیا ہے۔ حالانکہ اردو ڈرامہ اب بھی بہت پیچھے ہے مگر جو ہمارے
ہم عصر اردو ڈرامہ لکھ رہے ہیں وہ وقت کے تقاضے کو سمجھ کر ڈرامہ لکھ رہے ہیں۔ میرا تعلق کیونکہ ڈائرکشن اور پروڈکشن سے بھی رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کن مراحل سے گذر کر ایک ڈرامہ اسٹیج پر آتا ہے۔ میں نے کوئی ڈرامہ ایسا نہیں لکھا جسے اسٹیج پر پیش کرنے میں کوئی دشواری ہو۔ جو بھی ڈرامے لکھے اس خیال، ارمان اور شوق سے لکھے کہ میں یا کوئی اور اسے اسٹیج پر پیش کرسکے۔

سہیل: تو ''عید کا کرب'' یا باقی ڈراموں میں خیال آنے کے بعد کتنا وقت

لگا آپ کو اسے مکمل کرنے میں؟

دانش: ''عید کا کرب'' والا پلاٹ تو میرے ذہن میں کافی پہلے سے موجود تھا۔ جب لکھنے بیٹھا تو دو دن لگے اور تین نشست میں یہ ڈرامہ تیار ہو گیا۔ وہ چاہے عید ہو ہولی یا دیوالی وطن سے دور کسی تہوار کے منانے میں جو پرابلم سامنے آتے ہیں۔ یا کوئی تہوار کتنا Practical ہے اور اس کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ پھر پرانے لوگوں میں اس کی کتنی قدر ہے اور نئی نسل کی نظر میں اس کی کیا وقعت ہے۔ اس NOSTALGIA کا پر دیس میں کئی سالوں سے محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے اس ڈرامے میں ان تمام جدوجہد کو پیش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ دوسرے ڈرامے بھی تقریباً دو سے چار روز میں مکمل ہوئے ہیں۔ کچھ موڈ کچھ مصروفیت بھی آڑے آتی رہی ہے۔ پچھلے پانچ چھ ڈرامے کوئی تین ماہ میں مکمل ہوئے ہیں۔

سہیل: بعض رائٹر تخلیق تکمیل کرنے کے بعد اسے دو تین بار ریوائز کرتے ہیں یا دوبارہ لکھتے ہیں۔ آپ کا تجربہ کیا ہے؟

دانش: مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں کم لکھتا ہوں پھر جہاں تک ریوائز کرنے کا تعلق ہے اس میں نوک پلک درست کرنا یا زبان کی غلطیوں کو درست کر لیتا ہوں مگر پورا کا پورا پلاٹ بدل لوں یا پورے ڈرامے کو پھر سے نئی شکل عطا کروں یہ مجھ سے نہیں ہوتا۔ پچھلے سال ایک ڈرامہ لکھا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ کمزور تخلیق ہے۔ کوشش کے باوجود وہ مطلب کے موافق نہ ہو سکا تو اسے ضائع کر دیا۔ میرے اندر یہ کمزوری ہے کہ میں ایک بار جو لکھ لوں اس میں ردوبدل نہیں کر سکتا۔ اگر ڈرامہ طبیعت کے موافق یا معیاری نہیں تو اسے کنارے ڈال دیتا ہوں۔ یہ بھی نہیں ہوتا کہ اسے کچھ عرصے کے لئے رکھ لوں اور پھر بعد میں اس میں تبدیلی کروں۔ پتہ

نہیں کیوں یہ مجھ سے نہیں ہوتا۔

سہیل: ڈرامے میں اکثر کیا آپ کے ذہن میں کیرکٹر پہلے آتا ہے یا آئیڈیا پہلے آتا ہے؟

دانش: کیرکٹر پہلے تو نہیں آتا۔ پہلے آئیڈیا یا پلاٹ ہی آتا ہے کہ اس موضوع پر ڈرامہ لکھنا ہے۔ اس کے بعد یہ سوچا جاتا ہے کہ کتنی دیر کا ڈرامہ اور کتنے کردار ہونا چاہئے۔ اور کیا یہ سب کردار مجھے یا دوسرے ڈائرکٹر کو آسانی سے مل جائیں گے۔ کبھی کبھی کسی خاص کردار کو لے کر بھی پورا ڈرامہ لکھا جاتا ہے۔ اسکول کے زمانے میں جب ڈرامے کی شروعات ہوئی اور میں بڑے شوق سے ڈرامے میں حصہ لیا کرتا تھا اس دور میں سب سے بڑا مسئلہ ہم لوگوں کے لئے یہ تھا کہ لڑکیاں ڈرامے میں حصہ لینے والی نہیں ملتی تھیں۔ اسکول کے لئے جو ڈرامے یا سنگیت میں نے لکھے اس میں لڑکیوں کا رول کم سے کم رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ گر عورت کا کردار ڈرامے کی ضرورت ہو تو اس رول کو کسی لڑکے سے ہی میک اپ اور کاسٹیوم کے سہارے ادا کروایا جاتا تھا۔ مجھے اس سے الجھن ہوتی تھی کیونکہ ہلکے پھلکے اور مزاحیہ ڈراموں میں تو یہ ممکن تھا۔ ہماری آڈینس بھی اس کمی کو ہنس کر برداشت کرلیتی تھی شاید اس لئے کہ اردو SPEAK-ING لڑکیوں کو اسٹیج پر آنے کی مناہی تھی۔ شروع کے ڈراموں میں ہم نے کبھی کبھی عورت کا کردار رکھا ہی نہیں۔ بعد کے سنجیدہ اور سوشل پرابلم والے ڈراموں میں عورت کے کردار کو لڑکوں سے ادا کروانے کے بجائے میں نے Non Urdu Speaking بنگالی لڑکیوں کا تعاون حاصل کیا۔ اس سلسلے میں ایک بات یاد آئی کہ پچھلے سال میں جاپان گیا تو ٹوکیو میں وہاں کی نوٹنکی دیکھنے کا بھی

اتفاق ہوا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ''نوہ۔ ڈرامے'' میں زمانۂ قدیم
کی طرح آج بھی عورتوں کا کردار مرد میک اپ کی مدد سے ادا
کرتے ہیں۔ ویسے لکھنے کو تو کوئی بھی بیٹھ کر ''الف لیلہ'' ڈرامہ لکھ
دے۔ مگر کیا یہ ممکن ہے کہ اسے اتنے ہی مؤثر طریقے سے اسٹیج پر
پیش کیا جاسکے گا۔ کیونکہ کتابی ڈرامہ میرے نزدیک تھیٹر کے لئے
بیکار ہے یہ بھی ایک عام بحث ہے کہ ڈرامہ پڑھنے کی چیز ہے یا کھیلنے
کی، یا تمثیل ہے۔ یہ واضح رہے کہ شیکسپئر اور آغا حشر کو آج ہم اس
لئے پڑھ رہے ہیں کہ ان کے ڈرامے سینکڑوں بار اسٹیج پر کامیاب
ہوکر آج کے دور میں کلاسک ادب کا حصہ بن چکے ہیں۔ اگر اپنے
دور میں یہ ڈرامے اسٹیج پر کامیاب نہ ہوتے تو کتابوں میں ان کا
زندہ رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا۔

سہیل: آپ کا ڈائیلاگ لکھنے کا کیا اسٹائل ہے؟ میں نے پڑھا ہے کہ آغا حشر
کاشمیری کمرے میں ٹہلتے رہتے تھے اور ڈائیلاگ ان کے ذہن میں
آتے جاتے تھے جسے وہ ایک منشی کو لکھواتے جاتے تھے؟

دانش: آغا حشر ہوں یا کوئی بھی پرانے قلم کار یہ اس دور کا اسٹائل تھا۔ اور
Romanticism کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ جیسے مرزا غالب
کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اشعار کہتے ہوئے گرہ لگالیتے تھے
میرے خیال میں آج کے دور میں نہ کوئی گرہ لگاتا ہوگا نہ ہی یہ اتنا
Feasible ہے کہ ہم شمالی امریکہ میں بیٹھ کر ایک منشی رکھیں۔ ہاں
کوئی بہت ہی بڑا رائٹر ہے اور کامیاب بھی ہے وہ شاید ایسا مزاج
رکھے۔ مگر آج کا کامیاب ادیب بھی پہلے خود لکھتا ہے پھر سکریٹری
کو ٹائپ کرنے دیتا ہے۔ اس دور کا یہ اسٹائل نہیں ہے کہ آپ بیٹھے
ہوئے پان چبا رہے ہیں یا ٹہل رہے ہیں ڈائیلاگ فی البدیہہ کہہ
رہے ہیں اور کاتب بیٹھا ساتھ ساتھ لکھ رہا ہے۔ میرے ساتھ بھی

ایسا نہیں ہے۔ میری کمزوری ہے کہ کسی کی موجودگی میں نہیں لکھ سکتا۔ میرے لئے گرمالی طور پر ممکن ہوتا تب بھی کاتب کو ساتھ رکھ کر مکالمہ نہیں لکھواتا۔ جب میرے ذہن میں ایک پلاٹ تیار ہو جاتا ہے تو عموماً ''پہلے'' ون لائن اسٹوری'' لکھ لیتا ہوں پھر ذہن میں یہ آتا ہے کہ اسے کتنے سین میں بانٹا جائے کردار کتنے ہوں اور ان سب کو کس طرح Treat کرنا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ڈرامہ تیار ہوتا ہے۔

سہیل: بعض ادیبوں پر ان کی روزمرہ زندگی کا کافی اثر پڑتا ہے بعض لوگ جب ایک مصروف زندگی گذار رہے ہوں تو لکھتے ہیں بعض انتظار کرتے ہیں کہ جب وہ سفر پر ہوں یا سیاحت یا کوئی فراغت ملے تب وہ یکسوئی سے لکھ سکتے ہیں، کیا آپ کے لکھنے میں زندگی کی مصروفیات اثر انداز ہوتی ہے؟

دانش: جی ہاں! یہ بھی میری کمزوری ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں گر کوئی پریشانی یا مصروفیت ہے تو میں نہیں لکھ سکتا۔ میرے خیال میں خوش قسمت ہیں وہ ادیب جو تمام پریشانیوں کے باوجود روزمرہ کی زندگی میں لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ میں نے پریشانیوں میں بھی لکھا ہے مگر وہ بات نہیں ہوتی جسے دل چاہتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے تھوڑی فراغت یا تھوڑی تنہائی میسر ہو۔ نہ صرف لکھنے میں بلکہ پڑھنے میں بھی اگر میں گھر والوں یا دوستوں میں گھرا ہوں تو میں یکسوئی سے پڑھ نہیں سکتا مجھے عموماً لکھنے پڑھنے کے لئے الگ تھلگ ہونا پڑتا ہے۔

سہیل: جب آپ نیویارک میں تھے تو سنا آپ نے چند ڈرامے اسٹیج کئے۔ جس میں آپ نے ایکٹ بھی کیا اور ڈائرکٹ بھی اور اس پر انعام

بھی ملا تھا۔ اس کی کیا تحریک تھی؟

دانش: نیویارک جب میں آیا تو کچھ دوستوں کو پتہ تھا کہ میرا تعلق ڈرامہ نگاری اور اسٹیج سے ہے۔ مگر ان دنوں مصروفیت بہت تھی نئی جگہ نیا ماحول، کچھ مالی پریشانیوں کا بھی سامنا تھا۔ ان حالات میں یہ میرے لئے بہت عیاشی ہوتی کہ میں ڈرامے بھی کرتا۔ اس لئے وقتی طور پر تھیٹر کی فائل کو میں نے بند کر رکھا تھا۔ خود کو مصروف رکھنے کے لئے لوکل ٹی وی پر پارٹ ٹائم کام کر لیا تھا۔ امید تو تھی کہ ٹی وی پر ڈرامہ یا کم از کم اسکرپٹ رائٹر کے طور پر کام ملے گا۔ مگر پتہ چلا یہاں نہ ڈرامہ نہ اسکرپٹ رائٹر کی ضرورت ہے ان کاموں میں پیسہ نہیں بنتا۔ پیسہ کمانا ہے تو اشتہار بازاری میں قلم تیز کرو۔ خیر میں کمرشیل اور جنگل کے لئے اسکرپٹ لکھنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد جب ٹی وی والوں کو پتہ چلا کہ میں ایکٹر بھی رہا ہوں اور آواز بھی اتفاق سے براڈ کاسٹنگ کے لائق ہے۔ تو مجھے تھوڑی پروموشن مل گئی اور کمرشیل میں میری آواز کا استعمال بھی ہونے لگا۔ جو بعد میں اتنا مقبول ہوا کہ ہر مہنگا اشتہار خاص طور پر اسٹار نائٹ اور کانسرٹ والا میری آواز کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ میں پیسہ تو کما رہا تھا مگر تسلی نہ تھی اور اس شہرت سے میں خوش نہ تھا۔ ان لوگوں نے مجھے مشین بنا کر رکھ دیا تھا۔ جب قلم اور ذہن کمرشیل اسکرپٹ میں مصروف ہو جائے تو ادب تخلیق کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ میں ڈرامے سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا بس کبھی کبھی مشاعروں میں چلا جاتا تھا۔ ان ہی دنوں یعنی ۱۹۸۴ میں نیویارک کی ایک انجمن نے ''ون ایکٹ ڈرامہ فیسٹول'' کا اعلان کیا۔ چند دوستوں نے بڑی ہمت بندھائی کہ میں اس بہانے ایک بار پھر ڈرامے سے منسلک ہو جاؤں۔ دوستوں کی حوصلہ افزائی یا شاید میں خود کسی بہانے کا منتظر تھا۔ میں

نے ایک ڈرامہ لکھا ''کینسر'' جو کافی عرصے سے ذہن کے کسی کونے میں دبا پڑا تھا۔ اس کی تحریک بہت تکلیف دہ تھی۔ خود ہمارے والد کیونکہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہوئے تھے۔ خیر جب یہ ڈرامہ تیار ہوا اور میں نے اس کی ریہرسل شروع کی تو جن صاحب کو مین رول کرنا تھا وہ تمام کوشش کے باوجود رول کے ساتھ انصاف نہیں کر پارہے تھے۔ یہ بڑا ہی Sensitive Issue تھا میرے لئے۔ میں بھی کوشش کے باوجود خود سے سمجھوتہ نہیں کرپایا کہ مرکزی کردار معیاری نہ ہو۔ مجبور ہو کر میں نے اعلان کیا کہ اگر یہ ڈرامہ ہوگا تو میں خود ہی یہ رول ادا کروں گا۔ پھر وہ رول میں نے ہی کیا جو بہت جذباتی رول تھا۔ کوئی آٹھ دس برس کی غیر حاضری کے بعد میں اسٹیج پر آیا تھا مگر وہ ڈرامہ بیحد کامیاب ہوا۔ اس فیسٹول میں ۲۶ ڈرامے شامل ہوئے تھے مگر بیشتر ہلکے پھلکے یا کامیڈی تھے مجھے امید نہ تھی کہ لوگ میرے تجرباتی ڈرامے کو ہضم کر پائیں گے۔ مجھے حیرت ہوئی جب ''کینسر'' کو فرسٹ پرائز کی ٹرافی دی گئی۔ اس طرح ڈرامے کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ نیویارک کے علاوہ بھی چند شہروں سے مجھے ڈرامہ اسٹیج کرنے کا آفر ملا۔ مگر مصروفیت کی بنا پر میں باہر نہیں نکل سکا۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ میں بھی اسی فیسٹول میں میرے ڈرامے ''میں گوتم نہیں'' کو پھر انعام سے نوازا گیا۔ اس مقابلے سے میں بعد میں بیزار ہو گیا کیونکہ وہاں ساری کوششیں ٹرافی حاصل کرنے پر صرف ہو رہی تھیں۔ ساتھ ہی ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے پھر سے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے اور دوبارہ خود کو پروف کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میرے خیال میں ایک آرٹسٹ اگر مخلص ہے اور اس میں کچھ Potentiality ہے تو اسے خود کو منوانے کی ضرورت نہیں

ہونی چاہئے یا نہیں رہ جانی چاہئے۔ اس کے بعد میں خاموشی سے ایک طالب علم کی طرح مطالعہ میں لگ گیا۔ مصروفیت کی وجہ سے نئے ڈرامے کم لکھے۔ مگر تراجم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دوران ایک فلم ''کوئی ہے''؟ کے لئے مکالمے گانے اور اسکرپٹ لکھا مگر اس سے نہ نام ہوا نہ پیسہ ملا۔ یہ قصہ پھر کبھی۔ آج کل جیسا کہ آپ جانتے ہیں تازہ ڈراموں کی بہار آئی ہے۔ ڈرامہ لکھ رہا ہوں اور انہیں اسٹیج پر پیش کرنے کا بھی پروگرام ہے۔

سہیل: جب آپ نیویارک میں ڈرامے کر رہے تھے اس دوران ڈرامہ لکھنے، ایکٹ کرنے یا پھر ڈائرکٹ کرنے میں کون سا رول آپ کو سب سے زیادہ پسند تھا؟

دانش: ڈرامہ لکھنے کا جب کوئی ڈرامہ میں لکھتا ہوں اس کی ذمہ داری اسٹیج کے لئے میں اسی وقت لیتا ہوں جب کوئی اچھا ایکٹر یا ڈائرکٹر نہیں ملتا ہے۔ اگر کوئی اچھا ڈائرکٹر مل جائے تو میری خواہش ہوتی ہے کہ وہ اسے سنبھال لے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اگر ڈرامہ نگار خود ایکٹ کر رہا ہے یا ڈائرکٹ تو بہت سی چھوٹی چھوٹی یا بڑی خامیوں پر اس کی نظر نہیں جاتی۔ وہی بات کہ اپنا بچہ سب کو پیارا لگتا ہے۔ جب کوئی اور اسے ڈائرکٹ کرے تو ان خامیوں پر اس کی نظر جاتی ہے ساتھ ہی اسے وہ اپنے انداز سے ایک نئے زاویے سے Treat کرتا ہے۔ ڈائرکشن ایک الگ فن ہے اور ایک اچھا ڈائرکٹر کسی بھی اچھی اسکرپٹ کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر رکھ سکتا ہے۔ اس سے ڈرامے کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

سہیل: ایک زمانے میں ریڈیائی ڈرامے بہت مقبول ہوا کرتے تھے۔ منٹو نے بھی بہت سارے ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ کیا آپ کا کبھی ریڈیائی ڈراموں سے تعلق رہا ہے؟

دانش: جی ہاں! میں نے ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے ہیں اور کافی ترجمہ بھی کئے ہیں۔ ۷۰ کی دہائی میں کلکتہ ریڈیو سے بنگلہ ہندی انگلش اور اردو کے پروگراموں میں خصوصاً ڈراموں میں میرا مقابلہ کسی سے بھی نہ تھا۔ یعنی چار زبان کے ڈراموں کے لئے کوئی ایک آواز اور تھی ہی نہیں، شاید اب بھی یہ Combination مشکل ہی سے ملے۔ ایک اردو کے اداکار یا صداکار کے لئے یہ بہت ہی فخر کی بات تھی کہ بنگلہ کے ڈراموں میں اسے موقع ملے۔ کیونکہ بنگالی ڈراموں کے معاملوں میں بڑے سنجیدہ اور سخت ہوتے ہیں۔ میں نے نہ صرف بنگلہ کے سنجیدہ ڈراموں میں رول کیا بلکہ ان میں سے چند ڈراموں کو اردو میں ترجمہ کر کے ریکارڈ کروایا۔ ۱۹۸۷ء اگست کی بات ہے کہ ہندوستان کے مشہور ڈرامہ نویس اور ہدایت کار پدم شری حبیب تنویر اپنا ڈرامہ ''چرن داس چور لے کر کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ اس ڈرامے نے بڑا دھوم مچایا ہوا تھا۔ میں ریڈیو کے لئے حبیب تنویر کا انٹرویو لینے گیا۔ انٹرویو کے بعد انہوں نے بتایا کہ ''ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اردو اور بنگلہ دونوں ڈراموں میں ایک ہی وقت میں کام کر رہے ہوں۔ گو کہ آپ کی جڑیں یوپی میں جمی ہوئی ہیں مگر آپ کلکتے کے کلچرل ماحول سے استفادہ کر رہے ہیں آپ نے تراجم کا بھی سلسلہ کر رکھا ہے کیا اچھا ہوتا اگر کوئی کتابی شکل ان ڈراموں کی آپ پیش کریں''۔ ان کی ہمت افزائی سے کافی تحریک ملی۔ میرے چند بنگلہ ڈراموں کے ترجمے اسی سال ریڈیو سے نشر ہو کر مشہور بھی ہوئے تھے۔ ان سے تین ڈراموں کو منتخب کر کے ایک کتابی شکل دی گئی اور اس کا نام ''پرومیتھیس'' رکھا گیا۔ یہی میری پہلی کتاب بھی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں نہ صرف مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے مالی تعاون دیا بلکہ یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ

نے اسے ایک انعام سے بھی نوازا۔ اس طرح کافی عرصے تک ریڈیائی ڈراموں سے تعلق رہا مگر ۷۰ کے آخر میں کلکتہ چھوڑ کر میں نیویارک آگیا۔ اس کے بعد ریڈیو اور ریڈیائی ڈراموں سے میرا تعلق تقریباً ختم ہوگیا۔ ادھر پھر ٹورانٹو کے مقامی ریڈیو والے ریڈیائی ڈراموں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ دیکھئے وقت ملا تو کچھ ضرور کروں گا۔ مگر میرا خیال ہے کہ اسٹیج ریڈیو سے زیادہ مشکل اور Challenging فن ہے اور مزہ بھی اسی میں آتا ہے۔

سہیل: آپ نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا کہ آپ ''اسٹریٹ پلے'' بھی کیا کرتے تھے کچھ اس کے بارے میں بتائیں؟

دانش: ''اسریٹ پلے'' کلکتہ اور اس کی پرپیچ گلیوں، وہاں کی ہنگامی زندگی کی دین ہے۔ جب میں ہائر سیکنڈری میں تھا یعنی ۱۹۶۹، وہ لیفٹ موومنٹ اور نکسلائٹ کا دور تھا۔ ہر جوان خود کو باغی سمجھتا تھا۔ لیفٹ ونگ کی کاروائیاں Teenage میں بڑی گلیمرس لگتی تھی۔ اس زمانے میں اسٹریٹ تھیٹر بھی بڑا ہیرونک لگتا تھا اور میرے خیال میں آج بھی ہے۔ راستوں پہ اور نکڑ پر ڈرامہ کرنا، خاص کر ہنگامی حالت میں بڑی پر اثر چیز سمجھی جاتی تھی اور آج تک یہ بنگال کی روایت میں شامل ہے۔ ایسے تھیٹر پورے ہندوستان میں مقبول ہو چکے ہیں بلکہ پوری دنیا میں یہ فارم بہت مقبول ہے۔ شروعات جو تھیٹر کی ہوئی تھی اس میں گریک تھیٹر ہو یا عیسائیت کو فروغ دینے کے لئے مذہبی تھیٹر۔ اس روایتی تھیٹر کو محل سراؤں، خانقاہوں اور گرجوں سے نکال کر عام فہم کرنے کے لئے میلوں ٹھیلوں میں کارخانوں اور پارکوں میں یا پھر راستوں اور نکڑ پر کھیلا جانے لگا۔ پہلے ڈرامے کا استعمال روایتی یا Morality Plays کے طور پر ہوتا تھا۔ مگر جب زمانے کے لحاظ سے بدلتے بدلتے سیاسی طور پر کھیلا جانے لگا تو یہ

احتجاج کا مؤثر ذریعہ بن گیا۔ ساری دنیا کی طرح کلکتے میں بھی اس کا خاصا چلن ہوا۔ پچھلے سال دہلی میں اسٹریٹ تھیٹر کے سلسلے سے ایک بہت بڑا سانحہ ہو چکا ہے۔ اسٹریٹ تھیٹر کا ایک اچھا کارکن نکڑ پر ڈرامہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ ڈرامہ سیاسی نوعیت کا تھا اور اداکار اپنا پیغام دے رہے تھے کہ چند شرپسندوں نے ڈرامے کے دوران حملہ کیا جس میں صفدر ہاشمی مارا گیا۔ کلکتہ چھوڑنے کے بعد اسٹریٹ تھیٹر سے میرا تعلق ختم ہو گیا۔

سہیل: اسٹریٹ تھیٹر کی Involvement کے دوران کیا کبھی آپ کو بھی کوئی خطرہ محسوس ہوا؟

دانش: اول تو میری Involvement اسٹریٹ تھیٹر سے بہت زیادہ نہیں رہی ہے ہاں اس دور میں خطرہ ضرور محسوس ہوا ہے۔ ہمارا ایک گروپ تھا۔ ’’پروگریسو ڈرامیٹک یوتھ‘‘۔ اس کے بینر پر ہم لوگ ایک سیاسی بنگلہ ڈرامہ کر رہے تھے۔ میں ایک سخت پولیس افسر کا رول کر رہا تھا اچانک عوام میں سے ایک شخص جو شاید نشے میں تھا میری طرف مکا تانے بڑھا ہی تھا کہ دوسرے ساتھیوں نے اسے سنبھالا اور مجھے اندازہ ہوا کہ بندہ جذبات میں آکر React کر رہا تھا۔ خیر یہ تو بہت معمولی واقعہ تھا۔ مگر اسٹریٹ تھیٹر میں گرفتار ہونے کا خطرہ سب سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر ایسا ڈرامہ "Anti Establishment Slogan" ہوتا ہے۔ یعنی رولنگ پارٹی یا حکومت کے خلاف یا تو آپ نعرے لگائیں یا کسی تمثیل کے ذریعے اپنا مدعا بیان کریں۔ میرے ساتھ گرفتاری وغیرہ کا واقعہ تو نہیں ہوا۔ کلکتہ چھوڑنے کے بعد علیگڑھ یا پھر نیویارک میں وہ ماحول نہیں ملا کہ اسٹریٹ تھیٹر میں حصہ لیا جائے۔ اس کے بعد میری دلچسپی اسٹیج تک محدود ہو گئی۔

سہیل: ڈرامے کے علاوہ آپ سفر نامہ لکھنے میں بھی کافی فعال رہے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے ایک چھپ چکا ہے اور دوسرا زیرِ طبع ہے۔ تو یہ سفر نامہ لکھنے کا سلسلہ کیسے شروع ہوا؟

دانش: بچپن سے سیر و تفریح یا سیاست میری Obsession رہی ہے مجھے دنیا دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ حالانکہ میرا تعلق مڈل کلاس فیملی سے ہے اور مجھے معلوم تھا کہ یہ شوق ہم جیسوں کے لئے نہیں ہے مگر پھر بھی میں ہمیشہ سندباد جہازی والے خواب دیکھا کرتا تھا۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں شمالی امریکہ یا کہیں اور باہر جاکر سکونت اختیار کروں گا مجھے ہندوستان پسند ہے اور کلکتہ اپنی تمام بگڑی ہوئی شکل کے باوجود مجھے عزیز ہے کیونکہ اس شہر نے مجھے ادبی اور کلچرل شعور عطا کیا ہے مگر کلکتے کی ہنگامی زندگی سے تھوڑا سا فرار ضرور چاہتا تھا۔ سیاحت میں نے اسکول کے دنوں سے شروع کر دی تھی۔ ہندوستان پاکستان وغیرہ کے اکثر شہروں کو بچپن میں ہی دیکھ لیا تھا۔ دنیا دیکھنے کے شوق میں اسکول کے زمانے سے ٹیوشن کر کر کے پیسہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری ساری کوشش کے باوجود اس زمانے میں پندرہ بیس ہزار جمع کرنا بہت بڑا مرحلہ تھا۔ مگر میں مایوس نہ تھا۔ ۷۰ کی دہائی انتظار اور کوششوں میں گذر گئی۔ ۱۹۷۹ کے آخر میں ایک موقع ہاتھ آیا اور میں سفر پر نکل پڑا۔ دوستوں کو پہلے یقین نہیں آیا۔ مجھے بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ جب سفر پر نکلا تو یہ نہیں سوچا تھا کہ سفر نامہ بھی لکھنا ہے ویسے یہ میری فیلڈ بھی نہیں تھی۔ اپنے پہلے پڑاؤ پیرس سے میں نے بھائی بہنوں اور دوستوں کو بڑے تفصیلی خطوط لکھے۔ ان لوگوں کو یہ تحریر بہت اچھی لگی اور انہوں نے فرمائش کی کہ اس سلسلے کو جاری رکھوں اور اپنی رودادِ سفر قلمبند کرتا رہوں۔ اس طرح جہاں میں نے جو کچھ دیکھا اس کے

نوٹس بناتا چلا گیا اور پورے سفر کی روداد تیار ہوتی چلی گئی۔ پہلے یہ سفرنامہ چھ ماہ تک کلکتے کے ''اخبار مشرق'' میں چھپتا رہا اور بہت مقبول ہوا پھر دوستوں نے ہمت بڑھائی کہ اسے کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔ اس طرح ''آوارگی'' وجود میں آئی!

سہیل: سنا ''آوارگی'' کو ایک انعام بھی مل چکا ہے؟

دانش: جی......دو انعام ملے ہیں۔ ایک انعام تو لکھنؤ اکاڈمی والوں نے دیا تھا۔ پھر کلکتہ یعنی مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے اسے ۱۹۸۹ کے پہلے انعام سے نوازا ہے۔

سہیل: اس کا مطلب ہے کافی مقبول ہوا ہے یہ سفرنامہ یعنی لوگوں کو بہت پسند آیا۔ کیوں؟

دانش: جی ہاں! لوگوں نے پسند کیا اور دوستوں اور اساتذہ نے حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ میں نے نہیں سوچا تھا کہ میرا کوئی سفرنامہ بھی مشہور ہوگا۔ اسی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ ۱۹۹۰ کے شروع میں جاپان اور فارایسٹ کے سفر پر میں نکلا تھا اور اس بار ایک پلان کے تحت دوسرا سفرنامہ ''مزید آوارگی'' لکھا ہے جو ان دنوں کراچی دہلی اور کلکتے کے اخبار اوز رسائل میں قسط وار چھپ رہا ہے اور اس کی Re-sponse بھی اچھی ہے۔

سہیل: کیا ''مزید آوارگی'' کسی خاص لحاظ سے آوارگی سے مختلف ہے یا اسی کی Continuation ہے؟

دانش: میرے خیال میں ''آوارگی'' میں نے بغیر کسی پلان کے تحت لکھا تھا۔ یعنی کہ ایک طرزِ تحریر ہوتی چلی گئی تھی۔ مگر ''مزید آوارگی'' لکھتے وقت مجھے احساس تھا کہ لوگوں کو بہتر کی توقع ہے۔ اس لئے سنبھل کر لکھا ہے زبان اس میں بھی شگفتہ استعمال کی گئی ہے۔ جاپان کی سماجی زندگی کا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں دوسری

کاوش پہلے سے مختلف ہے۔ جب آپ پڑھیں گے تو خود اندازہ کریں گے۔

سہیل: سفرنامے اور ڈرامے کے علاوہ آپ شاعری بھی کرتے ہیں کیا شعر کہنے کا حظ یا اتنی ہی رغبت شاعری سے ہے آپ کو، جتنا ڈرامے وغیرہ سے ہے؟

دانش: جیسا کہ میں پہلے بتاچکا ہوں میرے اظہار کا Comfortableاور سب سے مؤثر طریقہ ڈرامہ ہے۔ سفرنامہ میں نے تجربے کے طور پر لکھا ہے۔ ہاں مزاجاً میں شاعر ہوں شعر موزوں کرلیتا ہوں مگر شاعری کے لئے اپنے اندر اتنی شدت محسوس نہیں کرتا بچپن سے شعر و سخن کی محفلوں میں اٹھا بیٹھا ہوں مشاعرے خوب پڑھے ہیں مترنم غزلیں میری کمزوری ہیں۔ مگر خود طبیعت جب مائل ہوتی ہے تو میں نظمیں کہتا ہوں نظموں کا ایک انتخاب ''ہجرتوں کے بعد'' کم و بیش تیار ہے اس کا انگریزی ترجمہ بھی تیار ہے۔ مگر جو سنجیدگی یا Commitment میرا ڈرامے کے معاملے میں ہے وہ کسی اور صنف میں نہیں ہے۔ یعنی بنیادی طور پر میں ایک ڈرامہ نویس ہوں۔

سہیل: بعض ڈرامہ نگار اپنی شاعری کا بھی استعمال ڈرامے میں کرتے ہیں کیا آپ نے خود کبھی اپنے ڈرامے اور شاعری کو یکجا کرنے کے بارے میں سوچا ہے؟

دانش: میرے خیال میں ایک اچھا اور پروفیشنل ڈرامہ نگار وہی ہو سکتا ہے جسے شاعری اور موسیقی میں بھی کچھ دخل ہو۔ ضروری نہیں کہ وہ صاحبِ دیوان شاعر ہو یا وہ سُر تال میں راگ بھی الاپتا ہو۔ مگر اس کی جانکاری بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جہاں تک اپنی منظوم چیزوں کو ڈرامے میں استعمال کرنے کا تعلق ہے میں نے ایسا تجربہ کیا ہے اور بھی ڈرامہ نویس کرتے ہیں۔ ۱۹۷۲ میں کلکتے کے کلامندر

اسٹیج پر میرا ڈرامہ 'انتقام' کمرشیل طور پر بہت کامیاب ہوا تھا۔ ادبی طور پر یہ کوئی بہت شاندار ڈرامہ نہ تھا۔ مگر پروفیشنل یا کمرشیل طور پر (ضرورت کے تحت) تین گھنٹے کا یہ شو جس میں گیت 'رقص' ایکشن سب موجود تھا بیحد کامیاب ہوا تھا۔ اس ڈرامے کے گیت اور اس کی دھنیں میں نے خود ترتیب دی تھیں اور پسند بھی کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی چند ڈراموں میں ہم نے نظموں کا استعمال کیا ہے اور یہ تجربہ ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔

سہیل: یہ سب تو آپ کی ادبی زندگی کے بارے میں تھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ نیویارک اور کینڈا آنے کے بعد بھی آپ کو ذاتی زندگی میں بہت سے مسائل اور Hardships کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں آپ کے کیا محسوسات ہیں؟

دانش: غالب کا ایک شعر اس وقت یاد آرہا ہے کہ ۔

"قید حیات رنج و غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کچھ لوگ زندگی کو جہد مسلسل کہتے ہیں میرے نزدیک زندگی ایک ڈرامہ ہے اور وقت اس کا ڈائرکٹر۔ میری زندگی کے ڈرامے کا ایکٹ ون یعنی بچپن بڑا خوشگوار اور یادگار تھا مگر ایکٹ ٹو میں کہانی اچانک ایک نیا موڑ لیتی ہے اور ہر طرف آزمائشوں کی جال تن جاتی ہے جس سے فرار ناممکن نہیں تو بزدلی ضرور تھی۔ ۱۹۷۸ میں میرے والد جو شاذونادر ہی بیمار پڑتے تھے اچانک بیمار ہوئے اور دیکھتے دیکھتے چھ ماہ کے اندر کینسر سے انتقال کرگئے۔ اب تک میں ایک آزاد منش لاابالی قسم کا نوجوان تھا، مگر گھر کا بڑا لڑکا ہونے کی وجہ سے ساری ذمہ داری میرے سر آگئی۔ سب سے پہلے میں نے اپنی کلچرل ایکٹیویٹی ختم کی اور دو نوکریوں کے سہارے گھر میں باپ

کا رول ادا کرنے لگا۔ پھر نیویارک آنے کا موقع ملا میں سمجھا پریشانیاں ختم ۔مگر امیگریشن کی روح فرسا آزمائشوں اور Odd JObs کی چکی میں پستا رہا۔ اس دوران بس پیسہ کمانے کی دھن تھی کہ کسی طرح گھر چلتا رہے۔ طرح طرح کے لوگ اپنے اپنے طور پر خون چوستے رہے جو کہ ہر نئی جگہ پر ہوتا ہے۔ بس نیویارک کی یادیں جتنی اچھی ہیں اسی قدر تلخ بھی ہیں۔ مگر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی نہ فرصت تھی نہ احساس پھر نیویارک سے طبیعت اوب گئی چند دوستوں کے مشورے پر ٹورانٹو چلا آیا۔ یہاں آکر بھی کچھ دوستوں نے سہارا دیا تو کچھ لوگوں نے دوستی کے نام پر Exploit کیا۔ جسے وقت کی ستم ظریفی کہئے یا میری کوتاہی اس سلسلے میں ایک اور اچھا شعر یاد آرہا ہے۔

لوگوں نے بس صلیب کی زینت بنادیا
میں چیختا رہا کہ پیمبر نہیں ہوں میں!

دیکھتے دیکھتے یا جھیلتے جھیلتے پچھلے دس بارہ سال گذر ہی گئے۔ مجھے خوشی ہے کہ زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آرہا ہے۔ اپنی تلون مزاجی کی وجہ سے امپورٹ کا کاروبار کرلیا ہے اور اب حالات کا مطلع صاف ہورہا ہے یعنی زندگی کے ڈرامے کا ایکٹ ٹو ختم ہوکر ایکٹ تھری شروع ہوچکا ہے جس کی شروعات خوشگوار ہے۔ آج جب میں سوچتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ مجھ سالا ابالی شخصیت کا نوجوان جس نے بچپن میں بہت شرارتیں کی ہوں، کبھی سنجیدگی سے گھر کی ذمہ داریوں کو سنبھال لے گا۔ اور باپ کے بعد تین بہنوں کی شادیاں تعلیم بھائی کی تعلیم وغیرہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرے گا۔ میرے خیال میں وقت بہت بڑا مرہم اور سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے اور کہاں سے مجھ میں ہمت آئی اور سارا کام ہوتا چلا گیا

اور میں آزمائش کی بھٹی سے صحیح سلامت نکل آیا۔ لگتا ہے کہ میں گھر والوں کے توقعات پر پورا اترا۔ یہ اور بات ہے کہ بچپن کی شوخی کے بعد جوانی کی ترنگ کے بارہ سال وقت نے مجھ سے چھین لیا مگر اس نے مجھے زندگی کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کا موقع اور شعور، ساتھ ہی کلفتوں میں مسکرانے کا حوصلہ دیا ہے۔

سہیل: چلئے اچھا ہے زندگی ایک بار پھر خوشگوار ہو چلی ہے اب آپ اپنے بچپن کے بارے میں کچھ بتائیں۔ اور والدین آپ کے کس قسم کے تھے؟

دانش: ہمارے والدین بڑے اچھے اور سلجھے ہوئے تھے۔ یعنی یوپی کے Ideal والدین! والدہ اب بھی باحیات ہیں والد کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ میرا بچپن بڑا ہی خوشگوار گذرا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میں چار بہنوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ آپ کو اندازہ ہوگا ہمارے معاشرے میں ایسے بچے کی کیا آؤ بھگت ہوتی ہے۔ جسے کہتے ہیں۔ "Born with the Silver Spoon" میری پیدائش پر خاندان میں بے پناہ خوشیاں منائی گئیں۔ ہم چھ بہنیں اور دو بھائی ہیں مجھے بے پناہ لاڈ اور پیار ملا۔ بہت اچھے کانونٹ اسکول میں تعلیم دی گئی۔ میں بیحد شریر بھی تھا۔ مگر تمام پیار اور دلار کے باوجود والدہ میری بہت سخت تھیں (اور آج بھی ہیں) تربیت کے معاملے میں کوئی تکلف نہیں کرتی تھیں ساتھ ہی بہت ڈرپوک خاتون تھیں اور آج بھی ہیں۔ باپ نہ صرف تعلیم یافتہ بلکہ شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ نام محمد حنیف تھا اسیر تخلص کرتے تھے۔ شعر کہتے تھے اور نثر میں کافی افسانے اور مضامین ترجمے کئے تھے انہوں نے۔ سخن فہمی مجھے ورثہ میں ملی تھی۔ بچپن سے مشاعروں میں جانا شروع کردیا تھا میں نے۔ میرے پھوپا مرحوم بھی اچھے شاعر تھے نام یوسف

قدیری تھا ان کے ہمعصر اور ساتھیوں میں آرزو سہارنپوری، پرویز شاہدی، جرم محمد آبادی وغیرہ شامل تھے ان بزرگوں کو سن کر مجھے بھی سخن سازی کا شوق ہوا۔ ساتھ ہی والدہ کی سختی اور ڈر نے کبھی اسپورٹس اور کھیل کود میں حصہ لینے نہیں دیا کہ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائے گا۔ ایک بار تمام سختی کے باوجود بھری دوپہر میں چپکے سے گھر سے غائب ہو گیا اور فٹ بال پر مشق کر رہا تھا کہ پاؤں پھسلا اور کہنی سرک گئی۔ وہ دن اور آج کا دن فٹ بال کو پاؤں کیا ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اسکول کے بعد زیادہ تر گھر میں رہنا پڑتا تھا ان دنوں ٹی وی تھی نہیں اس لئے میں کتابوں میں الجھا رہتا۔ والد کا ذوق اچھا تھا اور بڑی اچھی کتابیں انہوں نے جمع کر رکھی تھیں۔ مگر ڈرامے کا مطالعہ یا ذوق مجھے والد سے نہیں ملا۔ بچپن میں ایک بار اپنے محلے میں ایک نوٹنکی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ سبز پری کا جمال، شہزادہ گلفام کے مکالمے کی ادائیگی، کالے دیو کا جلال اور میراثوں کی ٹھمری مجھے آج تک یاد ہے مجھے یہ بھی یاد ہے کہ سارے اداکار بڑے بھنگی قسم کے بدشکل لوگ تھے مگر سرخی اور پاؤڈر کے لیپ' مکالمے کا اتار چڑھاؤ اور ٹھمری کے سحر نے ان چماروں کو جیسے Super Being بنا ڈالا تھا۔ لگتا تھا یہ لوگ کسی اور سیارے کی مخلوق ہیں۔ میں کافی دنوں تک شہزادہ گلفام کے مکالمے دہراتا رہا تھا۔ ان ہی دنوں اسکول میں ایک انگلش ڈرامے میں چھوٹا سا رول کیا ملا، میں اسٹیج پر گلفام کے انداز میں ڈرامے کی دنیا میں بھٹکتا چلا گیا۔ اسکول کے زمانے میں دیکھتے دیکھتے میں ایک کامیاب کامیڈین کے طور پر اپنا لوہا منوا چکا تھا اسکول کے بعد وقت کے ساتھ طبیعت اور رول میں تبدیلی آتی چلی گئی۔ آج بھی تمام کلفتوں کے باوجود کبھی کبھی کامیڈین کے طور پر اسٹیج پر آنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی کمی میں

اپنے سنجیدہ ڈرامے میں کسی کردار کو کامیڈین بنا کر پیش کر دیتا ہوں، جیسے ''عید کا کرب'' میں ''حسین بھائی آٹا والا کا کردار۔ خیر۔ میرا بچپن نہ صرف اچھا اور شوخ گذرا ہے بلکہ میں تمام شرارتوں کے باوجود گھر باہر اور اسکول میں بڑا ہر دلعزیز تھا۔

سہیل: ویسے عام طور پر آپ کا خاندان ٹریڈیشنل تھا یا لبرل؟

دانش: خاندان تو بڑا ٹریڈیشنل تھا مگر باپ بہت لبرل تھے۔ طالب علمی کے دوران وہ ''خاکسار'' گروپ میں تھے اور ادبی طور پر ترقی پسند تحریک کے حامی تھے۔ والدہ بالکل روایتی لکھنوی تہذیب کی دلدادہ۔ آج بھی ان میں تبدیلی نہیں آئی۔ بہنوں نے اچھی تعلیم حاصل کی مگر روایتی طریقے سے۔ میں ان لوگوں میں کیونکہ لاڈلا تھا۔ اس لئے روایت شکن بھی ہوا اور رفتہ رفتہ اپنا رستہ میں نے خود چنا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرے دادا مرحوم اور خاندان کے دیگر لوگوں کو فکر اور اختلاف تھا کہ علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود میں نوٹنکی اور ڈرامے کے چکر میں وقت برباد کر رہا ہوں۔ ویسے بھی ڈرامہ مسلم گھرانوں میں عام طور پر گری ہوئی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ نقالی اسلام میں منع ہے۔ مجھے اس کی منطق آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارے شرفا ڈھکے چھپے نوٹنکی وغیرہ دیکھتے ضرور تھے گھر میں اس کی گنجائش نہ تھی۔ میرے والد نے کبھی کھل کر مجھے نہ اس شوق سے روکا نہ ہی اس کی مذمت کی۔ شاید داداجان کے احترام میں۔ ہاں شعر و سخن کی تعریف کرتے تھے۔ اسکول کے زمانے میں میری ایک نظم ''بیسویں صدی'' پرچے میں شائع ہوئی تو بڑے شوق سے وہ پرچہ والد خرید کر لائے اور والدہ کو دکھایا۔

سہیل: کیا آپ کا خاندان بڑا مذہبی تھا؟

دانش: پھر وہی بات کہ۔ عورتیں مذہبی تھیں اور آج بھی ہیں۔ والد ہمارے لبرل تھے وہ اتنے مذہبی نہ تھے۔ "He was more of a Humanist" میں خود کو بھی نہ "Atheist" کہہ سکتا ہوں نہ ہی میں نے "Ritualistic" مذہب اختیار کیا ہے۔ بقول شخصے کہ جب تک آخری سانس ہے تبدیلی و تغیر کی گنجائش ہے۔ آدمی کا نقطۂ نظر بدلتا ہے واقعات بدلتے ہیں پھر ایک بات اور کہ سچائیاں اور حقیقتیں اپنے آپ کو ایک دم نمایاں نہیں کرتیں، بالترتیب سامنے آتی ہیں۔

سہیل: تعلیم کے دوران آپ کے کیا خواب تھے۔ یعنی پروفیشلی آپ کیا بننا چاہتے تھے۔

دانش: ہندوپاک کے مڈل کلاس خاندانوں میں جب بیٹا پیدا ہوتا ہے تو گھر والوں کے ذہن میں پہلا خیال اسے ڈاکٹر یا انجینئر بنانے کا آتا ہے میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں اسکول میں بہت ذہین طالب علم تھا۔ ہمیشہ فرسٹ آتا تھا۔ گھر والوں کی خواہش تھی کہ بیٹا زندگی میں بہت کامیاب ہو۔ ماں باپ دونوں تعلیم و تربیت میں لگے رہتے تھے۔ جب آٹھویں کا رزلٹ نکلا تو حسبِ معمول میں فرسٹ آیا تھا۔ اس وقت یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مجھے سائنس میں جانا ہے یا کامرس میں۔ آرٹس میں عموماً تھرڈ ڈیوزن لڑکوں کا نام دیا جاتا تھا۔ گھر والوں کی خواہش کی طرح اسکول میں بھی بغیر پوچھے میرا نام سائنس کی فہرست میں آگیا تھا کہ فرسٹ کلاس والے تو صرف سائنس میں جاتے ہیں۔ احتجاج کا پہلا قدم اس فیصلے پر اٹھا کہ میں تو آرٹسٹ ہوں لہٰذا سائنس نہیں میری فیلڈ آرٹس ہے۔ گھر والے کچھ مایوس ہوئے۔ والد نے پہلے سمجھایا کہ تمام آرٹس اور ادب اپنی جگہ اچھی چیز ہے مگر پریکٹیکل لائف کے لئے کوئی پروفیشنل کورس کرنا مناسب ہوگا۔ مگر میرا فیصلہ اٹل رہا اور میں نے آرٹس لے

لیا۔ اسکول کے بعد یونیورسٹی میں بھی انگلش لٹریچر میں آنرز کیا اور ایم۔ اے کرنے کا ارادہ تھا۔ اور مستقبل میں "Teaching Pro-fession" اپنانے کا خیال تھا۔ مگر کچھ مجبوریوں کی وجہ سے ''ایم۔اے'' میں داخلہ لینے کے باوجود اسے مکمل نہ کر سکا۔ پھر والد کی بیماری اور موت نے گھر کی ذمہ داریوں میں الجھا دیا۔ اور وہ سلسلہ تعلیم کا یا خواب ادھورا رہ گیا۔ کلکتے کی ایک اکسپورٹ فرم میں قاعدے کی ملازمت کر رہا تھا کہ نیویارک آنے کا موقع ملا۔ یہاں مختلف "Odd Jobs" کے ساتھ ایک اسکول میں والینٹیر ٹیچر کے طور پر ایک سال پڑھانے کے بعد پارٹ ٹائم ٹیچر کا موقع ملا مگر ماحول پسند نہیں آیا اور پھر ریسٹوراں سے لے کر کپڑوں کے سیلز مین اور ریڈیو۔ ٹی۔وی پر اسکرپٹ لکھنے سے لے کر کمرشیل وائس اوور تک ہر طرح کا کام میں نے کیا۔ اس معاشرے کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ تمام کج روی کے باوجود یہاں "Dignity of Labour" ہے۔ یہاں ٹورانٹو میں بھی جدوجہد کرتے چار سال ہونے کو آئے اب پچھلے سال سے امپورٹ کے کاروبار میں مصروف ہوں۔ تو اس طرح میں بنا تو پروفیسر چاہتا تھا مگر وقت نے یا حالات نے تاجر بنا دیا۔ ٹیگور کی بات یاد آتی ہے کہ ۔

"WHAT I SEEK I GET NOT

WHAT I GOT I SEEK NOT"-

وقت نے یہ سکھایا کہ پرانے خواب کا ماتم کرنے کی جگہ نئے خواب بنتے رہنا بہتر ہے۔ اپنی روٹی روزی کے چکر سے کچھ وقت نکال کر ادبی کاوشوں میں مگن ہو جاتا ہوں، یہی میری روح کی بالیدگی کا وسیلہ ہے۔

سہیل: علیگڑھ میں آپ کتنا عرصہ رہے؟

دانش: میں علیگڑھ میں تین سال رہا۔ چوتھا سال شروع ہو رہا تھا کہ کچھ عرصے رہ کر واپس آ گیا۔

سہیل: علیگڑھ سے آپ کو کچھ خاص نسبت لگتی ہے۔ نام کے ساتھ بھی آپ ''علیگ'' لکھتے ہیں۔ وہ تین سال کی زندگی کا اہم رخ کیا تھا؟

دانش: علیگڑھ علم و ادب اور ثقافت کا گہوارہ رہ چکا ہے اور اپنی تمام تر بے حالی کے باوجود آج بھی اس کا ایک کردار ہے۔ اردو ادب کے تقریباً ہر بڑے قلمکار کا تعلق کسی نہ کسی طرح علیگڑھ سے رہا ہے۔ میرے لئے بھی علیگڑھ ایک ڈریم لینڈ سے کم نہ تھا۔ تعلیم کے علاوہ ادبی و ثقافتی طور پر علیگڑھ نے مجھے بڑا Confidence عطا کیا ہے۔ کلکتے کی تمام علمی ادبی اور ثقافتی کاوشوں میں مجھے مقامی سمجھا جاتا تھا مگر علیگڑھ جاتے ہی ڈرامے کی Activity نیشنل لیول پر ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ملک گیر سطح پر استادوں اور نقادوں ساتھ ہی دہلی ریڈیو سے رابطہ بڑھتا چلا گیا۔ یعنی کنویں سے نکل کر میں ایک کھلے سمندر میں تیرنے لگا۔ وہ میری زندگی کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔

سہیل: اس دور میں ایسے کوئی ادیب یا فنکار تھے، جنہوں نے خاص طور پر آپ کو متاثر کیا ہو؟

دانش: وہ شاعر جنہیں ہم دور سے کلکتے کے مشاعروں میں دیکھتے تھے یا وہ جو کبھی کلکتے آئے ہی نہ تھے۔ علیگڑھ میں رہ کر ان تمام بڑے قلمکاروں سے نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ ان میں سے کئی شاعروں اور ڈرامہ نویسوں سے دوستی کی حد تک بے تکلفی بھی رہی۔ معین احسن جذبی، خواجہ مسعود ذوقی اور خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے استادِ فن کے

ساتھ تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ پھر شہریار اور بشیر بدر سے بڑا تعلق رہا۔ ڈرامے کے معاملے میں حبیب تنویر سے میں بڑا متاثر تھا۔ ان دنوں ان کا ڈرامہ ''آگرہ بازار'' بہت مقبول ہوا تھا۔ محمد حسن صاحب کے ڈرامے بھی مشہور تھے۔ میں ان سے بھی متاثر تھا۔ منیب الرحمٰن صاحب کا ڈرامہ ''حبیب ماموں'' بھی مشہور ہوا تھا۔ اسی دوران میں نے سردار جعفری کی ڈاکومنٹری ''بزمِ یاراں'' میں حصہ لیا تھا۔ خواجہ احمد عباس نے علیگڑھ میں ہی مجھے اپنی فلم ''سات ہندوستانی'' کی Audition کے لئے بمبئی بلایا تھا مگر میں کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں جاسکا ساتھ ہی فلم میری لائن نہیں تھی میں ڈرامے میں رہنا چاہتا تھا۔ بڑا عجیب دور تھا وہ۔ حالانکہ ڈرامے میں میری تربیت بنگلہ ڈراموں سے ہوئی ہے اور میں کلکتے میں بادل سرکار، اتپل دت، وغیرہ اور ہمعصر ظہیر انور سے بڑا متاثر رہا مگر علیگڑھ نے مجموعی طور پر میری شخصیت کو صیقل کیا ہے۔

سہیل: شمالی امریکہ آنے کے بعد آپ کی طرزِ زندگی اور نظریات میں کیا تبدیلی رونما ہوئی؟

دانش: کلکتے کا بچپن ہو یا علی گڑھ کی جوانی، وہاں جو "Limitations" بندشیں موجود تھیں وہ یہاں آکر پتہ چلا نہیں ہیں۔ کھلا ماحول اور ہر طرح کی آزادی۔ چاہے وہ نجی زندگی ہو یا آرٹسٹک لائف یا لکھنا پڑھنا۔ یہ فنکار اور ادیب پر منحصر ہے کہ وہ اس آزادی کو کتنی ذمہ داری سے بروئے کار لاتا ہے۔ کیونکہ ہر آزادی کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ ہمارے معاشرے میں کچھ Ta-boos اور Inhibition خواہ مخواہ کی تھیں وہ بدعتیں یہاں نہیں تھیں یہ اور بات ہے کہ یہاں اپنی طرز کی بدعتیں موجود ہیں۔ خیر۔

رفتہ رفتہ خود میرے سوچنے سمجھنے میں اور طرزِ زندگی میں تبدیلی آتی گئی۔ کچھ باتیں جو میں وہاں خاندان معاشرہ یا سیاسی طور پر نہیں لکھ سکتا تھا اسے میں نے بلاخوف و جھجک یہاں لکھا ہے۔

سہیل: شمالی امریکہ کی زندگی میں آپ "Socially Liberated" ہوئے یا نظریاتی طور پر یہ تبدیلی آئی۔؟

دانش: میرے خیال میں "Socially Liberated" میں کلکتے کے ماحول میں اور علیگڑھ کے زمانے سے ہی تھا۔ یہاں نظریاتی طور پر زیادہ لبرل ہوا۔ اندر سے کچھ تبدیلی کی ضرورت بھی محسوس ہوئی اور ماحول نے رفتہ رفتہ سوچنے سمجھنے کا ایک زیادہ کھلا ہوا ذہن عطا کیا ہے۔

سہیل: آپ کی کتابوں سے بعض لوگوں کو کچھ اختلاف ہے۔ ایک طرف "Prometheus" ''پرومیتھیس'' کتاب ہے جس میں لیفٹ کی طرف جھکاؤ نظر آتا ہے۔ اور آپ کے سفرنامے ''آوارگی'' سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب سے بھی آپ کو بڑی رغبت ہے۔ تو بعض لوگوں کو یہ واضح نہیں ہوتا کہ آپ کا جھکاؤ کس طرف زیادہ ہے؟

دانش: میرا رجحان نہ لیفٹ کی طرف زیادہ رہا ہے نہ ہی میں کبھی بہت مذہبی رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی کوئی لیفٹ یا رائٹ ونگ کا ٹیگ اپنی ذات کے ساتھ نہیں لگایا ہے۔ ڈرامہ میری دلچسپی تھی اور کیونکہ کلکتے میں لیفٹ ونگ والے لوگ زیادہ تر ڈراموں میں Involve ہیں اس لئے میں ان لوگوں کے ساتھ زیادہ رہا۔ ہو سکتا ہے اگر کوئی جماعت والے نوٹنکی کو تبلیغ کا ذریعہ بناتے تو میں ان کے گروہ میں

نظر آتا اس وقت بھی یہ ممکن نہ تھا کہ شو ختم کر کے میں مسجد میں نظر آتا۔ ''پرومیتھیس'' کیونکہ بنگال کی دین ہے اس لئے اس میں وہاں کا سیاسی انتشار بھی جھلکتا ہے۔ رہی بات 'آوارگی' کی، تو اس میں دو تین ابواب ایسے ہیں جس میں شمالی امریکہ میں مسلم تارکِ وطن کی سماجی اور مذہبی طریقۂ کار یا کمیونٹی سینٹر کی کارگذاری نیز تہوار منانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں کسی ذاتی نقطۂ نظر سے پرے میں نے صرف جو کچھ دیکھا اسے کاغذ پر منتقل کر دیا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس تحریر سے کوئی مجھ پر کسی طرح کا لیبل کیونکر لگا رہا ہے۔ حالانکہ اسی سفرنامے میں پیرس کے قحبہ خانے۔ نیویارک کی ریڈ لائٹ ڈسٹرکٹ۔ اور کوپن ہیگن کی جنسی بے راہ روی پر بھی لکھا گیا ہے۔ کیا جنھیں اعتراض ہے وہ اسے فحش نگاری کہیں گے۔ میرے خیال میں ''آوارگی'' ایک سادہ لوح سیاح کی "Observations" ہیں جنھیں وہ نہ کسی مذہبی فکر کی تبلیغ کے تحت لکھ رہا ہے نہ ہی کسی کی تضحیک کی خاطر! اس کے راستے میں جو چیزیں آئیں اسے من و عن کاغذ پر اتارتا چلا گیا۔ یہ میرا پہلا سفرنامہ تھا، مجموعی طور پر میرے قاری اس سے خوش ہیں۔ دوسرے سفرنامے ''مزید آوارگی'' میں میں نے ایک سلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ میانہ روی اختیار کی ہے جو میری نجی زندگی میں بھی شامل ہے۔

سہیل: آپ کو اس بات کا اندازہ ہے کہ میرا تعارف شروع میں آپ سے ذاتی طور پر نہیں ہوا تھا۔ آپ کی نظم ''میں کہ تیرا پہلا لمس نہیں تھا'' کے وسیلے سے ہمارا تعارف ہوا۔ میں ہمیشہ اس بارے میں Cu-rious تھا کہ اس نظم کو لکھنے کا محرک کون تھا۔ وہ نظم ہمیشہ مجھے پسند آئی ہے؟

دانش: نیویارک آنے کے بعد تمام پریشانیوں الجھنوں اور ذمہ داریوں کے باوجود جب جب موقع ملا میں نے شعری نشستوں اور مشاعروں میں حصہ لیا، مگر پہلی نشست سے ہی مجھے کچھ مایوسی ہوئی تھی۔ نیویارک میں رہ کر بھی ہمارے بیشتر شعراء گل و بلبل والی روایتی غزلیں کہہ رہے تھے۔ وقت نے جتنا بھی باندھ رکھا ہو اور ذمہ داریوں نے جتنا بھی زیر کر رکھا ہو مگر اندر سے بنیادی طور پر میں روایت شکن تھا۔ حالات کے تحت ٹھنڈا پڑ جاتا تھا مگر اس دوران اچانک وہ اندر کی بغاوت نے سر اٹھایا اور میں نے احتجاج کے طور پر وہ نظم کہی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اسی دور میں میرا تعلق ایک محترمہ سے کچھ عرصے کے لئے ہوا تھا اور کچھ حد تک وہ بھی اس نظم کی محرک بنی تھیں مگر سچ یہ ہے کہ اس دوشیزہ کے لئے نہ یہ نظم کہی تھی نہ اسے دکھائی۔ میں نے نیویارک کی روایتی اردو شاعری کے خلاف یہ نظم کہی تھی۔ مجھے معلوم تھا لوگ اسے کھلے دل سے قبول نہیں کریں گے۔ میں نے جب مشاعرے میں یہ نظم پڑھی تو بیشتر لوگوں کو جیسے چپ لگ گئی۔ مگر چند دوستوں نے اس کی دل کھول کر تعریف کی جس میں ظفر زیدی مرحوم اور سحر فتحپوری پیش پیش تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نظم نے ہماری دوستی کو مستحکم کیا ہے۔

سہیل: کیا شمالی امریکہ آنے کے بعد آپ کا عورتوں کے بارے میں تصور یا ان کے ساتھ Interaction کچھ مختلف ہوا یا ویسا ہی تھا جیسا کے کلکتہ یا علیگڑھ میں تھا؟

دانش: میرے خیال میں بہت زیادہ اس میں تبدیلی اس لئے نہیں آئی کہ جب سے شعوری طور پر میں اسٹیج کرافٹ سے منسلک ہوا تو لڑکیوں اور عورتوں سے نارمل Interaction ہمارا ہمیشہ رہا ہے۔ مجھے کسی

قسم کی Inhibition نہیں تھی کہ لڑکیوں سے آسانی سے دوستی نہیں ہوسکتی وغیرہ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کے ساتھ کھلا -Interac tionیا دوستی بہت بڑی چیز سمجھی جاتی ہے۔ ایسی بات میرے ساتھ نہیں تھی۔ حالانکہ میں نے "Co.Ed" میں تعلیم حاصل نہیں کی، مگر اسٹیج۔ ریڈیو۔ ٹی وی وغیرہ کی وجہ سے لڑکیوں سے عام رابطہ رہا ہے۔ وہ ایک برادری یا نوٹنکی منڈلی تھی جس میں لڑکے لڑکی کا کوئی خاص امتیاز نہ تھا یہ دیکھا جاتا تھا کہ آرٹسٹ کون زیادہ اچھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حسبِ معمول اپنی ہم زبان لڑکیاں اس گروپ میں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ بیشتر ہندو بنگالی لڑکیاں ہمارے گروپ میں تھیں آج بھی مسلم گھرانے کی لڑکیاں ایسے ماحول میں کم جاتی ہیں کیونکہ ڈرامہ وغیرہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ شمالی امریکہ اور وہاں کے معاملے میں اتنا فرق ضرور محسوس کیا میں نے، کہ وہاں کوشش یہ ہوتی تھی کہ لڑکے دوستی کے لئے لڑکیوں کی طرف بڑھتے تھے۔ یہاں اندازہ ہوا کہ ماشا اللہ لڑکیاں بھی آپ کی طرف بصد خلوص دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتی ہیں۔ اب اسے میری قسمت کی ستم ظریفی کہئے کہ جب ہم اس کھلے ڈلے معاشرے میں آئے تو ساتھ ذمہ داریوں کی لمبی فہرست لائے۔ اب کام کرتا یا عشق۔ بس دل لگا کر نہ کام ہوا نہ ہی جی بھر کر تعلقات بڑھا سکا۔ دیکھتے دیکھتے دس سال ہوا ہو گئے۔

سہیل: کینیڈا کی زندگی نیویارک سے کس طرح مختلف لگی آپ کو؟

دانش: کینیڈا آئے چار سال ہونے کو آئے۔ یہاں کی زندگی نیویارک سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ نیویارک کی زندگی میں شور شرابا بہت تھا۔ ہر چیز بہت تیز رو تھی۔ یہاں وہ بھاگ دوڑ نہیں ایک طرح کا

سکون ہے۔ مگر مجھ جیسے آدمی کے لیے جو اب تک جدوجہد میں لگا ہو۔ روز کنواں کھودنا روز پانی پینا والا معاملہ ہے۔ ہاں، اب لگتا ہے کہ زندگی میں ایک طرح کا ٹھہراؤ آتا جارہا ہے ہو سکتا ہے کہ ''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں'' یا پھر جو ذمہ داریاں واجب الادا تھیں وہ کیونکہ رفتہ رفتہ پوری ہو گئیں تو کچھ ذہنی سکون آتا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ نیویارک کی مشینی زندگی اور ٹی وی کے کمرشیل اسکرپٹ والے کام نے میری تخلیقی صلاحیتوں کو بالکل ماند کردیا تھا۔ یہاں آکر وہ تخلیقی سوتے جو خشک ہو چلے تھے ایک بار پھر تازہ ہوگئے ہیں۔

سہیل: اب میں دو اک باتیں ذاتی نوعیت کی پوچھنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے آپ چند سالوں کے بعد چھٹیاں منانے انڈیا جارہے ہیں ساتھ ہی کچھ شادی وغیرہ کا بھی ارادہ ہے۔ تو نوجوانی سے شادی کے بارے میں آپ کا کیا تصور رہا ہے کہ شادی ہو اور بچے ہوں وغیرہ یا یہ "Later Development" ہیں؟

دانش: یہ بڑا عجیب سا سوال ہے۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے کبھی سوچا یا خواب دیکھا کہ میری شادی ہو اور بچے ہوں یا فیملی لائف کیسی ہونی چاہئے۔ بچپن بڑا خوشگوار گذرا۔ اس دور میں تو کوئی بھی اس طرح کی فکر نہیں کرتا ہے۔ پھر جب یونیورسٹی کا سلسلہ شروع ہوا تو میں سنجیدگی سے ڈرامہ اور کلچر میں مگن تھا۔ خود کو بڑا رومینٹک آدمی سمجھتا تھا۔ ڈرامے کی وجہ سے جتنی ہونی چاہئے اتنی شہرت بھی ملی ہوئی تھی۔ اس دور میں یعنی ٹین ایج تک شادی کا خیال یا فیملی لائف کا تصور بھی نہ تھا۔ علیگڑھ کے بعد گھریلو ذمہ داریوں میں الجھتا چلا

گیا۔ اب ذمہ داریوں کے جو نرم گرم بارہ سال گذرے ہیں اس میں کیونکہ میں باپ کا رول ادا کر رہا تھا تو خواہ مخواہ سنجیدہ ہوتا چلا گیا اور شعوری یا لاشعوری طور پر خاندان اور فیملی لائف وغیرہ کا خیال ذہن پر اثر انداز ہوتا چلا گیا۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ان آزمائشوں نے مجھے کچھ تھکا ڈالا اور کچھ ٹوٹ پھوٹ بھی گیا اندر سے۔ تو ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حالانکہ کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ ''بھئی اب جبکہ ساری ذمہ داریاں بحسن و خوبی ختم ہوگئیں ہیں تو اب تم آزاد ہو اور کچھ عرصے آزادی کے مزے اڑاؤ یہ دوبارہ کیوں خود کو باندھنے کی فکر میں ہو''۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے نہیں معلوم یہ سب کیونکر ہوتا چلا گیا۔ پچھلے سال میری ملاقات ایک محترمہ سے ہوئی ہم خیال ہونے کی وجہ سے ہم لوگ سنجیدہ ہوگئے اور اب شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مجھے اب یعنی ۳۶ سال کی زندگی میں ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا میں نے کوئی جلد بازی کی ہے۔

سہیل: آپ کی ازدواجی زندگی یا فیملی لائف کا آپ کی ادبی زندگی پر کیا اثر پڑے گا؟

دانش: مجھے نہیں لگتا کہ میری ازدواجی زندگی کا کوئی اثر میری ادبی کاوشوں پر پڑے گا۔ گو کہ میری منگیتر عظمیٰ کوئی ادیب وغیرہ نہیں ہے مگر ادب اور آرٹس سے اسے خاصی دلچسپی ہیں۔ ڈرامے اسے بھی پسند ہیں۔ ہماری ملاقات بھی ادبی نوعیت کی تھی۔ مجھے امید ہے وہ میری ادبی کاوشوں میں میری حوصلہ افزائی کرے گی۔ ویسے بھی اس نے ہمیشہ مجھے "Encourage" کیا ہے۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ ادبی کاوشیں جو میں ذمہ داریوں کی وجہ سے پوری طرح کھل کر نہیں کر

پار ہا تھا۔ اب دل کھول کر اس میں حصہ لوں۔ وہ فخر محسوس کرتی ہے کہ میں ایک رائٹر ہوں۔

سہیل: اب اگلے پانچ سال میں آپ کے پلان کیا ہیں؟

دانش: میری خواہش ہے کہ سنجیدگی سے میں صرف ڈرامے کے لئے خود کو وقف کردوں۔ چند استادوں اور دوستوں کی بھی یہی رائے ہے۔ چاہے کلکتہ ہو، علیگڑھ، نیویارک یا ٹورانٹو اردو ڈرامے کا اسٹیج خالی پڑا ہے۔ دراصل ڈرامہ صنف بڑا مشکل بھی ہے۔ عام طور پر سطحی فارس 'Farse' کامیڈی کے نام پر اسٹیج کی جاتی ہے۔ اسے سیریس کرافٹ کے طور پر تسلیم کرنا بہت بڑا چیلنج ہے۔ میرا خواب ہے کہ شمالی امریکہ کی زندگی پر جو ڈرامے میں نے لکھے ہیں انہیں اسٹیج کروں۔ کچھ بات چیت ہو رہی ہے جلد ہی اس کا آغاز کروں گا۔ آج کل عالمی ڈرامہ کا انتخاب اور ترجمہ ''دنیا کی نوٹنکی'' ترتیب دے رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں یہاں اردو ہندی والوں کے لئے سنجیدہ تھیٹر کا سلسلہ شروع کر سکتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ دوستوں کا ساتھ رہا تو اچھے ڈرامے نہ صرف لکھوں گا بلکہ معیاری ڈرامے اسٹیج بھی کروں گا۔

سہیل: جب آپ اپنی پچھلی زندگی پر نگاہ کرتے ہیں تو کوئی ایسی چیز ہے جس پر آپ کو بہت زیادہ فخر ہو یا کوئی بات ایسی ہے جس سے افسوس ہو کہ موقع ہاتھ آیا اور آپ وہ کام نہیں کر سکے؟

دانش: جب میں پچھلے دس بارہ سالوں پر نظر کرتا ہوں، جو میری جوانی کا "Prime Time" تھا تو گھر والوں کی نظر میں تو میں ایک آئیڈیل

بھائی یا بیٹا تصور کیا جاتا ہوں جس نے تمام ذمہ داریاں بڑی خندہ پیشانی سے پوری کر دیں ، ہر کوئی اپنی جگہ سیٹ ہو گیا، ہر کوئی خوشحال ہے اس لحاظ سے اگر دیکھتے ہیں تو گھر والے خوش ہیں اور میں بھی ایک طرح سے مطمئن ہوں۔ حالانکہ یہ کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں تھا اور بھی لوگ کرتے ہیں اوروں کے بھی باپ وقت سے پہلے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں مگر کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ میں نے گھر والوں کی محض بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا ہے۔ اگر میرے پاس زیادہ پیسہ ہوتا تو گھر کی دیکھ بھال زیادہ بہتر طریقے سے کرتا اور خود بھی اتنا پریشان نہ ہوتا۔ جتنا اس پروسیس میں ہوا۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر جو شعلہ بھرا ہوا تھا اسے حالات نے کچھ ٹھنڈا کر دیا ہے۔ اگر میں گھریلو الجھنوں میں نہ پھنستا تو ادبی یا کلچرل سطح پر اب تک کچھ کر چکا ہوتا، یعنی ان حالات میں دو تین کتاب آئی ہیں تین چار زیر طبع ہیں۔ اگر یہ الجھنیں نہ ہوتیں تو ہو سکتا ہے زیادہ سنجیدگی سے کام کر رہا ہوتا۔ جو کچھ ہوا وہ پوری طرح نہیں ہوا۔ یعنی آدھے ادھورے والا معاملہ ہے۔

خیر میں کسی طرح مایوس نہیں ہوں۔Sky is the Limit مجھے امید ہے باقی کی زندگی میں کچھ نہ کچھ کرتا رہوں گا۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ حوصلہ باقی ہے اور جنگ جاری ہے......

سہیل: خیر...... ہمارا انٹرویو اب اختتام کو پہنچا۔ کوئی ایسی بات یا پہلو جو اہم ہو اور ہماری گفتگو میں نہ آیا ہو یا آپ اس کا اظہار کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں؟

دانش: مجھے نہیں لگتا کوئی بات رہ گئی ہے۔ اس ڈیڑھ گھنٹے کی گفتگو میں اتنی

باتیں ہوئیں میں خود پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ بچپن کی گلیوں سے لے کر جوانی کے دوراہے تک۔ آج وہ سب باتیں ہوئیں جنہیں میں تقریباً بھول چلا تھا۔ میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے موقع دیا کہ حالات کا آموختہ دہرالیا جائے۔ حیرت بھی ہوئی، میں جتنا سمجھتا تھا میری یادداشت اس سے اچھی نکلی۔

سہیل: شکریہ مجھے ادا کرنا ہے کہ آج بہت ساری باتیں معلوم ہوئیں، جنہیں بہت سے لوگ محض اس لئے نہیں جانتے کہ آپ نے نجی زندگی میں بھی ڈرامہ شامل کر رکھا ہے۔ چہرے پر آپ نے خوش رنگ نقاب لگا رکھا ہے اور ہر وقت خوش نظر آتے ہیں۔ مگر اس نقاب کے پیچھے آج میں نے ایک اور جاوید دانش کو دیکھا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے دکھ سکھ کو میرے ساتھ "Share" کیا ہے۔ شکریہ!

دانش: نوازش!

☆

میرے قبیلے کے لوگ۔۲

مضامین

"اشفاق حسین

مٹی کے گھروندے ہیں تو سیلاب بھی ہوں گے"

جب ہم کسی شاعر کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی زندگی کے ان بنیادی تجربات کا سراغ لگانا پڑتا ہے جن پر اس کے فکری نظام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور ان کلیدی استعاروں کا کھوج لگانا پڑتا ہے جن سے اس کے فن کی عمارت اور تہہ خانوں کے قفل کھلنے کے امکانات ہوتے ہیں۔ جب ہم اشفاق کی شاعری کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہجرت کا تجربہ اور گھر اور پانی کے استعارے اس کی زندگی اور فن کی عمارت کے بنیادی ستونوں میں سے چند ایک ہیں اسی لئے میرے خیال میں اس کا یہ شعر۔

نکلے تھے جو گھر سے تو یہ معلوم تھا ہم کو
مٹی کے گھروندے ہیں تو سیلاب بھی ہوں گے

اس کی ذات اور اس کی شاعری کو سمجھنے میں ہمارا پہلا قدم ثابت ہو سکتا ہے۔

ویسے تو ہجرت کا تجربہ نہ تو انسانوں کے لئے نیا ہے اور نہ ہی اردو شاعری کے لئے لیکن ہر نسل کا شاعر اسے اپنی ذات اور اپنے عہد کے آئینوں میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں اس کا تخلیقی اظہار کرنا چاہتا ہے اور اشفاق نے بھی اس تجربے کو نئے معانی پہنانے کی کوشش کی ہے۔

ویسے تو ہم سب جانتے ہیں کہ انسان کا ہجرت سے تعلق بہت پرانا ہے بلکہ یہ کہنا شاید بے جانہ ہو کہ انسان کی پیدائش ہی جنت سے ہجرت کی مرہونِ منت ہے۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے اس میں بھی ہجرت کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہجرت، ہندوستان سے افریقہ کے مختلف حصوں میں ہجرت، پاکستان کی طرف ہجرت، پاکستان سے مشرقِ وسطیٰ کی طرف ہجرت، ایشیا سے یورپ اور پھر ایشیا اور یورپ سے شمالی امریکہ کی طرف ہجرت۔ ہجرتوں کا یہ سلسلہ کافی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ جب ہم اردو کے مہاجر شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اکثر اوقات ایک حزن و ملال کی کیفیت ملتی ہے۔ انکا رشتہ حال اور مستقبل کی نسبت ماضی سے گہرا لگتا ہے اور اپنے خاندان، دھرتی، دوستوں اور روایات کا ذکر زیادہ ملتا ہے ان کی شاعری میں اس ماحول کا جس میں وہ برسوں سے ہجرت کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں بہت کم جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ اپنے ماضی کو صرف یاد ہی نہیں کرتے اس پر فخر بھی کرتے ہیں اور اسے حال سے بہتر گردانتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ حال کی سنگین اور تکلیف دہ حقیقتوں کی نسبت ماضی کے سہانے خوابوں میں پناہ لینے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔

ایشیا سے شمالی امریکہ کی طرف ہجرت پچھلی چند دہائیوں کا عمل (Phe-nomenon) ہے یہ ہجرت پچھلی ہجرتوں سے کئی لحاظ سے مختلف ہے اس میں اختیاری پہلو اجباری پہلو سے زیادہ نمایاں ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور یورپ جانے والے ایشیائی مہاجروں میں مزدور پیشہ لوگوں (Working Class People) کا تناسب زیادہ تھا جو اپنے خاندانوں کو چھوڑ کر تلاشِ رزق میں گھر

سے نکل پڑے تھے جبکہ شمالی امریکہ میں آنے والے مہاجروں میں یونیورسٹی کے طلباء اور پروفیشنلز (Students + Professionals) کی تعداد زیادہ ہے جو تعلیم اور اعلیٰ مستقبل کے لئے اپنے خاندانوں کو ساتھ لے کر آئے ہیں۔ شمالی امریکہ کے ساتھ ان مہاجروں کا وہ تلخ ماضی بھی وابستہ نہیں جس پر Colonial-ism کے آسیب سایہ فگن رہتے تھے۔ اس لحاظ سے ہجرت کا یہ تجربہ ان شاعروں کے لئے نئی معنویت لئے ہوئے ہے جو ایشیا سے شمالی امریکہ آئے ہیں اشفاق بھی انہی میں سے ایک ہے۔

اشفاق نے جب پاکستان کو جہاں اس کے بچپن اور نوجوانی کے دن گزرے تھے خیرباد کہہ کر کینیڈا کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس کے حساس دل اور دماغ نے دو مختلف سطحوں پر ردِ عمل کا اظہار کیا۔

ہم اجنبی ہیں یہاں پر

اس نے شمالی امریکہ کی گلیوں، بازاروں، گھروں، دفتروں اور شہروں کی روزمرہ کی زندگی کو دیکھا تو اجنبیت محسوس کی لیکن جب اس روزمرہ کی زندگی کے درپردہ ان روایات کو پرکھا جن میں جمہوریت، انسان، دوستی، شخصی آزادی اور معاشرتی انصاف کے جذبے کارفرما تھے تو کہا ۔

مگر وطن سے کم

کیونکہ وہ ایشیائی معاشرتی زندگی کے بارے میں کہہ چکا تھا ۔

دیپ جلتے تھے فروغِ شب ظلمت کے لئے
کم نہ تھی بات یہ اس شہر سے ہجرت کے لئے

اور جب اشفاق نے اپنی زندگی کو مستقبل کے آئینے میں دیکھنا چاہا تو اپنے اور اپنے جیسے دیگر مہاجروں کے بارے میں پیشین گوئی کی ۔

شناخت اپنی ہم اک روز بھول جائیں گے

ہمیں ہے اس کا یہاں ڈر مگر وطن سے کم

اشفاق کی کینیڈا میں آکر لکھی ہوئی اس کی اس پہلی غزل کے اشعار جن میں ڈر اور امید کے ملے جلے جذبات نظر آتے ہیں اس کے مشاہدات، تجربات اور نظریات کو سمجھنے میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں ہجرت کے بارے میں یہ دو مختلف احساسات بار بار اس کی غزلوں اور نظموں میں مختلف روپ دھار کر ابھرتے ہیں اور آہستہ آہستہ زندگی کا استعارہ بن جاتے ہیں۔

اشفاق جب شمالی امریکہ کی معاشرتی زندگی میں چند قدم آگے بڑھتا ہے تو ایک طرف اسے مغربی زندگی کی خوشیاں، مسرتیں، آسائشیں اور سہولتیں لبھاتی ہیں لیکن دوسری طرف اسے مشرق کی قربتیں، یادیں اور تکلیفیں رلاتی ہیں اور وہ کہتا ہے۔

میزباں تہذیب کی نیرنگیاں ہیں اور ہم
کھوئی کھوئی سی عجب محرومیاں ہیں اور ہم

یہ جذبے اشفاق کے دل میں ایک کسک اور ایک خلش بن جاتے ہیں لیکن اسے نئے راستوں، نئے رشتوں اور نئے مشاغل کو گلے لگانے سے نہیں روکتے اور جوں جوں نئی طرزِ معاشرت سے آشنائی ہوتی جاتی ہے وہ پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے اور واپس جانے کی خواہش آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جاتی ہے۔

لوٹ کر واپس چلے جانے کی بھی خواہش نہیں
پاؤں سے الجھی ہوئی مجبوریاں ہیں اور ہم

اشفاق جب ہجرت کے سفر میں چند قدم اور بڑھتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے ارد گرد مہاجروں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جنہیں شمالی امریکہ میں آئے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے اور انہوں نے نئے اندازِ فکر، نئے طور طریقے، نئی زبان اور نئے دوستوں کے ساتھ ساتھ نئی شہریت بھی اختیار کرلی ہے لیکن پھر بھی وہ واپس ایشیا جانے کی دوسری ہجرت کی تیاری میں

مصروف نظر آتے ہیں۔ اشفاق کی نگاہ میں وہ افراد اور خاندان جذباتیت اور خود فریبی کا شکار ہوئے ہیں کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ جس شہر سے بیس سال پیشتر انہوں نے ہجرت کی تھی وہ شہر بھی اب بہت بدل چکا ہے اسی لئے وہ اپنی رائے کا کھل کر اظہار کرتا ہے۔

دوسری ہجرت کی تیاری خود کو دھوکا دینا ہے
شاخ سے ٹوٹ کے گرنے والا پھول بھلا کب مہکا ہے
اس دھرتی سے توڑ کے رشتہ واپس جانے والوں کو
اول اول خوش ہونا ہے آخر آخر رونا ہے

اشفاق اس حوالے سے ایک نہایت ہی حقیقت پسند شاعر ہے اس کا خیال ہے کہ واپس لوٹ جانے کی خواہش سراب سے بڑھ کر کچھ نہیں یہ وہ دشت ہے جہاں مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہوجاتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ہمیں نئے ماحول میں اپنی بودوباش کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہئے اور اپنے مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔

اشفاق کو جہاں مہاجروں کا وہ گروہ ملتا ہے جو دن رات اپنے ماضی کی مالا جپتے رہتے ہیں اور واپس 'گھر' چلے جانے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں جنہیں اشفاق خود فریبی سمجھتا تھا تو اسے ایسے مہاجروں کی بھی کمی نظر نہیں آتی جو اپنے حال میں اتنے کھو گئے ہیں کہ مغربی دنیا کی آسائشوں کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ بیٹھے ہیں۔ ان میں سے اکثر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اگر انہوں نے مشرق کی دربدری اور غربت کو چھوڑ کر مغرب میں ایک عالیشان گھر لے لیا ہے تو وہ ان کے تحفظ کے لئے کافی ہے۔ اشفاق اس رویے کو بھی خود فریبی پر محمول کرتا ہے اور اس گھر کو جو اس کی شاعری میں ایک استعارہ بن کر ابھرتا ہے، سراب سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس کا خیال ہے کہ اول تو وہ گھر جسے مہاجر اپنا گھر اور ہجرت کا ثمر سمجھتے ہیں ان کے اپنے نہیں ہوتے بلکہ یہ بینکوں کی ملکیت ہوتے ہیں اور قرض ادا نہ ہونے کی صورت میں واپس لیے جاسکتے ہیں۔

خوبصورت سہی نوچے ہوئے پر کس کے ہیں
شاخ در شاخ یہ ہجرت کے ثمر کس کے ہیں
شہر کی ساری عمارات ہیں کن لوگوں کی
قرض پر سب نے جو لے رکھے ہیں گھر کس کے ہیں

اشفاق کی نظر صرف گھروں کی معاشی صورتِ حال پر ہی نہیں بلکہ معاشرتی پہلو پر بھی ہے اس کا خیال ہے کہ جب مہاجر نئی دنیا میں گھروں اور کاروباروں کے مالک بن جاتے ہیں اور کاروباروں میں ترقی کرنے لگتے ہیں تو بعض دفعہ اس سے مقامی لوگ حسد اور رشک کرنے لگتے ہیں اور حالات ناگفتہ بہ ہوں تو وہی جذبات تعصب کا رخ اختیار کر لیتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں مہاجر اپنی کامیابی پر بھی خوشیاں نہیں منا سکتے اور گمنامی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔

چمکے گا نسل و رنگ کے داغوں کا سلسلہ
دروازے پہ بھی نام نہ لکھا کرے کوئی

اشفاق کو اندازہ ہے کہ مہاجروں کی زندگی ہمیشہ حالات کے رحم و کرم پر ہوتی ہے اگر ملک کے معاشی معاشرتی اور سیاسی حالات بدلیں تو مہاجروں کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے وہ یورپ، افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ میں مہاجروں کے ماضی اور مستقبل سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ بعض دفعہ کئی نسلوں کی آرام و سکون کی زندگی کے بعد ہی اچانک مہاجروں پر زندگی کا دائرہ تنگ ہو سکتا ہے اس لئے وہ کہتا ہے۔

طوفانِ تند و تیز بہا کر ہی لے نہ جائے
دریا کے رخ پہ ایک شکستہ مکان ہے

اشفاق کی شاعری میں پانی ایک بلیغ استعارہ بن کر ابھرتا ہے اور صرف مہاجروں کی زندگی کو ہی نہیں بیسویں صدی کے انسان کے مسائل کا بھی احاطہ

کرتا ہے اس پانی کی زد میں صرف مہاجر کا گھر ہی نہیں بیسویں صدی کے انسان کا اپنا وجود بھی ہے۔

یہ کچی مٹی کے دیوار و در نہیں تنہا
مرا وجود بھی ہے پانیوں کے نرغے میں

اشفاق کی شاعری میں جب ہم پانی کی اہمیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ

کہیں وہ آنسو بن کر آنکھ سے ٹپکتا ہے
کہیں وہ بارش کا قطرہ بن کر برستا ہے
کہیں وہ چڑھتے ہوئے دریا کی صورت اختیار کر لیتا ہے
اور کہیں وہ گہرے سمندر کا روپ دھار لیتا ہے

اور پھر اشفاق مٹی کے گھروندوں، ساحلوں اور جھیلوں کے حوالے سے زندگی کے اسرار و رموز اور جدوجہد کی کہانی سناتا ہے اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی، داخلی اور خارجی، معاشی اور نظریاتی مسائل پر تبصرہ کرتا ہے اس طرح اشفاق بیسویں صدی کے انسان کو ایک ایسا استعاراتی نظام مہیا کرتا ہے جس سے وہ اپنی ذات کی آگہی حاصل کر سکتا ہے اور اپنے مسائل کی گتھیاں سلجھا سکتا ہے۔

سمندر کروٹیں لیتا تھا دل میں — مگر پلکوں پہ اک قطرہ نہیں تھا
کمال ضبط کی حد پر ہوں میں بھی — مگر دریا تو رستہ مانگتا ہے
ابھرے گا اپنی ذات کی پہچان کا سوال — گہرے سمندروں میں نہ اترا کرے کوئی
مچھلی پانی میں ہچکولے لیتی ہے — ڈوبنے والا شخص مچھیروں جیسا تھا
ایسی تصویریں سر اخبار کیوں نایاب تھیں — بستیاں سیلاب سے پہلے ہی زیرِ آب تھیں

ان اشعار سے ہمیں اشفاق کی شاعری کے Master Symbols کا اندازہ ہوتا ہے جو ہمیں اس کے فن، اس کی سوچ، اس کے نقطۂ نظر اور اس کے فلسفۂ حیات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

اشفاق اپنی شاعری میں نہ تو ماضی کی طرف پلٹ جانا چاہتا ہے اور نہ ہی حال میں کھو جانا چاہتا ہے بلکہ وہ تو مستقبل کا مسافر ہے وہ ماضی اور حال کی محرومیوں، ناکامیوں اور مایوسیوں کے باوجود اپنی آنکھوں میں امید کی چمک اور اپنے دل میں ایک سہانا خواب بسائے ہوئے ہے اسی لئے وہ ہجرتوں کے سفر میں بچوں کو بہت اہمیت دیتا ہے کیونکہ اس کی نظروں میں وہی مہاجروں اور انسانیت کے مستقبل کے معمار ہیں نئی نسل سے رشتہ ہر دور میں ہر پرانی نسل کے لئے ایک چیلنج رہا ہے اور مہاجروں کے لئے تو وہ رشتہ ایک دودھاری تلوار بن جاتا ہے والدین اور بچوں کے تعلقات ہمیشہ سے نازک اور محترم لیکن بہت الجھے ہوئے رہے ہیں۔

انسانی بچے کی یہ بدقسمتی یا خوش قسمتی ہے کہ وہ ایک طویل عرصے تک اپنے والدین کے رحم و کرم پر زندہ رہتا ہے۔ اس کی جسمانی، ذہنی اور جذباتی نشوونما کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے والدین اسے کس قسم کا ماحول فراہم کرتے ہیں مختلف والدین اس ذمہ داری اور طاقت کو مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔

ایک گروہ ان والدین کا ہے جو آمرانہ اندازِ فکر اور طرزِ زندگی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک بزرگوں کی اقدار بہت اہم اور قیمتی ہیں اور نئی نسل کو بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنا چاہئے۔ ایسے والدین کی حتی الامکان یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کے بچے اس طرزِ زندگی کو اپنائیں جن کو وہ خود اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اگر بچے اپنی جداگانہ راہ اختیار کرنا چاہیں تو پہلے تو وہ انہیں سمجھاتے ہیں، پھر حوصلہ شکنی کرتے ہیں اور آخر میں طاقت کا استعمال کرتے ہیں۔ ان والدین کو دیکھ کر ان چینیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو بچوں کے پاؤں

میں پیدا ہوتے ہی لوہے کے جوتے پہنادیا کرتے تھے۔ فرق اتنا ہے کہ یہاں والدین بچوں کے ذہن پر اپنی ذاتی خواہشات او رروایتی نظریات و اعتقادات کے خول چڑھا دیتے ہیں اور ان کے دلوں کے کورے کاغذوں پر اپنی تشنۂ تکمیل تمناؤں کی تحریریں رقم کرتے رہتے ہیں۔ اگر بچے روایات سے انحراف کریں تو ان کے والدین انہیں رفیقوں کی صف سے نکال کر رقیبوں کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔

دوسرا گروہ ان والدین کا ہے جو جمہوری نظریہ حیات پر عمل پیرا ہیں۔ آمرانہ نقطۂ نظر سے جمہوری طرزِ فکر تک پہنچنے کے لئے والدین کو بہت سے مدارج سے گزرنا پڑتا ہے۔

پہلے مرحلے پر وہ اس بات کو ذہنی طور پر قبول کرتے ہیں کہ ہر نئی نسل ارتقا کی نئی منزل کی نشاندہی کرتی ہے۔

دوسرے مرحلے پر وہ اپنے بچوں کی اس کوشش میں ان کی عملی مدد بھی کرتے ہیں۔

اور تیسرے مرحلے پر وہ اپنے بچوں کی کامیابیوں پر خوشی اور فخر کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی شکست میں بھی فتح کا پہلو دیکھتے ہیں ایسے والدین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ وہی بچے جو اوائلِ زندگی میں والدین سے مشورے لیتے ہیں بڑے ہو کر بوڑھے والدین کو مشورے دینے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

ایسے والدین مہاجروں کے اعلیٰ مستقبل کی تعمیر اور انسانیت کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اشفاق ان نفسیاتی رموز سے شعوری و لاشعوری طور پر بخوبی واقف ہے اسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ مہاجروں کی دوسری نسل کے بچوں کی خواہشات اور ضروریات بھی والدین سے مختلف ہوتی ہیں۔

سکوں ملتا ہے بے آنگن گھروں میں میرے بچوں کو

کھلے دالان کی خواہش تو میری نسل ہی تک ہے

اشفاق ایک باپ اور پچھلی نسل کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے بچوں اور نئی نسل کے نمائندوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتا اور بہت سے بزرگوں کی طرح انا کا مسئلہ نہیں بناتا وہ کہتا ہے۔

اگرچہ ذہن ہیں چھوٹے پہ ہیں خیال بڑے
ہمارے بچے ہیں ہم سے ہزاروں سال بڑے

اشفاق کی شاعری کا یہ مثبت رویہ اور اسکی ذات میں امید کے یہ رنگ اسے مہاجر شاعروں میں ایک ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔ وہ ماضی کی طرف دیکھنے کی بجائے مستقبل کی طرف دیکھتا ہے اور سنگین حالات کی آندھیوں میں بھی آس کا دیا جلائے رکھتا ہے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں اس کی شاعری کا مداح ہی نہیں اس کا دوست بھی ہوں۔

مارچ ۱۹۹۳ء

"افتخار نسیم :

نئے رشتوں کے شہر میں"

جب انسان اپنے پیچھے ایک دروازہ بند کرتا ہے تو زندگی اس کے سامنے اور بہت سے دروازے کھول دیتی ہے۔جب کوئی مہاجر ایک شہر کو خیرباد کہتا ہے تو بہت سے نئے شہر اپنا دامن وا کر دیتے ہیں اور

جب کوئی عاشق کسی موڑ پر ایک رشتے کو ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے رخصت کرتا ہے تو اگلے موڑ پر کئی اور رشتے بازو پھیلائے اس کی راہ روک لیتے ہیں۔

لیکن یہ نئے دروازے، نئے شہر اور نئے رشتے جہاں انسان کے ارتقاء کا سبب بنتے ہیں وہیں اسے اندر سے توڑ پھوڑ بھی دیتے ہیں۔

ویسے تو ہر انسان ان واردات کو اپنی ذات میں جذب کرتا رہتا ہے لیکن جب یہی واقعات ایک شاعر کے دل کو چھوتے ہیں تو اس کے جذبات اور احساسات اشعار کا روپ دھارنا شروع کر دیتے ہیں جو اس کی اپنی ذات کے لئے

بھی آئینہ ہوتے ہیں اور دوسرے انسانوں کے لئے بھی۔ افتخار نسیم کی کتاب 'غزال' انہی آئینوں کا مجموعہ ہے۔

افتخار نسیم جس سفر پر نکلا ہے اس میں اس نے اپنے آپ کو کئی دفعہ کھویا بھی ہے اور پایا بھی اور اسے اس ریاضت سے نئے رشتوں کا عرفان نصیب ہوا ہے ان نئے رشتوں میں اس کی اپنی ذات بھی شامل ہے۔ اس کا خاندان بھی، اس کے دوست بھی شامل ہیں اور اس کے محبوب بھی۔ اس نے اپنے ماحول سے ایک نیا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور جب ہم ان نئے رشتوں کی کہانی پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں بیک وقت آشنا بھی نظر آتی ہے اور اجنبی بھی کیونکہ وہ بیک وقت ہماری طرح بھی ہے اور ہم سے جدا بھی اور یہ ہر انسان کی خوش بختی بھی ہے اور المیہ بھی۔ فرق یہ ہے کہ افتخار نسیم نے ہمیں ان حماقتوں اور تضادات کا شدت سے احساس دلایا ہے۔

افتخار نسیم جب اس نئے رشتوں کے شہر کے دروازے میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی ملاقات اپنی ذات سے ہوتی ہے اور جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماضی، اپنے خاندان اور اپنے قبیلے کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ اس مقام پر وہ بہت سے مہاجر شاعروں کی طرح نہ تو آہ و زاری کرتا دکھائی دیتا ہے اور نہ ناسٹلجیا کا شکار نظر آتا ہے بلکہ اسے اپنی بالغ نظری کا احساس ہوتا ہے اور اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے ماضی کے ساتھ زیادہ دیر تک جڑا رہتا تو شاید وہ غیر فطری بات ہوتی، ہجرت کے بارے میں میں نے بہت کم اتنے خوبصورت شعر دیکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے ؎

میں پک گیا تھا مجھ کو کبھی ٹوٹنا ہی تھا
اب اور کتنی دیر میں رہتا شجر کے ساتھ

افتخار نسیم کو احساس تھا کہ وہ جس ماحول میں پلا بڑھا تھا وہاں آزادانہ

سوچ رکھنے والے اور اپنی جداگانہ راہ بنانے والے مجرم ٹھہرائے جاتے ہیں اور جرم ثابت کیے بغیر سزائیں صادر کی جاتی ہیں جہاں روایت کے پرستار منصف اور حاکم اور آزادی کا پرچم لہرانے والے معتوب بنائے جاتے ہیں افتخار نسیم کا کلام پڑھتے ہوئے مجھے کئی دفعہ کافکا کے ناول Trial کا ہیرو یاد آگیا جو ساری عمر یہ نہ جان سکا کہ اس کا جرم کیا تھا اور اس کا ماحول یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ معصوم تھا۔ افتخار نسیم ایک آزادانہ اور جداگانہ طرزِ زندگی گزارنے والے شخص کا المیہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

سزا بھی کاٹ چکا ہوں میں جس خطا کی نسیم
کسے پکاروں کہوں اس سے بے قصور ہوں میں

ایسے ماحول میں جہاں روایت سے انحراف بغاوت قرار دیا جائے اور خودمختار زندگی مطعون و ملعون ٹھہرے تو ہر ذی شعور انسان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ سب کے ساتھ مل کر چلے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ بہت سے کم ہمت اپنے خواب اپنی آرزوئیں اور اپنی تمنائیں تیاگ کر سب کے ساتھ مل کر چلنا شروع کر دیتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کا دل پکارتا رہتا ہے۔

خود کو ہجومِ دہر میں کھونا پڑا مجھے
جیسے تھے لوگ ویسا ہی ہونا پڑا مجھے

وہ جانتے ہیں کہ جن لوگوں نے اکثریت کی سوچ اور طرزِ زندگی سے ٹکر لی انہیں اکثر اوقات شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا اور ان میں سے ہر ایک پکار اٹھا۔

ایسی شکست تھی کہ کئی انگلیوں کے ساتھ
کانٹوں کا ایک ہار پرونا پڑا مجھے

اسی لئے افتخار نسیم جیسا حساس شاعر یہ جانتا ہے کہ اپنی منفرد دنیا تخلیق

کرنا قربانیوں کو دعوت دینا ہے۔

جب افتخار نسیم پرانے شہر کو چھوڑ کر نئے شہر میں داخل ہوتا ہے تو اس کی نئے دوستوں اور محبوبوں سے ملاقات ہوتی ہے لیکن اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نئے شہر کی روایات پرانے شہر کی اقدار سے بہت مختلف ہیں اسے ہر موڑ پر حیرانگی آئینہ لئے کھڑی نظر آتی ہے۔

افتخار نسیم ایک صاف گو انسان اور بے تکلف شخصیت کا مالک ہے وہ جذبات کے آزادانہ اظہار کا قائل ہے وہ جانتا ہے کہ جذبات کے اظہار کے بغیر، چاہے وہ مثبت ہوں یا منفی، صحتمندانہ رشتہ قائم کرنا بہت دشوار ہے اس لئے جب اسے نئے شہر کے دوست اور محبوب اپنے جذبات چھپائے پھرتے نظر آتے ہیں تو وہ قدرے مایوس ہوتا ہے اور ان کی طرف ہمدردی کا ہاتھ بڑھاتا ہے وہ کہتا ہے ۔

اس قدر بھی تو نہ جذبات پہ قابو رکھو
تھک گئے ہو تو مرے کاندھے پہ بازو رکھو
مجھ سے نفرت ہے اگر اس کو تو اظہار کرے
کب میں کہتا ہوں مجھے پیار ہی کرتا جائے

افتخار نسیم کی غزلوں میں نئے شہر کے انسانی رشتوں کی ایک دنیا آباد ہے ایسے رشتے جو اپنا جداگانہ مزاج رکھتے ہیں ۔

ان کے آغاز بھی مختلف ہیں انجام بھی
ان کی خوشیاں بھی مختلف ہیں غم بھی
ان کے انداز بھی مختلف ہیں اطوار بھی

افتخار نسیم اس حقیقت سے باخبر ہے کہ دلوں کے رشتے خون کے رشتوں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ وہ خونی رشتوں سے اپنی Disillusion-

ment ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

مرا بھائی سے رشتہ خون کا ہے
تعلق ہے مگر کچھ بھی نہیں ہے

لیکن یہ بھی جانتا ہے کہ دلوں کے رشتوں کے بیج انسانوں کو خود بونے پڑتے ہیں وہ وراثت میں نہیں ملتے اور پھر خود ان کی نشوونما بھی کرنی پڑتی ہے اور اگر ان پودوں کی آبیاری نہ ہو تو وہ مرجھا جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔

افتخار نسیم یہ بھی جانتا ہے کہ زندگی میں دوستوں کا محبوب بن جانا آسان ہے لیکن محبوب کا قطعِ تعلق کے بعد دوست بنا مشکل۔ اکثر اوقات جب رشتوں سے رومانس ختم ہو جاتا ہے تو لوگ دوستی کے ناطے کو بھی توڑ دیتے ہیں یا انہیں احساس ہوتا ہے کہ ان رشتوں میں جنسی کشش کے سوا کچھ تھا ہی نہیں اور محبوب جنسی رشتے میں منسلک تھے، دوستی کے رشتے میں نہیں۔ افتخار نسیم اپنے تعلقات میں عام انسانوں سے چند قدم آگے نکل جاتا ہے اور محبوب جب محبوب نہیں رہتا تب بھی اس سے دوستی کا رشتہ نبھانا چاہتا ہے کیونکہ دوستی کا رشتہ بھی انسانی رشتوں کا سنگ بنیاد ہے۔ یہ رویہ افتخار نسیم کی شخصیت کی عظمت کی نشاندہی کرتا ہے اور اسے ہوس پرستوں کی صف سے الگ کھڑا کر دیتا ہے وہ کہتا ہے۔

اب وہ محبوب نہیں اپنا مگر دوست تو ہے
اس سے یہ ایک تعلق ہی بہر سو رکھو

افتخار نسیم ہوس اور عشق کے فرق سے بخوبی واقف ہے وہ جانتا ہے کہ دونوں انسانی ضروریات میں سے ہیں لیکن وہ ان کے مقام سے غافل نہیں وہ جانتا ہے کہ جب کوئی انسان عشق میں ناکام ہوتا ہے تو اپنے غموں اور دکھوں کی شدت کو کم کرنے کیلئے ہوس پرستی کا شکار ہو سکتا ہے لیکن خوبصورت چہرے اور

خوبصورت جسم اس درد کی شدت اور اس گھاؤ کو کم کرنے میں ناکام رہتے ہیں جو ٹوٹ کر چاہنے والے محبوب کے رخصت ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ جب محبتیں ناکام ہو جائیں تو طبیعت کا غمزدہ اور بوجھل ہونا ایک فطری امر ہے اور انسانی خلوص کی دلیل۔ وہ کہتا ہے ؂

آنکھ تو خود کو نئے چہروں میں کھو کر رہ گئی
دل مگر اس شخص کے جانے سے بوجھل ہے ابھی

اگر ہم افتخار نسیم کی شاعری میں انسانی رشتوں کی بازیافت کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے اس ماحول میں جہاں صرف روح اور روحانی محبت کے تذکرے ملتے ہیں افتخار نسیم نے جسم کی حقیقت اور اہمیت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم انسانی شعور اور معاشرتی ارتقاء کے اس موڑ تک آگئے ہیں جہاں ہم خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقتوں سے بغلگیر ہو سکتے ہیں اب ہم اس دور سے بہت آگے نکل آئے ہیں جہاں شاعر کا محبوب خیالی ہوتا تھا شاعر کا محبوب کبھی اس کا شریکِ حیات نہ بن پاتا تھا اور اپنے شریکِ حیات سے وہ محبت کرتے گھبراتا تھا۔ افتخار نسیم ان رشتوں کا متمنی ہے جن میں جسم، ذہن اور روح سبھی کو اپنا اپنا مقام مل سکے۔ وہ جسم کے جذبات کی ان الفاظ میں ترجمانی کرتا ہے ؂

تشریحِ روح پر تو بہت بحث ہو سکی
کب تو سنے گا میرے بدن کی پکار بھی

افتخار نسیم اس شہر کا باسی ہے جہاں انسانی جسم کو موضوعِ گفتگو بنانا بھی اتنا ہی احسن سمجھا جاتا ہے جتنا انسانی روح کو۔

افتخار نسیم جانتا ہے کہ ایک ایسا محبوب تلاش کرنا جس سے انسان جسمانی، ذہنی اور روحانی قربت کی امید رکھ سکے اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے اس کے لئے کئی ایسے رشتوں سے گزرنا پڑتا ہے جو آدھے راستے سے آگے نہیں جاسکتے۔ لیکن وہ رشتے اپنی اذیتوں اور عذابوں کے باوجود آخری منزل کی نشاندہی ضرور کرتے ہیں لیکن ان سے انسان پر جو بیتتی ہے وہ اس کا دل ہی جانتا ہے۔ افتخار نسیم ان راستوں اور رشتوں سے خود گزر کر آیا ہے اس لئے اس کی غزلوں میں آپ بیتی اور جگ بیتی کے رنگ گھل مل گئے ہیں ویسے بھی انسانی رشتوں میں جگ بیتی کو آپ بیتی سے جدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اور وہ لوگ جو انہی راستوں سے گزرے ہیں ان اذیتوں اور آزمائشوں سے Identify کرسکتے ہیں البتہ وہ لوگ جو ساری عمر طہارت اور پاکیزگی کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں اور ایسے لوگوں کو شریک حیات بنا لیتے ہیں جن سے ان کا کوئی قلبی تعلق نہیں ہوتا وہ جب افتخار نسیم کے یہ اشعار۔

لہو کی پیاس بجھائی ہے اس کی یادوں نے
بدن کی آگ سے اپنے ہاتھ سینکے ہیں
ہرا ہوا ہے کسی چاپ سے اجاڑ بدن
بسا رہے ہیں سبھی لوگ بستیاں مجھ پر

سنتے ہیں تو ان کے لئے ان اذیتوں اور حقیقتوں کو سمجھنا اور سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

افتخار نسیم جانتا ہے کہ بعض دفعہ وہی رشتے جو جان سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں وہی عذابِ جان بھی بن جاتے ہیں اور وہی لوگ جو ہمدردی کے بوسے لے کر آتے ہیں جسموں پر چرکے بھی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور بعد میں انسان کو اپنے جسم کی ویرانیاں Haunt کرنے لگتی ہیں اور انسانی بدن میں یادیں

آسیب بن جاتی ہیں بالآخر انسان اس مقام پر آجاتا ہے جہاں وہ اپنی ذات اور اپنے ماضی سے فرار پانا بھی چاہے تو نہیں پا سکتا۔ وہ کہتا ہے ؎

بن گیا ہے جسم گذرے قافلوں کی گرد سا
کتنا ویراں کر گیا مجھ کو مرا ہمدرد سا

اب تو ہلتے ہیں ہوا سے بھی درو دیوارِ جسم
باسیو مجھ سے نکل جاؤ شکستہ گھر ہوں میں

جب انسان رشتوں کے اس شہر میں اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جب اسے اپنے جسم سے نفرت ہونے لگتی ہے اور وہ تمام لوگ یاد آنے لگتے ہیں جنہوں نے جسم کی حرمت کو نہ پہچانا، اسے صرف گوشت پوست جانا اور شہوت کی نگاہوں سے دیکھا اور اسے ذہن اور روح کی قربت کا وسیلہ نہ جانا تو انسان کو چاروں طرف خزاں نظر آنے لگتی ہے اور اپنا جسم بھی ایک بوجھ محسوس ہوتا ہے ؎

کچھ تو ہواؤں نے بھی گرائے تھے برگِ زرد
کچھ میرا جسم شہر کی راہوں کا بوجھ تھا

اور جب طویل ریاضت اور بعض دفعہ ذلت کے بعد انسان کو وہ قربتوں کا خزینہ حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے وہ مدتوں سرگرم سفر ہوتا ہے تو پھر بھی یہ احساس رہتا ہے کہ

کتنا ترسا کے دیا ایک نوالا اس نے

افتخار نسیم شہر محبت کے بہت سے رازوں سے واقف ہے وہ اس شہر کی مجبوریوں سے بھی واقف ہے اور مسرتوں سے بھی وہ آزمائشوں کے اس موڑ سے بھی گزرا ہے جہاں وہ پکار اٹھا ؎

اپنی مجبوری بتاتا رہا رو کر مجھ کو
وہ ملا بھی تو کسی اور کا ہو کر مجھ کو

اور ان راستوں سے بھی ہو کر آیا ہے جہاں وہ لکھتا ہے۔

ویسے مرا شریکِ سفر تھا وہ عمر بھر
لوگوں کے سامنے جو ہمیشہ جدا ملا

افتخار نسیم نے جہاں شہر محبت کی خاک چھانی ہے اور اس کے ہر تجربے کو اپنی ذات میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے وہاں اس نے آزمائشوں، اذیتوں اور تلخیوں کے باوجود اپنے چہرے کی مسکراہٹ، اپنے لہجے کی بشاشت اور اپنی شخصیت کی بے تکلفی اور خلوص کو نہیں گنوایا۔ جب افتخار نسیم یہ لکھتا ہے۔

ہزار تلخ ہوں یادیں مگر وہ جب بھی ملے
زباں پہ اچھے دنوں کا ہی ذائقہ رکھنا

تو ہمیں اس کی عظمت، خودداری اور اعلیٰ ظرفی کا اندازہ ہوتا ہے۔

افتخار نسیم نے ہجرت کے بعد جس شہر میں قدم رکھا اور جن رشتوں سے اس کا واسطہ پڑا۔ اس نے اس کی آپ بیتی اور جگ بیتی اپنی غزلوں کے قالب میں ڈھال دی ہے اس طرح اس کی غزلوں کا ہر شعر وہ آئینہ بن گیا ہے جس میں ہمیں اس ماحول کی ایک حقیقت پسندانہ تصویر نظر آتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تصویر بعض لوگوں کو زیادہ پسند نہ آئے لیکن کوئی بھی حق گو شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ افتخار نسیم نے فن اور زندگی کے تقاضوں سے چشم پوشی کی ہے۔

میں افتخار نسیم کو اس کی غزلوں پر مبارکباد پیش کرتا ہوں میں اس کی نظموں کے مجموعے کا بے چینی سے منتظر رہوں گا مجھے امید ہے کہ اردو ادب کے اصحابِ نظر اسے وہ دادو تحسین پیش کریں گے جس کا وہ بجا طور پر مستحق

ہے۔

افتخار نسیم شمالی امریکہ کی ادبی برادری کا ایک اہم نام ہے اور مجھے اس کی دوستی پر فخر ہے۔

مئی ۱۹۹۱ء

”ظفر زیدی :
اپنے گھر میں اجنبی“

اردو شاعری کے کتنے مجموعے پڑھے لیکن ذہن پر کوئی مستقل تاثر چھوڑے بغیر محو ہوگئے۔ الفاظ کا کھیل، ردیف قافیوں کے کرتب، تصورات کے گلستانوں کی سیر، آسمانوں کا ذکر، خیالی معاشقوں کے قصے اور انسانی زندگی اور مسائل سے کترا کر گزر جانے کی روایت۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو شاعری میں ان کے علاوہ اور بھی کچھ ہے یا نہیں؟

''زخم زخم اجالا'' پڑھا اور چونک پڑا۔ کیا یہ ایک جوان شاعر کی باتیں ہیں۔ دوبارہ پڑھا سہ بارہ پڑھا اور میرے سراپا کو سنجیدگی کی فضا نے گھیر لیا۔ کتاب بند کر کے آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ ایک لفظ جو بار بار سرگوشیاں کرتا رہا وہ ''گھر'' تھا اور اس کے ساتھ اور بہت سے الفاظ ''انسان'' ''خاندان'' ''بیسویں صدی کے انسان'' ''مہاجروں کے خاندان'' ذہن کے تالاب میں کنکر بن بن کر گرنے لگے۔ چاروں طرف لہریں پھیلنے لگیں۔ ایسے لگا ظفر نے بہت سی دکھتی رگوں کو بیک وقت چھیڑ دیا ہو جس سے چاروں طرف عجیب و غریب

لہریں ابھرنے اور ڈوبنے لگیں، آنسوؤں کی لہریں، خوشیوں اور غموں کی لہریں
راتوں اور بے گھری کی کیفیات کی لہریں، ادراک کی لہریں، امیدوں کی لہریں
اور میں ایک طویل خاموشی کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ جب ان گہرائیوں سے
ابھرا تو ظفر سے ہمکلام ہوا۔ ظفر نے جلد ہی یہ واضح کردیا کہ اس کے نزدیک
اردو شاعری نے بہت سا وقت تصوراتی رومانوں اور عشق و محبت کے مفروضہ
قصوں کی نظر کردیا ہے۔ ظفر اردو شاعری کی اس روایت کے بارے میں کہتا
ہے ؎

جہاں میں اور بھی قصے ہیں نظم کرنے کو
کہاں تک لب و رخسار کو چھیڑا جائے

ظفر نے زندگی کے بارے میں نہایت ہی سنجیدہ رویہ اپنایا ہے میں اس
موقعہ پر اس کی شاعری کے صرف ایک پہلو پر توجہ مرکوز کروں گا اور وہ اس کا
''گھر'' کا تصور ہے۔ ایسا لگتا ہے گھر کا خیال، نظریہ اور فلسفہ ظفر کے ذہن میں
ایک خاص مقام رکھتا تھا اور اس نے طویل مدت تک اس کے مختلف پہلوؤں پر
غوروخوض کیا تھا۔ کہیں وہ اس کے ظاہر، کہیں اس کے باطن، کہیں اس کی
ساخت، کہیں اس کی معنوی حیثیت اور کہیں اس کی وساطت سے موجودہ دور
کے المیوں پر اظہار خیال کرتا ہے۔ اس طرح گھر اس کی سوچوں کا ایک محور بن
کر ابھرتا ہے۔

گھر کا تصور انسانی نفسیات کو سمجھنے میں ہمیشہ ایک اہم کردار ادا کرتا رہا
ہے۔ بہت سے ماہرین نفسیات آج بھی مریضوں کو گھر کا خاکہ بنانے کو کہتے ہیں
تاکہ اس سے ان کے لاشعور میں جھانک سکیں اور ان کی شخصیت، خاندان اور
ماحول کے بارے میں قیاس آرائیاں کرسکیں۔

ظفر اپنی شاعری میں گھر کے مختلف خاکے بناتا ہے جس میں ہم نہ

صرف ظفر کی ذات بلکہ اس دور، اس عہد اور مہاجروں کے مختلف مسائل اور کیفیات کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

ظفر بیسویں صدی کا انسان تھا اور اکثر انسانوں کی طرح تیزی سے بدلتی ادوار کا مقابلہ کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہی گھر جو صدیوں سے سکون، آشتی، خلوص و محبت اور آرام و آسائش کا مرکز تھا آہستہ آہستہ نئے تضادات کا منبع بنتا جا رہا ہے۔ آج کا انسان ایک طرف تو اپنے گھر میں بے چینی کا شکار ہے اور اس کی فضا اسے کاٹنے کو دوڑتی ہے ؎

کاٹ رہا ہے اپنا گھر
آؤ بھاگ چلیں باہر

☆

؎ خود اپنے گھر میں بھی گھر کا مزا نہیں ملتا

اور دوسری طرف وہ گھر سے نکل کر باہر جانے سے ہی ڈرتا ہے کیونکہ اسے اپنی عزت، دولت، شرافت اور انا کو محفوظ رکھنے کا یقین نہیں ہے۔ اور یہ خوف اسے گھر میں مقید رہنے پر مجبور کر رہا ہے ؎

شاید میرے دل سے اب تک ڈر نہیں نکلا
بہت دنوں سے میں گھر کے باہر نہیں نکلا

جب وہ گھر میں رہتا ہے تو عجب وسوسے اسے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ نہ تو دیواریں آشنا لگتی ہیں، نہ دروازے، چھتوں سے وحشت ٹپکتی ہے، کمروں سے خوف آتا ہے اور وہ اپنے گھر میں ہی اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔

ہیبت ٹپک رہی ہے چھتوں کی منڈیر سے
دہشت مرے مکان کے کمروں میں ہے نہاں

☆

ڈرتا تھا میں خود ہی جس کے اندر جانے سے
میرے گھر کے اندر، اک ایسا بھی کمرہ تھا

یہ تجربہ بڑھتا بڑھتا ایک داخلی کرب کا تجربہ بن جاتا ہے جہاں سکون، قربتیں، رشتے اور تعلقات سراب دکھائی دینے لگتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے۔

قربتوں کے شہر میں
میں ہی لامکان تھا

ان کیفیات کا حامل انسان ایک دن خوف کی حالت میں گھر سے نکلتا ہے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ وہ اپنی زندگی کا راستہ کھو بیٹھتا ہے اپنے گھر واپس نہیں پہنچ سکتا۔ گھر کا رستہ آسان ہے لیکن گم ہونے کی خواہش اسے گمراہ کردیتی ہے اور وہ کچھ شعوری کچھ لاشعوری طور پر کھو جاتا ہے۔

شہر سے میرے گھر کا رستہ سیدھا سادہ تھا
کھو جائیں گے راہ میں لیکن کب اندازہ تھا

اس کے بعد وہ طویل عرصے تک بے گھر رہتا ہے۔ سڑکوں، گلیوں، بازاروں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ سڑکوں پر کھاتا ہے، پارکوں میں سوتا ہے۔ کوئی عزیز دوست آشنا مل جائے تو تخلیئے کے لئے ترس جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے لاکھوں انسانوں کی بے گھری کا تجربہ ایک شعر اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

میں آج سوچ رہا ہوں سڑک پہ بیٹھا ہوا
کہ میرا گھر بھی کہیں ہو تو میں بلاؤں اسے

اپنی ذات' گھر اور ماحول سے دل برداشتہ ہوکر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہیں اور چلا جائے، ہجرت کر جائے اس امید پر کہ شاید نئے شہر، نئے گھر اور نئی

فضا میں کچھ سکون مل سکے۔

یہ ہجرت کا عمل، گھر بدلنے کا عمل' جتنا پچھلے پچاس سال میں ظہور پذیر ہوا، تاریخ میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ یہ عمل چاہے بظاہر چند گھنٹوں یا دنوں کا ہو لیکن درپردہ ایک نہایت ہی جانگسل تجربہ ہے جس سے ماضی، حال اور مستقبل کے بہت سے ناطے جڑے ہوئے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں بہت سی امیدیں آرزوئیں اور خواہشیں سانس روکے حالات کے کروٹ بدلنے کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔

بہت سی ماضی کی یادیں بہت سے منصوبے
ہزار دقتیں پیش آئیں گھر بدلنے میں

مہاجرین میں سے بعض تو خوش قسمت تھے انہیں بہتر حالات، بہتر ملازمتوں اور خوبصورت آرام دہ گھروں نے خوش آمدید کہا لیکن اکثر اپنی مشکلات اپنے ساتھ لے کر آئے ان کی داخلی دشواریاں اور جذباتی و ذہنی تضادات ان کے حالات بہتر بنانے میں حائل رہے چنانچہ ان کا نیا گھر پرانے گھر سے بہتر نہ نکلا۔

جہاں شکستہ چھتوں کے سوائے کچھ بھی نہ تھا
ہم اتفاق سے ایسے مکان میں اترے

ظفر کی شاعری کا ایک خوبصورت پہلو اس کا اپنے حالات اور اعمال کی ذمہ داری لینے کا احساس ہے وہ ناسازگار حالات کا الزام خدا اور ماحول پر دھر کر چپ نہیں بیٹھتا۔ وہ جانتا ہے کہ انسان اپنی ذات اور ماحول کی تشکیل میں ذاتی اور اجتماعی طور پر شریک ہے۔ اگر وہ کامیابیوں میں مبارکباد کا مستحق ہے تو اس کی ناکامیوں میں ذمہ داری بھی قبول کرنے کو تیار ہے اس لئے وہ یہ بات واضح کردیتا ہے کہ اگر سفر میں اور اپنے مقصد کے ماحول کی تلاش میں تکالیف،

مصیبتیں اور صعوبتیں جھیلنی پڑی ہیں تو یہ ہمارا اپنا فیصلہ تھا ہم حالات کی سختی سے مضمحل ضرور ہیں لیکن نادم نہیں ۔

ہم جب اپنے گھر سے باہر نکلے تھے
اچھا برا سب سوچ سمجھ کے نکلے تھے

ظفر زیدی، ہندوستان میں پلا بڑھا اور پھر امریکہ کی فضاؤں میں جوانی کے چند سال زندہ رہا اس نے خاندان کی بدلتی ہوئی روایات کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اور اتنے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ اس نے ایک طرف وہ گھرانے دیکھے جہاں Extended Families رہتی تھیں ایک ہی گھر میں بچے، والدین، ان کے والدین بمع رشتہ داروں اور ان کے خاندانوں کے ساتھ بستے ہیں۔ اور پھر امریکہ میں Nuclear Families دیکھیں جہاں جوان جوڑے رشتہ داروں سے علیحدہ گھر بساتے ہیں اور رشتہ داروں سے کبھی کبھار ملتے ہیں ان تبدیلیوں کا روزمرہ زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اس کے ایک پہلو پر ظفر خیال آرائی کرتا ہے ۔

کھل کے دونوں لڑ رہے تھے اک ذرا سی بات پر
روکنے کے واسطے گھر میں کوئی بوڑھا نہ تھا

بات یہاں بھی نہ رکی اس نے امریکہ میں سینکڑوں ایسے گھر دیکھے جہاں صرف ایک شخص رہتا ہے۔ ایسے لوگ جو خاندانوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ برسوں ایک ہی شہر میں رہ کر بھی اپنے والدین، بہن بھائیوں سے نہ ملے۔ نہ ہی ملنے کی امید رکھی۔ بھرے شہر میں تنہا۔ اپنے گھر میں اجنبی۔ نہ کوئی دوست نہ عزیز، نہ رشتہ دار نہ رازداں۔ ان میں سے ہر ایک کا حزن و ملال پکارتا ہے ۔

کتنی حسرت سے تکتے ہیں درو دیوار مجھے
کوئی اس شہر سے لادے مرا گھربار مجھے

بیسویں صدی کی سماجی، معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں نے گھروں کی ساخت اور معنی بدل دیے ہیں۔ نفسا نفسی کا عالم ہے بعض لوگ اپنے گھر کی فکر میں اس قدر مستغرق ہیں کہ ہمسایوں کو اپنی ترقی کی راہ کی دیوار سمجھتے ہیں۔

لوگوں نے اپنی راہ بنانے کی فکر میں
میرے نئے مکان کی دیوار گرادی

اور بعض لوگ رتبے مرتبے اور اپنے عالی مقام ہونے کی فکر میں ہیں۔ ان کے لئے تازہ ہوا، سورج کی روشنی اور چاندنی راتوں سے لطف اندوز ہونے سے زیادہ ایرکنڈیشن اور ہیٹنگ سسٹم زیادہ عزیز ہیں وہ ان تبدیلیوں کی قیمت مالی طور پر ہی نہیں جمالیاتی طور پر بھی ادا کرتے ہیں اور فطری مناظر سے دوری اور محرومی برداشت کرتے ہیں۔

یہ اونچی اونچی عمارات آنگنوں کے بغیر
انہیں تو چاند کبھی بھی نظر نہ آئے گا

ظفر اس بات سے آگاہ ہے کہ انسانوں نے انسانیت سے احتراز اور انسانی روایات سے کترانا شروع کردیا ہے وہ جانتا ہے کہ اگر ہم اس مادی دنیا میں خلوص و محبت کی شمعیں نہ روشن رکھ سکے تو ان کے نتائج بہت حوصلہ شکن ہوسکتے ہیں وہ ان حالات پر اپنے شاعرانہ انداز میں گہرا طنز کرتا ہے۔

بہت ہی جلد وہ دن بھی آنے والا ہے
کہ ہم کو 'زو' عجائب گھر میں رکھا جائے گا
جانور آئیں گے لے کے ٹکٹ، دیکھیں گے ہم کو
اور ہم......

اونچے سے پیپل کے شجر پر بیٹھ کر
اپنا سر اپنے ہی ہاتھوں سے کھجائیں گے۔

ظفر نے نہ صرف حالات کا مشاہدہ کیا، بدلتی ہوئی اقدار کا تجزیہ کیا، اپنے جذبات، خیالات کو خوبصورتی سے اشعار کے قالب میں ڈھالا، آنے والے حالات سے اپنی بصیرت کے مطابق آگہی حاصل کی بلکہ ایک مخلص دوست کی طرح انسانیت کے کارواں کے تمسخروں کو مشورہ بھی دیا۔ وہ زندگی اور انسانیت کے مسائل کا حل ان الفاظ میں سوچتا ہے۔

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایہ جائے

ظفر کا یہ خیال اور مشورہ بیسویں صدی کے انسانوں کے لئے آج بھی قابل غور ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

ظفر کی شاعری کے اس ایک پہلو پر توجہ مرکوز کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ حساس دل کا مالک تھا اور اس کی شاعری سنجیدہ مطالعہ کی مستحق ہے۔

”فاروق حسن :
ایک داخلی مسافر“

”نئی پرانی نظمیں“ فاروق حسن کی ۵۷ نظموں کا مختصر لیکن ۱۷ برس کی طویل مدت پر پھیلا ہوا مجموعہ ہے۔

شروع سے آخر تک پڑھنے پر مجھے ذاتی طور پر یوں احساس ہوا جیسے وہ ان کے جانگسل سفر کی روداد ہو۔ یہ سفر کیسا ہے؟ میں سوچتا رہا۔

یہ نہ تو خیالی سفر ہے جس میں وہ فضاؤں کی، خلاؤں کی، سورج، چاند اور ستاروں کی ان ہونی کہانیوں کا تذکرہ کرتے ہوں۔

یہ نہ ہی جغرافیائی سفر ہے جس میں وہ ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ اور ان کی سیر گاہوں کا ذکر کرتے ہوں۔

اور نہ ہی وہ رشتوں کا سفر ہے جس میں وہ زندگی کے ہر موڑ پر نئے چہرے، ہر قدم پر نئی محبوبہ اور ہر منزل پر نئی معشوقہ کا گیت الاپتے ہوں۔

یہ سفر کچھ اور ہی نوعیت کا ہے۔ یہ سفر ان کا داخلی سفر ہے۔ اپنی ذات سے اپنی ذات تک۔ انسان کا اپنی روح کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کا

سفر۔ اپنے قلب کے بند کواڑوں کے پیچھے جھانکنے کی جستجو کا سفر۔ وہ سفر جس کے اختتام پر انسان اپنی ذات سے ہی نہیں، انسانیت کے لاشعور سے، کائنات کی اتھاہ گہرائیوں اور خدا، کی ذات سے واقف ہو جاتا ہے۔ اور اگر انسان اس منزل تک نہ بھی پہنچے تب بھی اس راستے سے گزرتے ہوئے عرفان کے بہت سے گوہر نایاب اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔

اس سفر کا اعلان وہ کتاب کی ۱۹۶۳ء کی لکھی ہوئی دوسری نظم ''رشتہ درد کا'' کی معرفت کرتے ہیں۔

''داستانوں کے مسافر کی طرح
ہر انوکھی چیز کی تسخیر کی خواہش لئے مصروفِ کار
اپنی کوشش کے زیاں کا معترف
کھو چکا ہوں جو اسے پانے کی پیہم جستجو
اور جو دل میں ہے
اس کو دیکھتا رہتا ہوں وہ کب
راستوں کی دھول میں گم ہو چکے
حاصل سے لاحاصل بنے
ہر نئے دن میں، اسی صورت، تمہارے واسطے سے
جوڑتا ہوں اپنے ہر حاصل سے لاحاصل سے رشتہ درد کا
سوچتا ہوں کب مکمل ہو سفر
کب درد کی تکمیل ہو۔''

اس ابتدائی اعلان سے وہ قاری کو ذہنی طور پر طویل صبر آزما سفر کے لیے تیار کرتے ہیں۔ وہ راستہ کی دشواریوں کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں ۔

ہر فاصلہ عذاب ہے اور کاٹنا کٹھن

جوں جوں وہ آگے بڑھتے ہیں قاری کی توجہ سفر کے مختلف مرحلوں سے ہٹنے نہیں دیتے کبھی وہ اس جدوجہد کو ''سوچ کا سفر'' کہہ کر پکارتے ہیں اور کبھی اسے ''مسافرت میں سکون کس کو'' کا نام دے کر اپنی ناتوانی کا اقرار کرتے ہیں اس سفر میں وہ لمحے بھی آتے ہیں جب وہ مایوسیوں کی کھائیوں میں اتر جاتے ہیں اور اپنی ذات کو جسم میں مقید پاتے ہیں جہاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ یہ احساس یا تو ۱۹۶۵ء کی نظم ''نوحہ'' بن کر ان کے لبوں پر آتا ہے۔

اب مجھے جسم نے محصور کیا
باندھ کر شہر میں روندا مجھے تاراج کیا
خاک میں سر کو جھکاتا ہوں کہ آرام ملے
عمر کی قید ہے جینا مجھ کو
جاگنا روز کی رسوائی ہے

شہر والو میری فریاد سنو

اور یا ر ۱۹۶۶ء کی نظم ''محبس'' بن کر ان کے نوکِ قلم سے ابھرتا ہے

کوئی رستہ نہ ملا
بند کمروں سے نکلنے کے لئے کوئی بھی رستہ نہ ملا
لاکھ چاہا کہ خداوند کی پھیلی ہوئی راہوں پہ پھروں
ٹوٹ کر ذات کے محور سے گروں
اور اپنے سے علیحدہ کوئی پیکر دیکھوں
کوئی رستہ نہ ملا......

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ۱۹۶۶ء تک شاعر کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ اس سفر میں انسان کو اپنی صلیب اپنے ہی کاندھوں پر اٹھا کر چلنا

پڑتا ہے اس فکر کا اظہار یوں ہوتا ہے ؎

اکیلے پن کا یہ بوجھ کیسے اٹھے گا اپنے اکیلے پن سے

اس سفر میں پانچ سالوں کی مشقتوں کے بعد فاروق حسن کو اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ انسان کو یہ دشوار گزار سفر خود ہی طے کرنا ہے لیکن بعض دفعہ کچھ ہم سفر کبھی مشورہ دے کر، کبھی آئینہ دکھا کر اور کبھی اپنا دکھ درد بانٹ کر ان مرحلوں کو آسان کر سکتے ہیں

ان کیفیات اور خیالات کے شعور کو وہ اپنی نظم ''پانچ چہرے'' میں خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ اس نظم کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں عورت کا ذکر نہ تو خیالی محبوبہ اور نہ ہی ان دیکھی معشوقہ کی صورت میں آیا ہے جن کے ذکر سے اردو شاعری بھری پڑی ہے جو بد قسمتی سے عورت کو سمجھنے یا قریب آنے میں زیادہ ممد ثابت نہیں ہوتا۔ فاروق حسن کی اس نظم میں وہ عورت ان کی شریکِ سفر اور ان کی شریکِ حیات ہے وہ شوہر اور بیوی کے ناطے سے بات کرتے ہیں

اور روز شوہر بھی ہوتا ہوں
ہر رات اس سے
جسے زندگی کی رات سے موسوم کرتا ہوں
کہتا ہوں۔ ناراض کیوں، کس لئے ہو
اگر مجھ سے بھی حال دل کا نہیں کہہ سکو گی
تو کس سے کہو گی؟

یہ وہ مقام تھا جہاں مجھے مصطفیٰ زیدی کے شریکِ سفر کی یاد آگئی اس نے کہا تھا ؎

فنکار خود نہ تھی مرے فن کی شریک تھی

وہ روح کے سفر میں بدن کی شریک تھی

فاروق حسن کے اس سفر کے بہت سے سال زیر زمین گزرے ہیں اس غوطہ زن کی طرح جو ایک دفعہ پانی میں ڈبکی لگاتا ہے تو طویل عرصے تک سطحِ آب پر نہیں آتا کیونکہ وہ اسی وقت باہر آنا چاہتا ہے جب وہ گوہر مقصود لے کر یا کم از کم اس کا اتہ پتہ لے کر آئے ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۸ء تک کا دور اسی طرح کا دور معلوم ہوتا ہے۔

جب شاعر ۱۹۷۸ء میں قاری سے دوبارہ ہم کلام ہوتا ہے تو اس کے ریاض کے نئے پہلو واضح ہوتے نظر آتے ہیں۔ اولاً یہ کہ اس کی زبان پر پہلی دفعہ ''منزل'' کا لفظ آتا ہے، یہ اہم ہے کیونکہ اس طویل پیچیدہ راہ میں پہلے کبھی یہ لفظ مسافر کی زبان پر نہ آیا تھا ؎

وہ نشاں جن سے پتہ چلتا ہے منزل اپنی\
کتنی نزدیک یا دور ہے\
ہوتے ہیں نظر سے غائب......

کتاب کے آخر میں اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر، مسافر اور فاروق حسن، جو ایک ہی ذات کے مختلف پہلو ہیں۔ ابھی بھی اپنی ذات کے سفر میں مصروف اور سرگرداں ہیں۔ ابھی بھی انجانی منزلوں کی تلاش اور مستقبل کے عرفاں کی جستجو کم نہیں ہوئی۔

اگرچہ راہ میں بہت سی تلخیاں تھیں، دشواریاں تھیں، مصائب و آلام تھے غم و اندوہ کے پہاڑ تھے لیکن اس کے باوجود ہمتیں جوان ہیں 'خواب زندہ' ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۹ء تک کی ۱۷ برس کی مسافت طے کرنے والا مسافر مایوسیوں کی گہرائیوں میں گر کر مر نہیں گیا۔

اپنے راستوں کی دشواریوں کی پہچان اور خوابوں کی جلا کو بیک وقت اپنے قلب میں سمونا فاروق حسن کا ہی حوصلہ ہے۔ اس کی عمدہ مثال کتاب کی

آخری نظم ہے۔

اس قدر ہمت نہیں

میں پرندے کا لبادہ اوڑھ کر

ہاتھ پھیلاؤں، اڑوں

ہاتھ پھیلاؤں اگر

دیوار میں لگتی ہیں جا کر کہنیاں

اپنی کوشش کی ہزیمت سے سراسر دم بخود

اب چھلے زخموں کو تھامے

دیکھتا ہوں تتلیوں پھولوں کے خواب

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد قاری آئندہ کی منزلوں کا منتظر رہے گا۔

مجھے امید ہے اور میری دعا ہے کہ فاروق حسن کے خواب زندہ رہیں۔ وہ اپنی تعبیروں سے ہم آغوش ہوں اور ان کے قلم کا حوصلہ جواں رہے تاکہ وہ اپنے داخلی سفر سے ہمیں آشنا کرتے رہیں۔ شاعر کے سفر کی شمعیں قاریوں کی تاریک راہوں میں بھی روشنی کرتی رہتی ہیں، ان کی ذات کی گہرائیوں کو اجاگر کرتی ہیں اور ان کی ہمتوں کو جواں رکھنے میں ممد ثابت ہوتی ہیں۔

میں فاروق حسن کی مزید نظموں کا منتظر رہوں گا۔

اگست ۱۹۸۴ء

☆☆
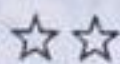
"عابد جعفری :
ایک صحافی ' ایک شاعر"

ایک دور وہ تھا جب صحافت اور شاعری ایک دوسرے سے کوسوں دور رہا کرتے تھے، ایک یہ دور ہے کہ دونوں آپس میں گلے مل رہے ہیں۔

ایک وہ دور تھا جب صحافی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو عوام کی زبان میں اور شاعر خوابوں کے صحراؤں کی باتیں تشبیہوں اور استعاروں کی زبان میں بیان کیا کرتا تھا۔ ایک یہ دور ہے کہ صحافی کے اداریوں میں ادبی چاشنی اور شاعر کی زبان میں سادگی نظر آنے لگی ہے۔

اردو ادب اور صحافت کی اس نئی روایت کا ایک نمائندہ عابدؔ جعفری ہے۔ عابدؔ جعفری جو ایک حساس شاعر بھی ہے او حق گو صحافی بھی، جو ایک شاعری کے مجموعے کا خالق بھی ہے اور ایک اخبار کا مدیر بھی۔ اس کی شاعری میں سیاسی شعور اور اس کے اداریوں میں ادبی چاشنی کے رنگ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ یہ صحافت اور شاعری کے امتزاج کا ہی فیضان ہے کہ عابدؔ جعفری کا قلم ایسے اشعار تخلیق کرتا ہے۔

ہر ایک صبح پہ مقتل کا ہو رہا ہے گماں
نہ جانے کون سی سرخی خبر میں ملتی ہے

•

اب بھی یوں لگتا ہے جیسے ہر خبر ہو آج کی
اس لئے برسوں پرانا میز پر اخبار ہے

عابدؔ جعفری آج کا شاعر ہے اور وہ لوگ جو اردو ادب کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہیں بخوبی جانتے ہیں کہ آج کا اردو کا شاعر صرف خیالوں کی دنیا کی بات نہیں کرتا وہ لب و رخسار کے قصوں اور ہجر و وصال کے تذکروں سے بہت آگے نکل آیا ہے۔ وہ اپنے ماحول میں بسنے والے انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی مسائل اور ان کے معاشرتی اور سیاسی حالات کا مشاہدہ کرتا ہے، ان کے درد کو محسوس کرتا ہے اور پھر انہیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لئے عابدؔ جعفری کی شاعری وہ آئینہ خانہ ہے جس میں اس کی ذات اور اس کے ماحول کے واضح نقوش نظر آتے ہیں۔

جب ہم عابدؔ جعفری کی شاعری کے شہر خیال میں داخل ہوتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلے تعارف اس کے سیاسی شعور سے ہوتا ہے۔ عابدؔ جعفری کینڈا میں برسوں سے رہنے کے باوجود پاکستان کے عوام کی آزمائشوں سے باخبر رہتا ہے وہ جانتا ہے کہ تیسری دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستانی عوام بھی طبقاتی کشمکش میں پسے رہتے ہیں۔ وہ ایسے ماحول میں سانس لیتے ہیں جہاں ظلم اور استحصال، محرومی اور ناانصافی روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ جہاں ایک شخص کا حق دوسرے شخص کی مراعات میں شامل ہوگیا ہے۔ عابدؔ جعفری اپنے ان مشاہدات کا شاعرانہ اظہار یوں کرتا ہے۔

چاروں طرف کچھ دیواریں سی رہتی ہیں آہوں میں لگی
میری مٹی تیرے گھر کی گہری بنیادوں میں لگی

عابد جعفری ایک صحافی ہونے کے ناطے سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ تاریخ پر گہری نظر رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ عوام کا استحصال ایک اتفاقی امر نہیں ہے بلکہ ایک سوچے سمجھے نظام کے تحت ہوتا آیا ہے اور اس نظام کو چلانے والا ایک ایسا گروہ ہے جن کی آنکھوں کو ذاتی مفادات اور آمرانہ جاہ و جلال نے خیرہ کر دیا ہے اور وہ عام انسانوں کی محرومیوں اور مجبوریوں کو نظر انداز کرتے اور انہیں وعدۂ فردا سے بہلاتے آئے ہیں۔ عابد ایک حق گو شاعر کی طرح اپنی ہمت اور جرأتِ رندانہ کا اظہار کرتا ہے اور اصحاب بست و کشاد سے پوچھتا ہے۔

یہ پیڑ کاٹنے والوں سے ہے سوال مرا
پرند اڑ کے کہاں جائیں گے ٹھکانوں سے

امیر شہر سے کوئی تو یہ پوچھے آخر
ہم اپنے ضبط کی قیمت چکائیں گے کہاں تک

عابد جعفری بنیادی طور پر صلح پسند شاعر اور صحافی ہے اس لئے وہ اپنے اظہارِ خیال میں تہذیب اور شرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا لیکن جب اس کے سامنے عوام کا خون بہتا رہتا ہے اور آمر اور فوجی حکمران اپنے ظلم سے باز نہیں آتے تو اس کے لہجے میں طنز کے رنگ ابھرنے لگتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

ابھی تک لشکری آسیب ہے سایہ فگن ہم پر
حضور شاہ یوں لگتا ہے جیسے سر نہیں پہنچے

جب عابدؔ جعفری حالات کو بتدریج بگڑتے دیکھتا ہے تو اس کے لہجے کا طنز آہستہ آہستہ تلخی کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور اس کی نظموں کا ہر لفظ چبھتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ کہتا ہے۔

تو اے سپاہِ امیر ظلمت
بڑھاؤ لشکر
نہتے بچوں اور عورتوں کو
بہادری کے دکھاؤ جوہر

اٹھاؤ مشعل
زمیں تو ہم نے کل ان کے قدموں سے کھینچ لی تھی
چلو کہ سر سے فلک بھی کھینچیں

عابدؔ جانتا ہے کہ پاکستانی عوام سے ہمیشہ جمہوریت کے وعدے کئے گئے لیکن اس کی جگہ حکومت، ڈکٹیٹر اور فوجی کرتے رہے اور وہ حکومتیں چند دن، چند ہفتے، یا چند مہینے نہیں بلکہ سالہا سال تک انسانی حقوق اور جمہوریت کی روایات کو پامال کرتی رہیں۔ کئی سالوں کی تیرگی اور گھٹن کے بعد اگر کوئی روشنی کی کرن یا تازہ ہوا کا جھونکا ادھر سے گزرے بھی تو ان کا قیام عارضی ثابت ہوا۔ عابدؔ نے اس دائروں کے سفر کے ایک موڑ کا، ایک جابر ڈکٹیٹر کی رخصتی کا ذکر کچھ یوں کیا ہے ؎

وہ گیا
جس نے میرے وطن کا ہر ایک دن
نئی ظلمتوں کے حوالے کیا
وہ گیا

جس نے میرے تشخص کو
بارود کے بیکراں شور میں ضم کیا
وہ گیا
اس کو جانا بھی تھا
اس سے پہلے بھی کتنے ہی جابر
مری سرزمیں کے لئے
ظلم بوتے رہے
خوں میں تر پیکروں کی نئی کھیتیاں
لہلہاتی رہیں
میرا سارا قبیلہ انہیں قتل گاہوں کی زینت بنا
وہ گیا
وہ چلا تو گیا ہے مگر دوستو
اتنے شاداں نہ ہو
اس سے پہلے بھی جتنے گئے
مشعلِ ظلم پھر اک نئے راہزن کا مقدر بنی
اور اپنا مقدر وہی تیرگی
بے کراں تیرگی کو بہ کو تیرگی.......

بعض دفعہ عوام سیاسی لیڈروں اور فوجی حکمرانوں سے مایوس ہو کر مذہبی رہنماؤں کی طرف رجوع کرنے لگے ان کا خیال تھا کہ شاید مذہبی رہنما ہی ان کا درد محسوس کریں، ان کے جذبات اور احساسات کو سمجھیں اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر اجتماعی فلاح و بہبود کی بات کریں لیکن انہیں وہاں بھی ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا۔ عابد جعفری اس صورت حال کا کس خوبصورتی سے

اظہار کرتا ہے۔

کوبہ کو ہو گئیں تعمیر عبادت گاہیں
جمع کرتے ہی رہے ہم تو مکاں کے پتھر

جب عوام کی پریشاں حالی حد سے گزر جائے
جب بچے اپنی معصومیت کھودیں
جب عورتوں کے لئے عصمت بچانی مشکل ہو جائے
جب جواں مرد بے روزگاری کے جہنم میں جلنے لگیں
جب بوڑھے موت کا انتظار شدت سے کرنے لگیں

اور حکمرانوں کو اپنے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے ہی فراغت نہ ہو تو عوام اتنے بددل ہو جاتے ہیں کہ ان کا غصہ اور تلخی آہستہ آہستہ نفرت اور عداوت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور ملک میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ خانہ جنگی جو کسی بھی قوم کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے۔ خانہ جنگی میں گھر، اسکول اور بازار قتل گاہیں بن جاتے ہیں اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا بن جاتا ہے۔ عابد جعفری اس عذاب کا ذکر اپنی نظم ''قتل گاہیں'' میں کرتا ہے۔

میرا قبیلہ
تیرا قبیلہ
یہ میری سرحد
وہ تیری سرحد
یہ میرا مذہب
وہ تیرا مذہب

یہ نسل میری
وہ نسل تیری
(ہیں قتل گاہوں کے نام سارے)
مری زمیں کا ہر ایک انساں
زمیں کے قرضے بھلا کے سارے
فلک کا قرضہ چکا رہا ہے

عابدؔ جعفری اپنے ماحول کا بنظر غائر مطالعہ کرتا ہے۔ وہ حالات کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں پر غور کرتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ظلم اور ستم انسانی اعمال کا نتیجہ ہیں اور انسانی اعمال ہی اسے بدل سکتے ہیں لیکن اس روشنی اس آزادی اور اس امن کی منزل کے لئے قربانیاں بہت ضروری ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے دوستوں سے کہتا ہے ۔

کچھ کہو اے مرے دوستو کب تلک
اپنے تن کے اجالوں سے
ان کے مکاں جگمگاؤ گے تم
کب تلک امنِ بے سود کو
خوں پلاؤ گے تم
آؤ پھر سے یہ عہدِ وفا باندھ لیں
اب کے ہر راہزن کا مقدر
ہمارا مقدر بنے

☆☆

"نسیم سید :
کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی"

میں جب بھی نسیم سید کی شخصیت کے بارے میں سوچتا ہوں اور ان کی شاعری کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے مصطفیٰ زیدی کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی
مضبوط کشتیوں کو کنارا نہیں ملا

نسیم سید کی شاعری اور شخصیت کا کچا گھڑا ظلم و استبداد کے گردابوں، ناانصافی کے طوفانوں اور استحصال کی تند اور تیز لہروں سے نبرد آزما ہونے کا استعارہ بن گیا ہے۔ وہ کچا گھڑا مشرقی روایات اور مذہبی اعتقادات کے کنارے کو چھوڑ آیا ہے اور منصفانہ ماحول اور انسانی اقدار کے کنارے کی تلاش میں ہے۔ پچھلے چند سالوں میں ان کی کامیابی حیرت انگیز بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی۔ اتنے مختصر عرصے میں اتنی منزلیں طے کرنا انہی کا حصہ ہے۔

نسیم سید کی شاعری ایک مشرقی عورت کی دکھ بھری داستان ہے جس کا ہر دکھ، ہر غم، ہر مصیبت، ہر تکلیف اور ہر امتحان اس بات کا ثبوت ہے کہ

مشرقی ماحول میں عورت کو آج بھی وہ مقام نہیں ملا جس کی وہ حقدار ہے

چاہے وہ گھر ہو یا اسکول

چاہے وہ دفتر ہو یا ایوانِ سیاست

چاہے وہ کھیل کا میدان ہو یا کاروبار کا

ہر جگہ عورت کو مرد سے کم تر سمجھا جاتا ہے اور جب بھی عورت اپنے مساوی حقوق کے لئے کوشش کرتی ہے تو اسے ہم سفری کے غیر فطری آداب سکھائے جاتے ہیں۔

چلو تو ساتھ مگر دو قدم رہو پیچھے
ہمارے حق میں یہ تاکید بار بار ہوئی

نسیم سید کا خیال ہے کہ یہ تفریق اور ناانصافی جو ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے وہ صرف آج کا ہی المیہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے صدیوں کی تاریخ ہے۔ ایسی تاریخ جس کو بیان کرنے والے اور لکھنے والے مرد تھے اور ان مردوں نے انسانی زندگی اور تاریخ کی ایسی Interptation کی جس میں مرد تو سرخرو نظر آئے لیکن انسانیت کی تباہی کا الزام عورت کے سر آیا۔

نکل کے خلد سے ان کو ملی خلافتِ ارض
نکالے جانے کی تہمت ہمارے سر آئی

اس حقیقت کا تو مغرب کے مورخ اور باخبر لوگ بھی اقرار کرنے لگے ہیں کہ عورتوں کے کارناموں اور خدمات کو نظرانداز کیا گیا ہے

جب زندگی کے ہر شعبے میں عورت کو مساوی حقوق نہ ملیں اور اسے ہر موڑ پر موردِ الزام ٹھہرایا جائے تو اس کا دل شکستہ اور دل برداشتہ ہونا اور مردوں پر اعتبار نہ کرنا ایک فطری بات ہے شاید اسی لیے بہت سی عورتیں تنہائی کی زندگی گزارتی ہیں اور مردوں کی قربت سے دور رہتی ہیں۔ جب مرد ان کی

طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں تو وہ انہیں شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں وہ نہیں جانتی کہ اس دوستی میں خلوص کتنا ہے اور خود غرضی کتنی۔

دعا اڑان کی بھی۔ پر بھی کاٹتے جانا
ترا مزاج نہ اے دوست ہم نے پہچانا

نسیم سید کا خیال ہے کہ عورت سے اس غیر منصفانہ سلوک میں مشرقی معاشرے میں مذہب نے بڑا کردار ادا کیا ہے اور مذہب کے ٹھیکیداروں نے عوام کو مذہبی رسومات اور روایات کے ایسے گھروں میں قید کر رکھا ہے جہاں حبس اور گھٹن کے سوا کچھ نہیں جہاں جہالت اور تعصب کا بسیرا ہے۔ وہاں نہ علم و آگہی کی روشنی آتی ہے۔ نہ تازہ خیالات اور تجربات کی ہوا۔

عجیب رخ پہ مذاہب نے گھر بنائے ہیں
کہ روشنی کا ہوا کا جہاں گذر ہی نہیں

نسیم سید کہتی ہیں کہ دنیا کے مذاہب جو بنیادی طور پر غریبوں کی زندگیاں بہتر کرنے کے لئے اور عوام کو ان کے حقوق دلوانے کے لئے آئے تھے اور جن کے پیغمبروں نے لڑکیوں کے زندہ درگور ہونے کے خلاف احتجاج کیا تھا آج ان ہی مذاہب کا پرچار کرنے والے، عوام اور ان کے حقوق کے درمیان ایک دیوار بن گئے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ وہ غریب جو خود بے گھر ہیں ان ہی کی محنت کی کمائی سے خدا کے گھر بنائے جا رہے ہیں۔

سینکڑوں گھر بنا دیے اس کے جو لامکان ہے
پر کسی بے مکان کا ایک نہ گھر بنا سکے

بات صرف مذہبی عقاید، رسومات اور روایات تک ہوتی تو شاید برداشت کر بھی لی جاتی لیکن ان مذہبی رہنماؤں نے آسمانی کتابوں کی بھی ایسی تفسیر اور تشریح پیش کی کہ خدا کا جو تصور ابھرتا ہے وہ منصفانہ نہیں ہے اور

بھی عورت کو گھر میں، بازار میں، کاروبار میں اور کمرۂ عدالت میں پورے حقوق دینے سے کتراتا ہے۔ اسی لئے وہ عورت جو مذہبی رہنماؤں سے تنگ آچکی ہے آخر مجبور ہو کر اپنے خدا سے شکایت کرتی ہے۔

ہماری ہی سب گواہیوں پر
یہ بے یقینی کی مہر کیوں ہے
سبھی صحیفوں میں یہ لکھا ہے
ترے ترازو کا کوئی پلڑا جھکا نہیں ہے
تو کیا یہ سمجھیں
ہمارا کوئی خدا نہیں ہے

نسیم سید کہتی ہیں کہ مذہبی خیالات اور روایات نے لوگوں کو سنگدل بنادیا ہے اور ان سے کسی قسم کی ہمدردی اور خلوص کی امید رکھنا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ عورت جو اس امید کا سہارا لے کر آگے بڑھتی ہے، وہ منہ کے بل گرتی ہے۔ اسی لیے وہ عورت جو اپنے معصوم نوزائدہ بچے کو مسجد کی سیڑھیوں پہ رکھ آئی تھی یہ نہ جانتی تھی کہ مذہب کے رہنما اس کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیں گے۔

اس کو انساں کی شرافت پہ گماں زیادہ تھا
اسکو کچھ مذہبی وحشت کا نہ اندازہ تھا

نام پہ دین کے مقتل یہ سجادیتے ہیں
ظلم کی آگ کو مذہب کی ہوا دیتے ہیں

نسیم سید جانتی ہیں کہ کسی ماحول میں ایسی ناانصافیاں چاہے وہ روایت کے نام پر ہوں یا مذہب کے نام پر، اس وقت تک پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتیں جب تک انہیں اہالیانِ سیاست اور اصحابِ بست و کشاد کی معاونت حاصل نہ ہو۔ اسی لئے نسیم سید صرف مذہب کو ہی تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھتیں بلکہ ایسی سیاست کو بھی ذمہ دار سمجھتی ہیں جو حق اور انصاف کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے اور کانٹے بکھیرتی ہے۔ اسی لیے وہ سیاسی رہنماؤں کے بارے میں کہتی ہیں۔

صلیب سے جو ٹپکتا ہے
بے گناہ لہو
وہ بوند بوند کا اپنی
حساب لیتا ہے

نسیم سید کو صرف روایت پرستوں، مذہبی رہبروں اور سیاسی رہنماؤں سے ہی شکوہ نہیں، انہیں فنکاروں اور شاعروں سے بھی شکایت ہے جنہوں نے ہمیشہ عورت، اس کے جمال اور اس کی ظاہری خوبصورتی کو سراہا اور اپنی ہوس کا نشانہ بنایا لیکن عورت کی عقل، اس کی ذہانت، اور اس کے کردار کی عظمت کو نظرانداز کرتے رہے۔ اسی لیے نسیم سید فنکار سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں

تو بھلا کیا میری تصویر بنا پائے گا
تیرے اوراق سے یہ شکل مٹانی ہو گی
اپنی تصویر مجھے
آپ بنانی ہو گی

اور پھر نسیم سید اپنی شاعری میں اس عورت کی تصویر کی چند جھلکیاں دکھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسی عورت جو

معاشرے کا ایک اہم رکن ہے

اپنے گھر کو اپنی قربانیوں کے خون سے سینچتی ہے
اپنے ماحول کو اپنی خدمات سے جلا بخشتی ہے
اور
مرد کے شانہ بہ شانہ ایک بہتر معاشرے اور مستقبل کی
تعمیر کرتی ہے۔

ان کی ایک خوبصورت نظم کے چند اشعار ہیں:

ایشیا کی مزدور عورت

تغاری سر پہ دھرے تربتر پسینے سے
اٹھائے ماتا کا بوجھ نومہینے سے

چڑھے گی زینہ بہ زینہ سمیٹتی ساری
اگرچہ بوجھ بھی بھاری ہے پیر بھی بھاری

غریب ہے جو بدن کا خراج دیتی ہے
یہ خود کو پیس کے گھر کو اناج دیتی ہے

اگرچہ نسیم سید کی شاعری میں زیادہ تر خیالات اور تاثرات مشرق کے حوالے سے ملتے ہیں لیکن بعض نظموں میں انہوں نے شمالی امریکہ کے رشتوں پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ''دسویں عورت'' میں یہ بتایا ہے کہ عورت کی حالت مشرق میں ہی نہیں مغرب میں بھی مخدوش ہے اور ہر دسویں عورت اپنے ہی گھر میں اتنا ظلم اور تشدد برداشت کرتی ہے کہ اسے Shel-tered Home میں عارضی طور پر پناہ لینی پڑتی ہے۔

جب کوئی شخص مروجہ روایات کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور حق و انصاف کا مطالبہ کرتا ہے تو اس پر ہر طرف سے پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ اپنے اور

بیگانے لعن طعن کرتے ہیں۔ بعض دفعہ مخالفت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ شخص تھک ہار کر گر پڑتا ہے اور اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

نسیم سید پر بھی ایک مخلص فنکار کی طرح ایسے لمحے بیتے ہیں

خوشنودیِ وقت کی خاطر ہم
بس کیا کیا بار اٹھاتے ہیں
ہم آس کی شبنم بوتے ہیں
اور یاس کے صحرا پاتے ہیں

ظاہر میں تو ہمت اوڑھے ہیں
اور اندر ٹوٹتے جاتے ہیں

☆☆

جب سب رستے بے منزل ہیں
جب سب لمحے پتھر دل ہیں
جب سوچیں سب لاحاصل ہیں
پھر کیا سوچیں پھر کیوں سوچیں؟

☆☆

لیکن اکثر اوقات یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے اور ان کے دل کا اعتماد اور ان کے خوابوں کے رنگ عود کر آتے ہیں اور وہ جانتی ہیں کہ ایک دن وہ دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں گی جہاں حق اور انصاف کا جہاں آباد ہے۔

تھے ان کے قبضے میں پتوار پھر بھی ڈوب گئے
میں اتری موجوں میں کچے گھڑے سے پار ہوئی

نسیم سید اپنے خیالات، نظریات اور تجربات اس خوبصورتی سے اور اس جذبے سے پیش کرتی ہیں کہ پڑھنے اور سننے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی

ہیں۔

نسیم سید کی شاعری اس دور کی ہزاروں بلکہ لاکھوں عورتوں کے دل کی آواز ہے اور مردوں کے لئے لمحۂ فکریہ۔

نسیم سید کی شاعری اور دوستی مجھے بہت عزیز ہیں۔

ستمبر ۱۹۹۱ء

"جاوید دانش :
شہر آزادی میں محصور"

(جاوید دانش کے ڈراموں کے چند کردار)

جب ہم جاوید دانش کے ڈراموں کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو ہمارا بہت سے کرداروں سے تعارف ہوتا ہے ان کرداروں میں عورتیں بھی شامل ہیں، مرد بھی، بچے بھی، بزرگ بھی، کامیاب لوگ بھی، ناکام لوگ بھی، خوشحال لوگ بھی، دکھی بھی، رومان پرست انسان بھی، اور حقیقت پسند بھی، پہلی نظر میں جو قدر ان سب میں مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سب کردار مشرقی ہیں۔ لیکن مغرب میں آبسے ہیں اس لئے اگرچہ ڈراموں کا کیمرہ ان مشرقی کرداروں پر مرکوز رہتا ہے لیکن ان کے پس منظر میں مغربی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور اس تضاد سے ان کرداروں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔

پہلی نظر میں یوں لگتا ہے جیسے یہ سب کردار ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں اور وہ خاندان ایسے قبیلے کا حصہ ہو، جو اپنے آبائی دیہاتوں اور شہروں کو چھوڑ کر ایک حسین مستقبل کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں لیکن وہ کردار گھروں سے جو خواب لے کر نکلے تھے وہ ہر موڑ پر چکناچور ہو رہے ہیں اور ان خوابوں کی کرچیاں ہر قدم پر آنکھوں اور پاؤں میں چبھتی ہیں اور یہی کیفیات ان

ڈراموں میں ایک خاص قسم کی گہرائی اور کاٹ پیدا کرتی ہیں۔

جب ہم ان کرداروں کی آرزوؤں، امیدوں اور خواہشوں کو قریب سے دیکھنے اور سننے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں

ان دعاؤں کی یاد آتی ہے جو ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی دلوں میں دفن ہو گئیں

ان پھولوں کی مہک یاد آتی ہے جو پوری طرح کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے اور

ان چاندوں کی یاد آتی ہے جن کو چودھویں رات سے پہلے ہی گرہن لگ گیا۔

چنانچہ یہ ڈرامے شکستہ خوابوں کی داستانیں ہیں، تشنہ خواہشوں کے قصے ہیں اور مہاجر خاندانوں کی سوانح عمریاں ہیں۔ ان ڈراموں کے المیوں میں افراد کے المیے بھی ہیں، خاندانوں کے بھی اور قبیلوں اور قومیتوں کے المیے بھی۔ ان کے کرداروں کی آنکھوں میں جہاں صبح دیکھنے کی تمنا ہے تو وہاں رات کی طوالت کا شکوہ بھی ہے۔ جہاں ان کے حوصلوں میں پختگی ہے وہاں اپنی اقدار کی شکست و ریخیت کا دکھ بھی ہے۔

جب ہم ان کرداروں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں وہ مختلف گروہوں میں بٹے دکھائی دیتے ہیں اور ہر گروہ میں چند خصوصیات مشترک نظر آتی ہیں۔ ان گروہوں میں سے جو گروہ ہماری توجہ اپنی طرف سب سے پہلے مبذول کرواتا ہے وہ روایت پسندوں اور روایت پرستوں کا گروہ ہے۔

جاوید دانش کے ڈراموں کے افہام و تفہیم کے لیے ان روایت پرست کرداروں کا مطالعہ بہت اہمیت کا حامل ہے وہ کردار ان ڈراموں کے ارتقا میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ دانش کے یہ کردار بہت توانا ہیں ان کے پاؤں زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں اور ان کے رشتے اپنی آبائی دھرتی سے بہت گہرے ہیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ دانش ان کرداروں کو

لاشعوری طور پر اپنے ڈراموں میں سر فہرست پیش کرتا ہے۔

''عید کے کرب'' میں اس کی مثال بیگم حمیدہ بیگ

''اندھی ممتا'' میں اس کی مثال مسز جعفری

اور ''کنوارے بھلے'' میں ان کی مثالیں اقتدار خان اور بیگم فرزانہ خان ہیں۔

جب ہم ان کرداروں کا ایک گروہ کی صورت میں مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ٹھوس شخصیتوں کے باوجود وہ سب شدت سے Nostal-gia کا شکار ہیں۔ اگرچہ وہ کردار مغرب میں زندہ ہیں لیکن ان کے ذہن میں مشرق اور ماضی اس شدت سے براجمان ہے کہ وہ ہر قدم پر ماضی کی یادوں کو تازہ رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اپنے ماضی سے بے پناہ پیار اور والہانہ عشق ہے اور یہ عشق صرف زندگی کے ایک رخ پر ہی حاوی نہیں بلکہ ان کی ہر سانس اور ہر رگِ خون میں بسا ہوا ہے۔ چاہے ان کی زبان ہو یا لباس، چاہے ان کے جذبات ہوں یا خیالات، چاہے ان کے نظریات ہوں یا اعتقادات، چاہے ان کی دوستیاں ہوں یا دشمنیاں ان سب میں ماضی سے قریبی رشتے کے گہرے رنگ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ پہلی نسل کے مہاجرین میں ان کرداروں کا علیحدہ مقام ہے۔ ان کرداروں کی پسند و ناپسند ڈراموں میں کیسے جھلکتی ہے اس کی دو مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔

بیگم۔ ''کاش، تم نے دیکھا ہوتا! اصلی چاند رات تو کلکتے میں ہوتی تھی، رمضان میں افطار کے بعد کے بازار۔ مہندی، چوڑیاں اور پھر عید کی گہما گہمی۔ تمہاری تو پیدائش یہاں ہوئی۔ تمہیں بھی کیسے پتہ ہو (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) آہ۔ اب وہ چاند رات اور عید کہاں''

(عید کا کرب)

بیگم۔ ''اچھے بھلے حیدر آباد میں تھے، مٹی پڑو۔ کہاں سے کینڈا آ کو مصیبت

مول لئے۔ (ساری کا دامن کمر میں ٹھونستے ہوئے) سارا دن کا ماں
کر کر کو جان نکل جاتی! ادھر پانچ پانچ خانساماں، نوکر چاکر چھوڑ کر
یہاں...... توبہ ہے۔

(کنوارے بھلے)

خان صاحب۔ بھئی یہاں کے رکھ رکھاؤ اور تقاضوں کو میں سمجھتا ہوں مگر بنیادی
طور پر ہم لوگ وضع دار لوگ ہیں کیا سمجھے، اور پھر......"

(کنوارے بھلے)

خان صاحب۔ دیکھئے صاحب، ایک بات کی میری بیگم وضاحت چاہ رہی ہیں۔
آپ کو معلوم ہے ہم لوگ سنی ہیں کیا سمجھے۔ کیا آپ کے گھر
والوں کو کوئی اعتراض نہ ہو گا کہ......"

(کنوارے بھلے)

جہاں ایک طرف ان ڈراموں میں ایسی بزرگ ہستیوں کا ذکر ہے جو ماضی کے ذکر سے خوش ہیں تو دوسری طرف ان کرداروں کا گروہ ہے جو شمالی امریکہ میں پلا بڑھا ہے اور مغربی طرزِ زندگی کو فوقیت دیتا ہے اس گروہ میں زیادہ تر بچوں اور نوجوانوں کے کردار شامل ہیں یہ کردار بنیادی طور پر باغی اور روایت شکن ہیں ان کے نزدیک زندگی کا آرام و سکون فرسودہ روایات اور قربانیوں سے بہتر ہے اور ان کا یہ انداز ان کی گفتار، ان کی رفتار اور ان کے کردار سے اجاگر ہوتا ہے۔ دانش کے ڈراموں میں ان کرداروں کو دوسرے نمبر پر اہمیت حاصل ہے اس لیے اکثر اوقات وہ ان کو پہلے گروہ کے بعد پیش کرتا ہے ان میں

"عید کا کرب" کے سمیع بیگ، صوفیہ بیگ اور ارم
"اندھی ممتا" کے عین اور سارہ
اور "کنوارے بھلے" کے سبرینا خان اور روزینہ خان اور رومان خان

شامل ہیں

اس گروہ کے کردار نہ صرف ماں باپ اور خاندان کی زبان سے باغی ہیں بلکہ انگریزی کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ہر موقع پر اپنا مغربی ہونا واضح کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں۔

صوفیہ۔ ”یہ بنگال، بہار یا بنگلہ دیش نہیں۔ کینڈا ہے۔ یہاں سے ہمیں کوئی نہیں نکالے گا“

(عید کا کرب)

رومان۔ ”Who Cares (بال ہوا میں اچھالتا ہے) دیکھو ممی ڈیر ہم لوگوں کو کرنا وہی ہے جو ہمیں اچھا لگتا ہے۔ پھر آپ اور اولڈ مین کیوں ہر وقت اپنا بلڈ پریشر ہائی کرتے رہتے ہیں۔ (پھر بال اچھالتا ہے) ارے ہاں۔ شیرن کا فون تو نہیں آیا تھا۔“

(کنوارے بھلے)

ارم۔ ”آپ اسے اپنا ملک نہیں مانتیں تو نہ مانیں مگر یہ میرا ملک ہے

"I was born here and I am Canadian"

(عید کا کرب)

دانش کے ڈراموں کے یہ دو کرداروں کے گروہ کہانی کی بنیاد رکھتے ہیں اور ان کے تصادم سے ڈراموں میں دلکشی، جاذبیت، تجسّس، مزاح اور طنز کے شرارے ابھرتے ہیں۔ یہ دو گروہ مختلف موڑوں پر اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں اور دوسرے کے موقف کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں دونوں گروہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں اتفاق نہیں کرتے۔ مسائل چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے شروع ہوتے ہیں اور بعض دفعہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

مشرقی والدین اپنے بچوں پر تنقید کرتے رہتے ہیں اور مغربی بچے اپنے والدین کے طرز زندگی کو چیلنج کرنے سے نہیں گھبراتے اور یہ جنگ بڑے پر لطف اور دلچسپ نتائج پیدا کرتی ہے۔

شروع میں تو یہ کشمکش روزمرہ کے واقعات کو اپنی گرفت میں لیتی ہے لیکن آہستہ آہستہ اس میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے اور ایک دوسرے پر حملے ہونے لگتے ہیں یہ تضاد ڈراموں کے اختتام تک اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ نوجوان نسل پرانی نسل کو واپس چلے جانے کی دھمکی دیتی ہے یا مغربی دنیا کے مثبت پہلوؤں کو قبول کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ کرداروں کا یہ سلوک ان کے جذبات کی شدت کا بھی اظہار کرتا ہے اور ان کی نفسیاتی الجھنوں کا بھی۔ ایسے مکالمات کی چند مثالیں حاضر خدمت ہیں:

مسز جعفری۔ ''کچھ نہیں بس میری لاڈلی خودمختار ہونا چاہتی ہے۔ میں نے اکیلے سوئمنگ کے لئے جانے سے روک دیا۔ بس شام سے موڈ خراب ہے۔''

عین۔ (بیزار ہوکر) بات صرف سوئمنگ کی نہیں اور میں کوئی بچہ نہیں and she is overprotective (Pause) (کتاب واپس شیلف پر رکھتے ہوئے) مجھے خوب پتہ ہے کہ وہ کسی کے لیے زندہ ہیں۔''

مسز جعفری۔ ''(بات کاٹتے ہوئے) مگر تم اکیلے ٹینس کھیلنے نہیں جاسکتیں میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی (اٹھنے لگتی ہے)

عین۔ "Oh-No" کبھی آپ ٹینس کھیلتی نہیں وہاں جاکر کریں گی کیا Why Don't you Trust me ٹھیک، میں کہیں نہیں جاتی (غصے سے بیٹھ جاتی ہے)

(اندھی مامتا)

یہ تضاد چند قدم آگے بڑھتا ہے تو

مسز جعفری۔ یہ سچ ہے کہ میں اب تک یہاں ذہنی طور پر بس نہیں پائی مگر میں ہر بات پر شک نہیں کرتی عین! میں جو کچھ کر رہی ہوں۔ تمہاری

بہتری اور مستقبل کے لیے کر رہی ہوں۔ تم بے شک اسے میری
اندھی مامتا کہہ سکتی ہو''

عین۔ (طنزیہ) صرف اندھی مامتا ہی نہیں یہ آپ کے اور آپ کے سماج
کے بنائے ہوئے کھوکھلے اصول ہیں جو یہاں کے طور طریقوں کو برا
سمجھتے ہیں میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ جیسے تمام روایتی لوگ
واپس اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ کیوں نہیں جاتے''

اور پھر یہی عین ڈرامے کے آخر میں کہتی ہے

عین۔ (دھیمے لہجے میں) آج تک میں آپ کی سنتی آئی ہوں آج پہلی بار یہ
کہنے کی جسارت کر رہی ہوں کہ آپ ماضی کو بھول کر حال میں زندہ
رہنا شروع کر دیں اگر یہ اتنا ہی مشکل ہے تو واپس انڈیا چلی جائیں
اور اگر یہاں رہنا ہے تو پھر اس کلچر کی اچھائیوں کو فراخ دلی سے
قبول کریں اور یہ نہ بھولیں کہ اس سرزمین نے ہمیں بہتر زندگی عطا
کی ہے''

(اندھی مامتا)

وہی تضاد جو ''اندھی مامتا'' میں عین اور مسز جعفری میں Act out
ہوتا ہے وہی ''عید کا کرب'' میں بیگم حمیدہ صاحبہ اور سمیع بیگ کے درمیان
چنگاریاں پیدا کرتا ہے اور ڈرامے کے Main Theme کو آگے بڑھاتا ہے۔

سمیع۔ ''یہ سال میں ایک بار (عید کے موقع پر) آپ لوگوں کو اتنے زور
سے اسلام کی یاد کیسے آتی ہے''..........

بیگم۔ ''اچھا ارم کو لے جاؤ اور انڈیا بازار سے کچھ سامان کل کے لیے لیتے
آؤ''

سمیع۔ ''امی۔ سارا دن کام کر کے تھکا ہوا آیا ہوں۔ آپ کو عید کی پڑی

ہے۔ پلیز مجھے آرام کرنے دیں (Pause) اسی دن کے لیے کہا تھا کہ ڈرائیونگ سیکھئے۔ دس سال ہو گئے یہاں آئے ہوئے ابھی بھی آپ خود سے باہر نہیں جاسکتیں۔

ڈرامے کے آخر تک پہنچتے پہنچتے سمیع کے لہجے میں جھنجھلاہٹ اور غصہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے

سمیع۔ ”وہاں کوئی نئی بات تو ہوگی نہیں۔ دس سالوں سے سنتا آرہا ہوں۔ یہ لوگ بس انڈیا پاکستان کی پالیٹکس پر بحث کریں گے نیشن کی برائی، گوروں کی برائی اور کینڈا کی برائی۔ مگر کوئی بھی یہاں سے جائے گا یہیں رہیں گے سب یہیں“

سمیع۔ ”امی جان! ماضی کو چھوڑ کر حال میں خوش رہنا سیکھئے کب تک کلکتے کا رونا روتی رہیں گی (Pause) اگر صرف پیسے کے لیے آپ لوگوں نے اپنا گھر بار چھوڑا تھا تو سلیم چچا کی طرح جدہ میں پانچ سال نوکری کر کے ساری جمع پونجی لے کر اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلی جاتیں یہاں کیوں آئیں۔“

اور وہی تضاد جو ”عید کا کرب“ اور ”اندھی ممتا“ میں والدین اور بچوں کے درمیان چنگاریاں پیدا کرتا ہے ”کنوارے بھلے“ میں رومان اور اس کی والدہ کے درمیان سر اٹھاتا ہے۔

بیگم۔ ”ایک تو تیری تاریخوں سے میں بیزار ہوں جب دیکھو ڈیٹ! کام کا نہ کاج کا۔ بس گوری چھوکریوں کے پیچھے تباہ! تیرے باوا کو پتہ چل گیا تو ان کا پارہ خواہ مخواہ چڑھنے لگیں گا!“

رومان۔ ”Who Cares۔ (بال ہوا میں اچھالتا ہے) دیکھو ممی ڈیر! ہم لوگوں کو کرنا وہی ہے جو ہمیں اچھا لگتا ہے۔ پھر آپ اور اولڈ مین کیوں ہر وقت اپنا بلڈ پریشر ہائی کرتے رہتے ہیں۔ (پھر بال اچھالتا

ہے) ارے ہاں۔ شیرن کا فون تو نہیں آیا تھا؟

بیگم۔ ''شرم کرنا ہجار۔ ماں سے ایسی بکواس کرتا ہے۔ تو کچھ کماتا ہوتا تو کیا کرتا خم بخت۔''

(کنوارے بھلے)

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ دانش کے ڈراموں میں صرف دو جگہ کسی مغربی کردار کا نام آتا ہے ''کنوارے بھلے'' میں رومان کی گرل فرینڈ شیرن کا اور 'عید کا کرب' میں سمیع کی گرل فرینڈ شیر کا۔ لیکن صرف ذکر ہی آتا ہے وہ خود نہیں آتیں۔ نہ ہمیں ان کی عمر پتہ چلتی ہے نہ شکل و صورت نہ ان کی ملازمت اور نہ شخصیت۔ ان کرداروں کا ذکر بھی ماں باپ کو چیلنج کرنے کے لیے آتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ بیٹوں سے گرل فرینڈز کا ذکر تو والدین بادلِ ناخواستہ سن لیتے ہیں لیکن بیٹیوں میں اتنی بھی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے رومانوی تعلقات کا ذکر والدین کے سامنے کر سکیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں وہ ان کاروائیوں میں شمولیت نہیں کرتیں جن سے ان کے والدین کو اختلاف ہے لیکن وہ باتیں صیغۂ راز میں رہتی ہیں۔

روزینہ ان صیغۂ راز کاروائیوں کا ذکر ایک ٹیلیفون کی گفتگو میں کرتی ہے۔

روزینہ۔ ''سرجن صاحب، میں ایک آزاد خیال اور Establishedلڑکی ہوں۔ Yes, I know I am smart ہاں کوشش تو ماں باپ کی ہے مگر پسند نہیں ہوگی جی! Date ہاں میں نے پہلے ڈیٹس کی ہیں۔ جی گورے لڑکوں کے ساتھ جی ہاں کالج کے ساتھی کیوں نہیں۔ I Love Peopleپارٹیوں میں بھی جاتی ہوں۔ ضروری نہیں۔ موڈ ہوا تو کبھی کبھی وائن بھی لے لیتی ہوں۔ جی نہیں I Don't

Smoke۔ میں جانتی ہوں ہاں شادی مجھے گورے سے نہیں کرنی۔
مگر تیری پسند کا لڑکا نہیں ملا تو میں شادی زبردستی بھی نہیں کروں
گی۔ مجھے پتہ ہے میرے روایتی والدین یہ سب برداشت نہیں کریں
گے جی میں نے اس کا بھی انتظام کرلیا ہے۔ 'Oh-Yes'
I am not depending on my parents آپ کس زمانے کی
بات کر رہے ہیں۔ بھئی گھر بھی میں نے اپنا لے لیا ہے۔ جناب! جی ابھی کرایے
پر دیا ہوا ہے جب ضرورت ہوگی اس میں شفٹ کر جاؤں گی۔ ویسے بھی والدین
کے ساتھ ہمیشہ تو نہیں رہ سکتی"

(کنوارے بھلے)

جب بھی ہم دانش کے ڈراموں (اندھی ماما، عید کا کرب اور
کنوارے بھلے) کے کرداروں کا مطالعہ اور تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا
ہے کہ چاہے وہ روایتی کردار ہوں یا ماڈرن، روایت پسند ہوں یا بغاوت پسند۔
ان میں سے سب ذہنی سکون سے عاری نظر آتے ہیں۔ ان کے رجحانات اور
نظریات، طرزِ عمل اور طرزِ زندگی میں جذباتیت کا عنصر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔
ان میں سے ایک کردار بھی ایسا نہیں جس نے مشرقی اقدار اور مغربی طرزِ
زندگی پر سنجیدگی سے غور کیا ہو۔ اور ایسے خیالات کا اظہار کیا ہو جو مسائل کا
حل پیش کرتا ہو۔

لیکن پھر ہماری ملاقات، ہجرت کے تماشے، کے کرداروں سے ہوتی
ہے اور اس میں پہلی دفعہ راحیل اختر اور سسٹر شانتی جیسے انسانوں سے تعارف
ہوتا ہے۔ یہ ڈرامہ دانش کے کرداروں میں ایک ارتقائی رجحان کا اظہار کرتا
ہے یہ کردار ایسے ہیں جنہوں نے نہ صرف مغرب میں زندگی بسر کی ہے بلکہ ان
مسائل پر بھی غور کیا ہے جو مشرقی لوگوں کو ان کی زندگیوں میں درپیش ہیں اور
ایک Self Help Group کا بھی اہتمام کیا ہے جو کسی بھی قبیلے کا اپنے مسائل

کی ذمہ داری لینے کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔

راحیل۔ ''ہم میں سے ہر ایک کو نئے کلچر میں کوئی نہ کوئی الجھن کوئی رکاوٹ ضرور ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ الجھنیں کیوں ہیں اور ان کو کم کرنے کا کون سا طریقہ ہمیں اپنانا ہے۔''

(ہجرت کے تماشے)

اگرچہ راحیل نے ان مسائل کی گتھیاں سلجھانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے اور اس میں ایک دوسرے کی مدد کی افادیت پر بھی زور دیا ہے لیکن دانش کے ڈراموں میں کوئی ایسا کردار نظر نہیں آتا جسے ہم مغرب میں Integrated and Well Adjusted کہہ سکیں اگر وہ ہیں بھی تو ان کی زندگی کی اتنی جھلکیاں ہمیں نظر نہیں آتیں کہ دل اسے قبول کر سکے اور اس صورتِ حال کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ دانش کے ڈراموں کے زندہ کردار سب کے سب مشرقی ماحول میں زندہ ہیں اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ مغرب میں زندگی گزارنے کی وجہ سے ان کے ہمسائے، ان کے رفیق کار ان کے دوست اور بعض کے محبوب مغربی ہوں گے لیکن ان کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہو گا کہ

They are conspicious by their absence

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ دانش صرف مشرقی لوگوں کی زندگی کا ایک خاص رخ ہمیں دکھانا چاہتا ہے یا یہ کہ اسے مشرقی گھرانوں میں ایسے کردار نظر نہیں آئے جو مغربی میزبانوں کے ساتھ صحتمندانہ رشتے قائم کر سکے ہوں یا یہ کہ وہ صرف پہلی نسل کے مہاجروں پر توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہے جن میں سے اکثر اپنے مسائل میں اتنا الجھے رہتے ہیں کہ انہیں اپنے چاروں طرف ہونے والے واقعات سے کم ہی واسطہ ہوتا ہے۔

لیکن یہ سوال ایک لحاظ سے غیر منصفانہ ہے۔ اگر ہمیں دانش کے

ڈراموں میں یہ دیکھنا ہے کہ ان میں کون سے کردار ہیں نہ یہ کہ ان میں کون سے کردار نہیں ہیں تو ہمیں ایسا سوال نہیں اٹھانا چاہیے۔ لیکن ہمیں یہ سوال اس لئے بھی اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ مغرب میں رہنے والے دیگر نثر نگار ان کرداروں کو اپنی کہانیوں میں جگہ دے رہے ہیں۔ شاید وہ دانش کی اگلی کتاب کا موضوع بنیں کیونکہ اگر دانش نے مغربی کرداروں کو اپنے ڈراموں میں جگہ نہ دی تو یوں لگے گا کہ اس نے مغرب میں چھوٹا سا ہندوستان بسا لیا ہے اور وہ خود بھی اسی نوسٹیلجیا کا شکار ہو جائے گا جن کے اس کے روایتی کردار شکار ہیں۔

بہرحال یہ تو تھا جملۂ معترضہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دانش نے جن موضوعات کو چنا ہے اور جن کرداروں کو تخلیق کیا ہے وہ نہ صرف جاندار ہیں بلکہ مغرب میں مشرقی حقیقتوں کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کرتے ہیں مجھے امید ہے کہ ایک دن کوئی ڈائرکٹر یا تو انہیں اردو میں ہی یا ان کا ترجمہ انگریزی میں کر کے اسٹیج پر پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔

مارچ ۱۹۹۲ء

”رضا الجبار
کے افسانوں میں طنز کے نشتر“

جب ہم شمالی امریکہ میں اردو ادب کے منظر نامے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہاں جس قدر شاعروں کی بہتات ہے اسی قدر افسانہ نگاروں کی قلت ہے۔ افسانہ نگاروں کے اس چھوٹے سے کارواں کے ایک اہم مسافر رضا الجبار ہیں جو پچھلی چار پانچ دہائیوں سے مشرق و مغرب کی ادبی دنیا کو اپنی نگارشات اور تخلیقات کے تحفے پیش کرتے رہے ہیں۔

میں نے جب ''چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر'' کے افسانوں کا بہ غور مطالعہ کیا تو مجھے ان افسانوں کے جن پہلوؤں نے متاثر کیا ان میں سے ایک ان کا طنزیہ پہلو تھا۔ رضا الجبار کے افسانوں میں اس مختصر سے مضمون میں ان نشتروں میں سے چند ایک پر اپنی توجہ مرکوز کروں گا۔

رضا الجبار کے افسانوں میں طنز کا پہلا نشتر انسان اور خدا کے رشتے پر جا کر لگتا ہے۔ ان کی بھرپور کہانی ''چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر'' کے کردار مہیش کو جسے اس کے والدین معذوروں کے ایک ہسپتال میں چھوڑ آئے ہیں۔

''ڈاکٹروں نے اس کے ماں باپ کو لکھا کہ وہ آئیں اور مہیش کو لے جائیں۔ اس بات کو دو برس ہوگئے۔ وہ لوگ نہیں آئے۔ کیوں کہ انہیں پتہ چل گیا کہ مہیش اچھا ہونے والا نہیں ہے۔ اس لئے اسے وہ اپنے خاندان میں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اسے وہ لوگ بوجھ سمجھتے ہیں کیوں کہ مستقبل میں کوئی اچھی امید خاندان کے لئے اس سے نہیں کی جاسکتی۔''

''اوہ خدا۔'' میرے منہ سے نکل گیا۔

''ہاں'' لکشمی بائی نے کہا۔ ''جب مستقبل کی کوئی امید نہیں رہتی ہے تو خونی رشتے بھی اپنے خون کو سفید کر دیتے ہیں۔ لیکن مہیش کو بڑی آس لگی ہوئی ہے۔ وہ ہر روز ان کے آنے کا انتظار کرتا ہے۔ لیٹنے کے بعد وہ بیٹھتا ہے تو محض کھڑکی میں سے اس لمبی سڑک پر اپنی آنکھوں سے تلاش کرنے کے لئے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس راستے پر اسے اس کے ماں باپ، بھائی، بھابی، سدھا اور رمیش نظر آئیں گے اور وہ خوشی سے پھولا نہ سمائے گا۔ وہ انہیں کھڑکی میں سے پکارے گا۔''

''ہو سکتا ہے کہ اس کے ماں باپ کو ڈاکٹر کا خط نہ ملا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ مہیش کے پتاجی کا پتہ بدل گیا ہو۔''

لیکن جب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے والدین کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے اور وہ ایک یتیم و یسیر بچے کی طرح ہسپتال کے بستر پر ہمیشہ پڑا رہے گا تو وہ سوچتا ہے کہ آخر اس کے والدین کی طرح اس کا خدا جو اپنے آپ کو خالق، مالک اور سب کا پالنہار کہلانا پسند کرتا ہے اسے محرومیوں، ناکامیوں اور مجبوریوں کے مارے دیگر انسانوں کی طرح کیوں اذیتوں کی زندگی سے نجات نہیں دلاتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

''مت پکارو اصغر! میں برداشت کرلوں گا۔ مجھے پتہ چل گیا ہے۔ کہ

میرے ہسپتال کے اخراجات میرے پتاجی نہیں بھیج رہے ہیں۔ اب اس درد کی بات بتا کر میں کیسے دوالوں۔"

پھر وہ چاند کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اب اس کشتی میں میں اکیلا ہی سفر کروں گا اور کہیں بھگوان نظر آئیں تو انہیں ہاتھ جوڑ کر کہوں گا کہ لوگوں میں اتنی بے حساب معذوری بانٹنے سے پہلے بھگوان اسے قابو میں رکھنے کے بھی سامان کرو۔"

رضاالجبار کے ان جملوں میں مرزا غالبؔ کی طنز کی گونج سنائی دیتی ہے۔

زندگی اپنی جب اس طور سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

رضاالجبار کے افسانوں میں طنز کا دوسرا نشتر انسانوں اور جانوروں کے رشتے پر جاکر گرتا ہے۔ وہ اپنی کہانی "کھلا ہوا دروازہ" میں دو کتوں کے حوالے سے دو معاشروں کا مقابلہ کرتے ہیں اور ہمیں آئینہ دکھاتے ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان جانوروں سے حیوانوں سے بدتر سلوک کرتے ہیں۔

پولیس اسٹیشن پر انسپکٹر نے رامو کی شکایت سنی اور رامو کے پہلو میں کھڑے ہوئے ٹائیگر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "زخم کھایا ہوا یہ کتا نہ صرف خارش زدہ ہو جائے گا بلکہ دیوانہ بھی بن جائے گا۔ دیوانے کتے کے کاٹنے سے فوبیا ہوتا ہے۔ پیٹ میں انجکشن لینے پڑتے ہیں۔ بہت تکلیف ہوتی ہے، سمجھا؟۔ اس لئے......"

'اس لیے' کے بعد اپنا جملہ ختم کرنے سے قبل انسپکٹر نے تیزی کے ساتھ اپنے ڈریس میں لٹکائی ہوئی پستول نکالی اور ٹائیگر کو نشانہ بنا کر دفعتاً دو گولیاں داغ دیں ٹائیگر تڑپا تڑپتا رہا اور تڑپ کر مر گیا۔ تڑپا رامو بھی۔ اچانک

پیش آئے ہوئے ان لمحات سے وہ سکتے میں آگیا۔

اس کہانی میں طنز کے ساتھ ساتھ جانوروں پر ظلم جبر اور بے رحمانہ سلوک کے خلاف احتجاج بھی ہے

رضاالجبار کے افسانوں میں طنز کا تیسرا نشتر فنونِ لطیفہ کو نشانۂ ہدف بناتا ہے۔ ان کی نگاہ میں ادب، موسیقی اور مجسمہ سازی کے درپردہ فنکار اپنے غیر صحتمندانہ جذبات کی تسکین چاہتے ہیں۔ فرائڈ نے جس نفسیاتی عمل کو Subli-mation کہہ کر معتبر اور باوقار بنانے کی کوشش کی تھی رضاالجبار اس عمل کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور فنکاروں کی نیت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

''تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے گلڈا۔ تم بہت بھولی اور ناتجربہ کار ہو۔'' فرانک نے کسی قدر آواز اٹھا کر لیکن متفکرانہ انداز میں کہا۔''

''یہ تم کس طرح کہہ رہے ہو فرانک؟'' گلڈا نے پوچھا:

''تم نہیں جانتیں کہ مجسمہ ساز وہی لوگ بنتے ہیں جو عیاش ہوتے ہیں۔'' فرانک نے سمجھانا شروع کردیا۔ ''کسی شریف لڑکی کے پیکر کی تعریف کرکے اس کے اندر یہ خواہش جگادیتے ہیں کہ وہ ماڈل بنے۔ جب وہ لڑکی اس خواہش کو لئے ان کے اسٹوڈیو پر پہنچتی ہے تو فن کے نام پر اس کے کپڑے اتار لیتے ہیں۔ پیکر کا معائنہ کرلینے کے بعد پوز کی تلاش پر ریسرچ کرتے ہیں۔ مناسب پوز بہرحال مل جاتا ہے۔ کام کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ ابتدا کے فوراً بعد مجسمہ ساز محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا موڈ ختم ہوتا جارہا ہے۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ گفتگو کرے گا کہ بغیر موڈ کے ایک فنکار اپنے فن پر نکھار نہیں لاسکتا۔ اس کے بعد بڑی حکمت سے وہ ان ترکیبوں کی فہرست دے گا جس سے فن کار موڈ میں آسکتا ہے اور ان تراکیبوں کے حدود دور دور تک پھیلے ہوئے

ہوتے ہیں گلڈا''۔

رضاالجبار پرانی دنیا سے ہجرت کر کے نئی دنیا میں آکر بسنے والے شاعروں اور مہاجروں کی منافقت کو بھی بے نقاب کرتے نہیں جھجکتے اور اپنے مشاہدات کو طنز کی کاٹ سمیت اپنے افسانوں میں پیش کر دیتے ہیں۔

''جناب! یوں لگ رہا ہے کہ آپ نے نئی دنیا صرف نقشے پر دیکھی ہے۔ اس لیے آپ کے پاس نئی دنیا کے تعلق سے نہ کوئی مشاہدہ ہے اور نہ تجربہ۔ نئی دنیا بڑی مختلف دنیا ہے۔ یہاں پر دھوبی گدھے نہیں پالتے۔''

''پھر کون پالتے ہیں؟'' ان سب کی پیشانیوں پر ایک ہی سوال تھا۔

''وہاں کی دنیا میں گدھے پالنے والوں کو شاعر کہتے ہیں۔ شاعر کے لیے ایک گدھا رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا پرانی دنیا میں ایک شاعر کے لیے علم عروض سے واقفیت ضروری ہے۔ نئی دنیا میں علم عروض کے بغیر بھی کام چلایا جاسکتا ہے لیکن گدھے کو پالے بغیر کام نہیں چل سکتا۔''

میں کھنکارا اور آگے بولا۔ ''شاعر کو اس وقت تک تسکین نہیں ملتی جب تک کہ اسے کوئی واہ واہ کرنے والا نہیں ملتا۔ مکرر ارشاد کہنا اور شاعروں کے آداب قبول کرنا بڑی ادبی خدمت ہے۔ نئی دنیا میں آبادی بہت کم ہے۔ اب جو بھی ہیں، وہ بے ادب ہیں۔ اس لیے شاعروں کو تسکین دینے کے لیے گدھوں سے کام لیا جارہا ہے۔''

''آپ بہت بڑی سماجی خدمت انجام دے رہے ہیں۔'' میرے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

''سماجی خدمت ہی نہیں بلکہ ادبی خدمت بھی۔'' میں نے تن کر کہا۔

''یہ اب دوسری بحث ہے کہ شاعروں کی صحبت میں رہ کر اکثر گدھے شاعر بن جاتے ہیں اور گدھوں میں رہ کر شاعر لوگ ڈھینچوں کرنے کی عادت ڈال لیتے

ہیں۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نئی دنیا میں سب کے حقوق اور سب کے لئے پورے مواقع حاصل کرنے کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔"

نئی دنیا کو ہجرت کرنے سے پہلے میرا مشاہدہ یہ رہا ہے کہ کسی مشاعرے یا محفل میں کوئی شاعر آتا تو محفل کے ختم ہونے پر اس کے شائقین صف بنا کر کھڑے ہوتے اور شاعر انکے سامنے سے گذرتا، ان سے گفتگو کرتا اور انہیں اپنا آٹوگراف دیتا۔ نئی دنیا کو ہجرت کرنے کے بعد اب معاملہ بڑا برعکس ہے۔ شاعروں کی فوج صف بنائے کھڑی ہے۔ ایک گدھا ان کے سامنے سے مارچ پاسٹ کر رہا ہے۔ شاعر گدھے سے باتیں کرنے کے خواہشمند ہیں، اس کا آٹوگراف لینے کے خواہاں ہیں۔ گدھا انہیں مسکراہٹ دیتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔

رضا الجبار کی کہانیوں میں طنز کا چوتھا نشتر مذہبی رہنماؤں کی شہ رگ کو چھوتا ہوا گذر جاتا ہے۔ ان کی ایک اہم کہانی "چراغ تلے" میں مسجد کے پیش امام صاحب جو بظاہر اپنی مسجد اور قوم کی خدمت کے لئے دن رات ایک کر دیتے ہیں درپردہ اپنی بیوی کے حقوق سے غفلت برتتے رہتے ہیں۔ ان کی بیوی ایک انٹرویو کے دوران کہتی ہے:

"ٹی۔وی کے رپورٹر نے پیش امام کی بیوی کے آگے مائیک کر دیا اور پوچھا "کیا آپ خوش ہیں کہ آپ نے اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ کینڈا کو اپنا نیا وطن بنایا؟"

"ابتدا میں میں بڑی خوش تھی۔"

"اب کیوں نہیں؟"

"حسد، جلن، تنہائی، دکھ اور غصہ۔ یہ وہ حصار ہیں جو میرے اطراف کھڑے ہو گئے ہیں اور میں ان کے اندر قید ہو کر رہ گئی ہوں۔"

"کیا آپ بتائیں گی کہ ایسا کیوں ہوا؟"

"میرا شوہر مجھ سے چھوٹ گیا ہے۔ وہ پیش امام جو عوام سے بڑی رقومات بٹور رہے ہیں، میرے رفیق حیات تھے۔ اب نہیں ہیں۔ اب ان کی شادی مسجد کی مہم کے ساتھ ہو گئی ہے۔ ہر روز فجر کی نماز سے قبل گھر سے نکل جانے کا وقت آجاتا ہے لیکن عشاء کی نماز کے اختتام کے بعد بھی ان کے گھر لوٹ کر آنے کا وقت شروع نہیں ہوتا۔ جب ہم کینڈا نہیں آئے تھے تب ہر پانچ دنوں کے بعد دو تین دنوں کا ویک اینڈ آیا کرتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں جو ویک اینڈ کے لئے جیا کرتے ہیں۔ صحت مند اور تازہ سانسوں کے انبار میں ہمیشہ ویک اینڈ سے لیتی ہوں۔ اب ہفتہ میں سات دن وہ کام سے لگے رہتے ہیں۔ ویک اینڈ کے نام سے دور بہت دور ہو کر میں مریض بنتی جارہی ہوں۔ اگر یہ زندگی ہے تو تف ہے میری ایسی زندگی پر۔"

"ہنھ" پیش امام کی بیوی نے کہا۔ "مسجد کی تعمیر کے بعد، اسلامک سنٹر، اسلامی کتابوں کی لائبریری کا قیام، اسلامی تعلیم کو پھیلانے کا پروگرام، اسلامی لٹریچر کی ترتیب اور اشاعت کا مسئلہ، حفاظ بنانے کی ضرورت پر غور۔ کتنے ہی ایسے ان گنت مقاصد، پروجیکٹ اور پروگرام ہیں جن کے بکھیڑے ہر روز میرے کان میں پڑ رہے ہیں۔ مذہب کی یہ مال گاڑی بہت لمبی ہے بیٹی۔ اس کے انجن تمہارے بابا بنے ہوئے ہیں۔ یہ مال گاڑی میرے احساسات کو روندتی ہوئی بڑھ رہی ہے۔ اس کے گھومتے ہوئے پہیے میری خوشیوں میں شگاف ڈال رہے ہیں۔ مال گاڑی کا پہلا ڈبہ گزر گیا اس کا مجھے ہوش ہے لیکن آخری ڈبہ کب گزرے گا اور آخری ڈبے کے گزرنے تک میری کیا حالت ہو جائے گی، مجھے اندازہ نہیں ہے۔ یہ باتیں سوچتی ہوں تو مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔"

رضا الجبار کی کہانیوں میں طنز کا پانچواں نشتر مغربی معاشرے کی اخلاقی اقدار کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی نگاہ میں یہاں بے حیائی اور بد چلنی روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن گئے ہیں اس آزاد ماحول میں نوجوان جنسی بے راہ روی کا شکار ہوگئے ہیں اور ان کی زندگی میں رومانوی اور ازدواجی رشتوں کا کوئی احترام نہیں رہا۔

البرٹ ہائی لینڈ کا گھر اچھا خاصا بڑا تھا۔ یہ بڑا گھر دراصل اس کے لیے وقت کی اہم ضرورت تھا۔ البرٹ اور الوما شادیاں کرنے اور اپنی شادیوں کے بعد طلاق حاصل کرنے میں تجربے کار ہوگئے تھے۔ ان تجربات ہی کے کرشمے تھے کہ ان کی پچھلی بیویوں اور پچھلے شوہروں کے تعلقات سے جو اولاد ہوئی تھی، وہ بڑی تعداد میں تھی۔ البرٹ، لوما کا چوتھا شوہر تھا۔ اور الوما البرٹ کی پانچویں بیوی تھی۔ ان کی کہانی ''چراغ تلے'' میں نئی اور پرانی دنیا کی اقدار کے تضاد اور منافقت کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے پیش امام کی بیٹی کو جب پتہ چلتا ہے کہ اس کے لاس اینجلز میں موڈل (Model) بن کر مشہور اور مالدار ہونے پر اس کے والد کو مسجد سے نکال دیا گیا ہے تو مذہبی لوگوں کی منافقت پر ان الفاظ میں طنز کرتی ہے:

ایک سوال کے جواب میں وہ سنجیدگی سے بولی۔

''میرا اسڈول جسم اور میری خوبصورتی قدرت کے عطا کیے ہوئے گراں قدر تحفے ہیں۔ ہماری کمیونٹی کے لوگ شوشے دیتے رہتے ہیں کہ میں اپنی خوبصورتی اور متناسب جسم کی نمائش کرکے ہر سال کئی سو ہزار ڈالر کا ذاتی فائدہ اٹھالیتی ہوں۔''

ایک سوال کے جواب میں وہ زور سے ہنسی اور بولی:

''ہاں میں جانتی ہوں۔ جب میرے بابا پیش امام تھے تب ہر روز ایک یا

دو نمازوں کے بعد لوگوں سے ملنے اور ان کے مسائل پر ان کی رہنمائی کرنے کے لئے وقت نکالتے تھے۔ ان سے ملنے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے آپ پر غیر ضروری اور غیر حقیقی معذوری طاری کر کے وظیفۂ معذوری حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، فرضی کار حادثوں کی اساس پر انشورنس کمپنیوں سے بڑی رقم اکٹھی کرتے ہیں، اپنی آمدنی کو اصل آمدنی سے کم بتا کر حکومت کی جانب سے کم آمدنی کے لئے بنائے ہوئے گھروں پر قبضہ کر لیتے ہیں، اپنے آپ کو بے روزگار کہہ کر بے روزگاری کا الاؤنس لیتے ہیں اور پوشیدہ طور پر کام بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب مسجدوں میں چندہ دینے کے لئے آتے ہیں تو کیا ان کی آمدنی کے جائز ہونے یا نہیں ہونے کا کہیں کوئی سوال اٹھتا ہے؟'' اور پیش امام صاحب اپنی بیٹی کو ''نئی دنیا کے اندھیرے'' میں گھرا ہوا محسوس کرتے ہیں وہ بیٹی کا مسجد کے لئے چندہ لینے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کی مغفرت کے لئے دعا گو ہوتے ہیں۔

میری بیٹی کی کمائی کا پیسہ مسجد کی تعمیر کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ میں نہیں یقین کروں گا کہ مسجد کی فنڈ کمیٹی اسے قبول کرے گی۔

میری بیٹی نیک ہے۔ سادہ لوح ہے۔ اچانک اس کی آنکھوں کے آگے نئی دنیا کا اندھیرا آگیا اور اس کے ہوش و حواس گم ہوگئے ہیں۔ اسے بجھائی نہیں دے رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ اندھیرا بہت جلد چھٹ جائے گا۔ میری بیٹی صراط مستقیم کو تلاش کر لے گی۔ صراطِ مستقیم اس کے حاصل کیے جانے والے ڈالروں کی پونجی سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ میرے پاس لوٹ کر آجائے گی۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔''

اخباروں کے نامہ نگاروں نے نوٹ کیا کہ پیش امام کی آواز بھر آ گئی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر رضاالجبار کی کہانیوں میں مغربی معاشرت کے خلاف اس قدر شدید ردِ عمل کیوں ہے۔ قمر رئیس کا خیال ہے ''مغربی تہذیب سے ان کی بیزادی کا سبب یہ ہے کہ وہ مشرق کی اعلیٰ انسانی قدروں سے جڑے ہیں'' میری نگاہ میں رضاالجبار کے افسانوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ ایک اہم سوال ہے

جب میں رضاالجبار کی کہانیوں کے مجموعے کو پڑھ کر فارغ ہوا تو میں ان کے کئی افسانوں کے سحر سے کافی دیر تک باہر نہ نکل سکا۔ میری نگاہ میں ان کے تین افسانے ''چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر'' ''دادا جان کی وصیت'' اور ''چراغ تلے'' ایسے افسانے ہیں جو اردو ادب کے لیے نادر تحفے ہیں اور میں ان افسانوں کی تخلیق پر انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

جنوری ۱۹۹۶ء

☆☆

"منیر الدین احمد

نگری نگری پھرے مسافر"

تعارف

جب میں منیر الدین احمد کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے یوروپ کا وہ سفر یاد آجاتا ہے جس میں یوروپ کے مختلف ممالک کی سیاحت کے بعد میں اور میری دوست اور محبوبہ این چودہ گھنٹوں کی ریل کی مسافت طے کر کے جرمنی پہنچے تھے تاکہ منیر الدین احمد سے تفصیلی ملاقات ہو سکے۔ اس ریل کے سفر کے دوران میں نے این سے منیر الدین احمد کے بارے میں اپنے ملے جلے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ ایک طرف مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں ان کی بزرگی، کیونکہ وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے اور ان کا اسلامی تاریخ سے عشق کی حد تک لگاؤ۔ (جب کہ میں ایک سیکولر نقطۂ نظر اور طرزِ زندگی کا مداح تھا) ہم میں فاصلہ نہ پیدا کر دیں لیکن دوسری طرف انکی تخلیقات کی وجہ سے مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایک بالغ النظر، وسیع القلب اور لبرل سوچ کے ادیب تھے اس لئے ہمارے بے تکلفی سے گفتگو اور تبادلہ خیال کرنے کے امکانات قوی تھے۔

این بھی میرے ساتھ منیر الدین احمد کے گھر جانے کے لئے رضامند ہو گئی تھی کیونکہ اس سے پہلے اس کی میرے دوسرے دوستوں اور ان کے

خاندانوں سے ملاقاتیں جن میں سویڈن کے سائیں سچا، ڈنمارک کے نصر ملک، فرانس
کے ابرار الحسن اور امریکہ کے عبد الجبار شامل تھے، نہایت پر خلوص اور خوشگوار ثابت
ہوئی تھیں۔ وہ میرے نئے دوستوں کے ساتھ ملنے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھی۔

ہمبرگ میں اگرچہ ہمارا قیام دو دن کا تھا لیکن اس دوران منیر الدین احمد اور
ان کی ہم سفر اور شریک حیات اوتا کے ساتھ گزارا ہوا وقت ہمارے لئے ایک
خوبصورت یاد بن گیا ہم نہ صرف ان کی پر خلوص میزبانی سے محفوظ ہوئے بلکہ میں نے
اس دوران منیر الدین احمد کا تفصیلی انٹرویو بھی لیا جو میری کتاب Literary En-
counters میں شامل ہے۔ اس انٹرویو کے دوران منیر الدین احمد کی شخصیت،
خاندان، طرز زندگی، نقطۂ نظر اور طرز نگارش کے کئی ایسے گوشوں سے آگاہی حاصل
ہوئی جن کی روشنی میں جب میں نے ان کے افسانے پڑھے تو ان کے تخلیقی سفر کے کئی
ایسے پہلو سامنے آئے جن تک میری رسائی اس ملاقات کے بغیر ممکن نہ تھی۔

ادبی سفر

جب ہم منیر الدین احمد کے مغرب میں تخلیقی سفر کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اندازہ
ہوتا ہے کہ انہوں نے جرمنی پہنچ کر جہاں ایک طرف جرمن زبان وادب سے آشنائی
حاصل کی وہیں دوسری طرف انہوں نے اردو زبان وادب سے طویل عرصے تک لاتعلقی
بھی اختیار کرلی۔ وہ لکھتے ہیں "چنانچہ میں نے جرمن ادب کا مطالعہ شروع کردیا اور اپنے
آپ سے یہ عہد کرلیا کہ دس برس تک افسانہ نہیں لکھوں گا" (زرد ستارہ ص ۸۲)

کیا منیر الدین احمد کا یہ خیال تھا کہ جرمن زبان ثقافت اور ادب کو
سیکھنے، سمجھنے اور اس پر قدرت حاصل کرنے کے لئے ان میں چند سالوں کے
لیے ڈوب جانا ضروری تھا یا انہیں یہ ڈر تھا کہ اردو زبان وادب اور ان کی
مشرقی روایات انہیں مغربی زندگی اور ادب کو سمجھنے کی راہ میں پاؤں کی زنجیر

بن جائیں گے یا کوئی اور وجہ تھی۔ بہر حال کسی ادیب کا یہ غیر معمولی قدم اٹھانا اپنی کوکھ میں بہت سے اہم سوالات لیے ہوئے ہے جو اس کے قارئین کو سوچنے پر اکساتا ہے۔

برس ہا برس کی ادبی خاموشی کے بعد جب منیر الدین احمد نے دوبارہ ادبی سفر کا آغاز کیا تو ان کا پہلا پڑاؤ تراجم تھا۔ انہوں نے برسوں کی جانگسل ریاضت سے جرمن ادب کا اتنا مطالعہ کر لیا تھا کہ انہوں نے جرمن ادب کو اردو میں ڈھالنا شروع کر دیا اس طرح انہوں نے اردو ادب کو تراجم کے ڈھیر سارے تحفے عطا کیے جن پر اردو زبان اور منیر الدین احمد دونوں بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

تراجم کرتے کرتے منیر الدین احمد کے دل میں چھپا ہوا تخلیق کار جس نے مدتوں پہلے پاکستان میں خوبصورت افسانے تخلیق کیے تھے دوبارہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا جس سے ثابت ہو گیا کہ وہ فنکار صرف سو رہا تھا مرا نہیں تھا۔ لیکن جب وہ فنکار بیدار ہوا اور اس نے اپنا تخلیقی اظہار شروع کیا تو اسے احساس ہوا کہ مغرب کی زندگی نے اس کی سوچ، اس کی طرزِ زندگی اور اس کا ادبی ذوق ہی نہیں اس کا پیرایۂ اظہار ہی بدل کر رکھ دیا تھا اور وہ اردو بھی جرمنوں کے انداز میں لکھنے لگ گیا تھا۔ اس لیے جب اس فنکار نے دوبارہ افسانے لکھنے شروع کیے تو ان افسانوں کی شخصیت اور مزاج اس کے پہلے دور کے افسانوں سے ہی نہیں ان افسانہ نگاروں سے بھی بہت مختلف تھے۔ جو پاکستان اور ہندوستان میں افسانے لکھ رہے تھے۔ وہ فنکار جب بیدار ہوا تو اس نے خود کو ''ہجری ادب'' کے خالقوں کی صف میں کھڑا پایا۔

منیر الدین احمد نے اب تک اپنے افسانوں کو دو کتابوں کی صورت میں شائع کیا ہے۔ 'زرد ستارہ' میں ۱۹۷۹ سے ۱۹۸۶ تک کے گیارہ افسانے اور 'شجر ممنوعہ' میں ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۱ء تک کے چودہ افسانے شامل ہیں (میں نے اس میں پاکستان میں لکھا ہوا افسانہ، نظمانے اور نثرانے شامل نہیں کیے کیونکہ وہ

علیحدہ توجہ کے طالب ہیں) اس طرح ان دو کتابوں میں بارہ سالوں میں تحریر کردہ پچیس افسانے شامل ہیں جب ہم ان افسانوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بہت سے ایسے پہلو نظر آتے ہیں جو منیر الدین احمد کو باقی افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتے ہیں میں اس مضمون میں ان میں سے چند ایک کی نشاندہی کروں گا۔

سفرناموں کے رنگ

منیر الدین احمد کے اکثر افسانے سفرناموں کے طور پر لکھے گئے ہیں۔ اس لیے ان میں سفر نامے اور افسانے دونوں کے رنگ گھل مل گئے ہیں۔ اسی لیے ان کہانیوں میں جگہ جگہ ہمارا واسطہ ہوائی اڈوں، ہوائی جہازوں، کاروں، ہائی ویز، چج ہائیکز، تاریخی عمارات، ٹورسٹ گائیڈز، مسافر خانوں، یوتھ ہوسٹلوں اور ہوٹلوں سے پڑتا ہے۔ ان کہانیوں میں سفر زندگی کا استعارہ بن جاتا ہے۔ افسانہ سفر کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا ہے اور اس کے اختتام کے ساتھ ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے افسانے لکھنے کا یہ انداز ہمیں اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے ہاں اتنا واضح اور تواتر کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ ویسے ہمیں ایسے سفرنامہ نگار ضرور ملیں گے جنہوں نے اپنے سفرناموں میں افسانوں کی چاشنی شامل کرنے کی کوشش کی ہے)

منیرِ الدین احمد کے بہت سے افسانوں میں پہلے پیراگراف سے ہی سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔

''مجھے جرمنی میں رہتے ہوئے ڈیڑھ برس ہو چکا تھا مگر میں نے اس وقت تک ہمبرگ اور لیوبک کے سوا اس ملک کا کوئی تیسرا شہر نہیں دیکھا تھا۔ ایسٹر کی چھٹیاں آئیں تو میں نے ہنوور جانے کا پروگرام بنایا جو ہمبرگ سے ڈیڑھ سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے چونکہ میرے پاس فالتو پیسے بالکل نہ تھے جو ریل گاڑی کے ٹکٹ اور ہوٹل کے قیام پر خرچ کیے جاسکتے ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ سفر آٹو اسٹاپ کے ذریعے کروں گا اور ہنوور میں یوتھ ہوسٹل میں جاکر

ٹھہروں گا جس کا کرایہ برائے نام ہوتا ہے"

(ہنوور کا سفر ص ۹۶)

"وہ میرا انگلستان کا پہلا سفر تھا......

(رتے کنویں کے سائے میں زندگی ص ۱۷۱)

"ہوائی جہاز میں کھڑکی والی سیٹ میرے حصے میں آئی تھی......"

(جولیا جولیا ص ۴۵)

"ہماری جنوبی چلی کی سیاحت کا آخری مقام انکوو تھا جو جزیرہ چلوے پر واقع ہے"

(تیسری زندگی ص ۳۸)

"ریل گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے میں نے سوچا کہ ڈائننگ کار میں بیٹھا جائے اور وہیں پہ شام کا کھانا کھایا جائے"

(انتالیسویں عورت ص ۱۶)

"وہ ہمارا یوگوسلاویہ کا پہلا سفر تھا......"

(سمندر کی موت ص ۱۷)

"ڈیلفی ہمارے یونان کے سفر کا آخری پڑاؤ تھا......"

(زرد ستارہ ص ۲۷)

جب منیر الدین احمد اپنے افسانوں میں اپنے قاری کو لے کر سفر پر نکلتے ہیں تو ان کا تعارف نئے شہروں، نئے ملکوں، نئی زبانوں، نئے رسم و رواج، نئی روایتوں اور نئی تاریخی عمارات سے ہوتا ہے۔ یہ تجربات جہاں منیر الدین احمد کی شوقِ آوارگی کی پیاس بجھاتے ہیں وہیں ان کا ذکر قاری کی پیاس کو بڑھاتا ہے اور وہ افسانے کے کرداروں سے بالواسطہ ان تجربات سے محظوظ ہوتا ہے ان افسانوں میں کئی جگہ منیر الدین احمد ٹور گائیڈ کا کردار تخلیق کرتے ہیں اور بعض جگہ خود ہی گائیڈ بن جاتے ہیں۔

"کولمبس ہندوستان کا بحری رستہ تلاش کرنے کی خاطر سیو بیا سے روانہ

ہوا تھا اور وہیں پر لوٹ کے آیا تھا۔ مگر مراوہ دلاد ولید کے شہر میں تھا۔ تین برس کے بعد اس کی لاش کو قبر سے نکال کر کوئیو اسی لایا گیا جہاں سے مزید تیس برس کے بعد جزیرہ ہائیٹی کے شہر سانتو دومینگو میں لے جاکے دفن کیا گیا۔ جب فرانسیسیوں نے ۱۷۹۵ء میں ہائیٹی پر قبضہ کیا تو ہسپانوی کولمبس کی لاش کو کیوبا لے گئے اور وہاں پر جاکر دفن کیا اور جب کیوبا ۱۸۹۸ء میں ان کے ہاتھ سے جاتا رہا تو وہ کولمبس کی لاش کو اپنے ساتھ لے گئے اور اسے سیوبیا کے CA-THEDRAL میں جاکر دفنایا البتہ تاریخ والوں کا کہنا ہے کہ کولمبس کے مقبرے میں ہی اس کے بیٹے اور پوتے کو بھی دفن کیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے خیال کیا جاتا ہے کہ تینوں کی ہڈیاں آپس میں گڈمڈ ہوگئی تھیں۔

(کیتھی چن ص ۵۹)

''مراکش میں جامع الفضاء نامی میدان میں ہر روز پچھلے پہر ہزاروں انسانوں کا جمگھٹا ہوتا ہے .... مراکو کا شمار عرب ممالک میں ہوتا ہے مگر لوگوں کے حذوخال کا جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ بہتوں کے آباواجداد حبشی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بربری نسل کے لوگ بھی اپنے بدن کی بناوٹ اور قدوقامت سے پہچانے جاتے ہیں۔ کہنے کو تو اس ملک میں رنگ و نسل کی تمیز موجود نہیں۔ مگر عربوں کا افریقیوں سے اور ان دونوں کا بربروں سے نمایاں تعارف اس دعوئ کی تصدیق نہیں کرتا''

(جنم جنم کا ساتھ ص ۱۳۹)

''صدیوں تک یورپ میں رہنے کے باوجود ان لوگوں نے اپنی مادری زبان کو برقرار رکھا ہے اور آج بھی سپین کا جپسی مشرقی یورپ کے جپسیوں کے ساتھ اس زبان میں بات چیت کر سکتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے طور اطوار کو نہیں بدلا۔ ان کی برادری کا نظام بدستور قائم ہے ان کا اپنا بادشاہ ہوتا ہے، سردار ہوتے ہیں۔ وہ کسی ملک کے قوانین کو نہیں مانتے ۔ کسی ملک کی شہریت حاصل نہیں کرتے۔ انہیں علم نہیں ہے کہ ان کے آباواجداد کہاں سے چلے تھے

اور کیوں انہوں نے اپنے وطن کو خیر باد کہا تھا............ جپسی قوم نے ہزار ہا سال سے اپنا علیحدہ تشخص قائم کر رکھا ہے اس کے باوجود آج اسے بہ طور قوم کے کسی ملک نے تسلیم نہیں کیا۔ ان کو دنیا کے کسی خطے میں وطن کے حقوق نہیں دیے گئے۔ نہ ہی ان کے رسوم و رواج یا ان کی زبان کے تحفظ کے لیے کوئی اقدامات اٹھائے گئے ہیں۔ اگر جپسی شہروں میں جاکر آباد ہو گئے ہوتے تو دوسری تیسری نسل تک ان کا تشخص ختم ہو کے رہ جاتا ان کی زبان مٹ جاتی ان کے رسوم و رواج کا خاتمہ ہو جاتا اور شاید دوسری قوموں کے ساتھ شادی بیاہ کے نتیجے میں اس قدر مل جل جاتے کہ ان کا نام و نشان تک جاتا رہتا۔''
(کیتھی چن ص ۶۱)

چونکہ منیرالدین احمد اسلامی تاریخ کے استاد ہیں اور عربی زبان سے خاص تعلق رکھتے ہیں اس لیے افسانوں کے دوران بعض ناموں کا ماخذ اور تاریخی پس منظر بھی پیش کرتے ہیں۔

''میں دوسرے روز رات کی گاڑی سے سیویا جارہا تھا (جس کا نام عربوں کے زمانے میں اشبیلیہ تھا) کیتھی میری ہمراہی کے لیے تیار ہو گئی''
(کیتھی چن ص ۵۵)

''جب میں دوپہر کے بعد ہوٹل میں سامان لینے کے لیے پہنچا تو کیتھی جاچکی تھی آدھ گھنٹے کے بعد میں کوردوبا (جس کا عربی نام قرطبہ تھا) جانے والی بس میں بیٹھا تھا'' (کیتھی چن ص ۶۷)

بعض دفعہ ایسے جملے فن کی خوبصورت بنت کی پوشاک پر علمیت کے پیوند محسوس ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ مختصر اور معلوماتی ہوتے ہیں اس لیے زیادہ برے نہیں لگتے۔

منیرالدین احمد اپنے افسانوں میں چونکہ دوسرے ممالک کے مسافروں، ٹورسٹوں اور سیاحوں سے بھی ملتے ہیں اس لیے ان کی عادات و اطوار پر بھی تبصرے کرتے ہیں۔

''امریکن یوں بھی سفروں پر ہر اس جگہ پر جاتے ہیں جو ان کی گائیڈ بک کے کہنے کے مطابق شہرت کی حامل ہوتی ہے اور ہر وہ کام کرتے ہیں جن کا مشورہ انہیں ان کی گائیڈ بک دیتی ہے کیتھی اب اس بات پر مصر تھی کہ شو کے بعد تھیٹر کی بار کو اپنی حاضری سے نوازا جائے۔''

(کیتھی چن ص ۶۴)

منیرالدین احمد کے افسانوں میں ان کے سفر کے واقعات کو پڑھتے ہوئے جہاں ہم ان کے تفریحی اور رومانوی پہلو سے محظوظ ہوتے ہیں اور ان کی تاریخی اور جغرافیائی معلومات سے اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں وہیں ہم ان کی معاشرتی اور سیاسی مسائل کی طرف نشاندہی اور ان کی بصیرتوں سے ان موضوعات پر سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں منیرالدین احمد کے افسانے ایک سنجیدہ موڑ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک اچھی مثال ہمیں ان کے افسانوں ''اسمگلر'' اور ''سمندر کی موت'' میں ملتی ہے۔ جن میں مچھیروں کے گاؤں کی تبدیلیوں اور سمندر میں آباد زندگی پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا ہے اور ہماری توجہ اس طرف مبذول کروائی گئی ہے کہ کس طرح بین الاقوامی سازشوں نے دیہاتوں کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے اور ہمارے ماحول کو جس میں سمندر، مچھلیاں، پرندے سبھی شامل ہیں زہر آلود کر دیا ہے۔

''تم اگر اب وہاں جاؤ تو ہمارے گاؤں کو نہ پہچان سکو گے وہ گاؤں نہیں رہا ٹورسٹوں کا مرکز بن چکا ہے البتہ دو چار مچھیرے اب بھی وہاں پر رہتے ہیں۔ بلدیہ کی طرف سے انہیں خاص پنشن دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیشہ ترک کر کے کوئی اور کام نہ شروع کر دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ہم ٹورسٹوں کو بھلا کیسے مچھیروں کے گاؤں میں آنے کی دعوت دے سکتے ہیں'' (اسمگلر، ص ۴۶)

''مجھے علم تھا کہ چپ کی اس دیوار کو توڑنا آسان کام نہ تھا...... بلاٹ نے بعد میں اقرار کر لیا کہ ہمارا شبہ درست تھا۔ مچھلیاں سمندر میں عرصہ ہوا نہ پائی جاتی تھیں۔ اس لیے اس کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی رات کے پچھلے پہر مچھلیاں پانی

میں ڈالنے کی، جنہیں ٹورسٹ اگلی صبح تلاش کرتے تھے اور یہ کہ مچھیروں کو مچھلیاں حکومت کا جہاز لاکر دیتا تھا۔ جنہیں دور دراز کے سمندر سے پکڑ کر لایا جاتا تھا یہ سارا ناٹک ٹورسٹوں کی خاطر کھیلا جاتا تھا.............. "سچی بات یہ ہے کہ ہمارے سمندر کی موت وقوع میں آچکی ہے" ڈراکو کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے "تمہیں یاد ہوگا کہ میں اسی دن سے ڈرایا کرتا تھا جب مچھلیاں مر جائیں گی"............. "آخر فرانسیسی فارن لجین میں رہ چکا ہوں۔ میں نے اپنے بیٹے کی مدد سے سارے کنستروں کو اٹلی کی حدود کے اندر پہنچایا اور وہاں کے اخباروں میں خبر چھپوادی۔ باقی کا کام وہاں کے رپورٹروں اور صحافیوں نے کیا۔ انہوں نے اسی جہاز کو ڈھونڈ نکالا جو ان کنستروں کو فرانس سے لاکر یوگو سلاویہ کی حدود کے اندر سمندر میں ڈال گیا تھا۔ کنستروں میں ایٹمی پلانٹ کا تابکار مادہ تھا"

(سمندر کی موت ص ۲۶)

ان افسانوں سے ہمیں منیرالدین احمد کے اپنے ماحول کے بارے میں حساس دل اور تدبر کرنے والے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے وہ ماحول جس کے مستقبل کے ساتھ پوری انسانیت کا مستقبل وابستہ ہے۔ منیرالدین احمد نے اپنے افسانوں میں ان مسائل کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔

نسوانی کردار

منیرالدین احمد کے افسانوں کا ایک اور دلچسپ اور فکر انگیز پہلو ان کے نسوانی کردار ہیں۔ ویسے تو ان کرداروں اور ان کی شخصیات کے بہت سے پہلو ہیں لیکن میں اس مضمون کی طوالت اور اپنی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے چار پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز کروں گا۔

رومانوی پہلو

منیرالدین احمد کے افسانوں کے نسوانی کرداروں کا ایک پہلو رومانوی ہے۔ افسانوں کے ہیرو کو سفر کے دوران ضرور کوئی نہ کوئی ایسی عورت مل

جاتی ہے جو ہیرو کو دلچسپ پاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے اتنا متاثر ہوتے ہیں کہ کچھ وقت اکٹھے گزارنے کا فیصلہ کرتے ہیں یہ رشتہ گھنٹوں اور دنوں میں اجنبیت سے قربت کے مراحل طے کرتا ہے اور جلد ہی دونوں کردار رومانس اور جنسی کشش سے مسحور ہو جاتے ہیں اور اکثر اوقات راتیں اکٹھے گزارنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ ایسے نسوانی کرداروں میں ایک معصوم فلرٹیشن پائی جاتی ہے اور وہ نوجوانی کی زندگی میں اپنے لاابالی پن کا اظہار کرتے ہیں وہ زندگی اور رشتوں سے خوشیوں کی شراب کشید کرنا چاہتے ہیں اور شادی اور کمٹمنٹ کے جھگڑوں میں الجھے بغیر مردوں کی قربت سے مخمور ہونا پسند کرتے ہیں۔ ایسے کردار اکثر اوقات سفر کے اختتام پر وعدۂ فردا کیے بغیر رخصت ہو جاتے ہیں اور افسانوں کا ہیرو گھر لوٹ آتا ہے۔

اکثر اوقات ایسے نسوانی کرداروں سے قاری کی ملاقات افسانے کے بہت آغاز میں ہی ہو جاتی ہے اور منیرالدین احمد ان سے ہمارا تعارف ان کے سراپا کے بیان سے کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''بیگانگی کی یخ'' ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے ''اس روز ریستوران خلافِ معمول آدھا خالی تھا۔ اکثر میزوں پر اکیلے دکیلے لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان میں ایک بے حد موہنی صورت والی لڑکی بھی شامل تھی جو یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے آرڈر دیے جانے کے بعد مال کی وصولی کے لیے گاہک نہ آیا ہو''۔

یا 'کیتھی چن' میں نازنین سے ہمارا اس طرح تعارف ہوتا ہے'' میں نے ترجمہ کرتے ہوئے اپنی ہم کلام کی طرف دیکھا تو میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اتنی خوبصورت چینی لڑکی میں نے عمر بھر نہ دیکھی تھی۔ کھلتا ہوا سفید رنگ، کالے بال، لمبا قد، پیٹھ پر سامان کا بقچہ باندھے اور ہاتھ میں گائیڈ بک پکڑے ہوئے میرے پہلو میں ایک ملکہ حسن کھڑی تھی۔''

اور بعض دفعہ جونہی تنہا مسافر کے دل میں شریکِ سفر کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہیں سے ایک دخترِ خوش گل نمودار ہو جاتی ہے۔

"ریڈیو پر فوک لور کا پروگرام نشر ہو رہا تھا میں اپنے آپ سے مطمئن اور دنیا جہان سے خوش تھا اگر کسی چیز کی کمی تھی تو ایک ہمسفر کی"۔

"کیا خوب ہو اگر کوئی موہنی سی صورت والی لڑکی ہچ ہائی کنگ کرتی ہوئی مل جائے" میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔

"قدرت خدا کی دیکھیں کہ وہ لڑکی بھی آن نکلی ایک پٹرول پمپ سے کار میں پٹرول ڈلوانے کے بعد سڑک پر مڑنے والا ہی تھا کہ ایک لڑکی نے ساتھ لیے جانے کے لئے اشارہ کیا۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں"

(سمگلر ص ۴۷)

وہ اجنبی دوشیزائیں جو اتفاقاً سفر کے دوران مل جاتی ہیں وہ بے تکلف ہونے میں دیر نہیں لگاتیں اور چند ہی گھنٹوں میں اجنبیت سے آشنائی کی بہت سی منزلیں طے کر لیتی ہیں۔

"حسنِ اتفاق سے طیارے میں لڑکی کی نشست میرے پہلو میں تھی اس نے خود ہی مجھ سے گفتگو کا آغاز کیا بلکہ آگے پیچھے کے سارے راز کھول دیے۔"

(مبروک مبروک ص ۱۱۲)

"کیتھی کے مل جانے کے بعد کھنڈرات میں مارے مارے پھرنے میں بھلا کیا تک تھی۔ میں نے کافی ہاؤس چلنے کی تجویز پیش کی۔ کیتھی نے گرم جوشی سے اس تجویز پر صاد کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی کہیں بیٹھنے کے لیے کوئی بہانہ تلاش کر رہی تھی"

"میں دوسرے روز رات کی گاڑی سے سیو بیا جا رہا تھا.......... کیتھی میری ہمراہی کے لیے تیار ہو گئی۔ (کیتھی چن ص ۵۵)

اور پھر اس آشنائی کو رومانس اور پھر جنسی تعلقات میں منتقل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ افسانوں کا ہیرو اس حوالے سے کافی خوش قسمت (Gets Lucky) ثابت ہوتا ہے۔

"مجھے شرارت سوجھی اور میں نے کہا "کسی چینی لڑکی کی بوسہ دینے کی حسرت البتہ آج تک میرے دل میں دفن ہے۔"

کیتھی نے مسکرا کر اپنے پھول جیسے گال مجھے بوسے دینے کے لیے پیش کر دیے۔" ....

ہوٹل کے کونٹر پر ایک نوجوان نے جمائیاں لیتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔

"کیتھی پیسے بچائے جائیں یا الگ الگ کمرہ لیا جائے؟" میں ڈبل روم لینے سے قبل اس کی اجازت لینی چاہتی تھی۔

"پیسے بچاؤ الگ الگ کمرے ہم ساری عمر لیتے رہیں گے "کیتھی کے چہرے پر ایک شریر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی" (کیتھی چن ص ۵۸)

"لیکچر کے دوران یونیورسٹی کی خوبصورت ترین لڑکی میرے پہلو میں بیٹھی تھی.......... اس سبز آنکھوں والی لڑکی کو میں نے صرف ایک روز قبل پہلی بار دیکھا تھا .... جب ہم لیکچر کے بعد باہر نکلے تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے.......... میں نے کہا اتنی سردی تو ابھی سائبیریا میں بھی نہیں پڑی کہ فر کا اوور کوٹ پہنا جا سکے۔"

"باہر کی ٹھنڈ کی مجھے فکر نہیں۔ میں تو اندر کی سردی سے بچنے کے لئے اوور کوٹ پہنتی ہوں۔"

"اندرونی سردی کا علاج فر کا کوٹ نہیں، بلکہ اسکاچ وہسکی ہے تمہیں اندر سے گرم کرنا پڑے گا۔"

آسٹہ کے کنارے چلتے ہوئے میں نے بریگیٹ کو پہلی بار بوسا دیا تھا کہنے لگی "اسکاچ وہسکی کی بجائے اندرونی ٹھنڈ کو دور کرنے کا یہ زیادہ موثر طریقہ ہے۔" (جہنم کے نو ماہ ص ۱۱۸)

افسانوں کے بہت سے نسوانی کردار جو حسنِ اتفاق سے ملتے ہیں۔ وہ ایسے ہی اتفاقاً کسی اور موڑ پر جدا ہو جاتے ہیں۔

''ہیروئن کو تلف کرنے کے بعد میں نے ایوڈن کا سامان کار میں سے اتار کر سڑک پر رکھ دیا اور اسے وہاں کھڑا چھوڑ کر اکیلا روانہ ہو گیا۔''

(سمگلر ص ۵۲)

کیونکہ ان رشتوں کے درپردہ جو اصول کار فرما ہوتا ہے وہ کچھ یوں ہے:

''کیتھی نے مجھے یاد دلایا کہ ہم نے ایک دوسرے سے طولیدو میں طے کیا تھا کہ جب بھی ہمارا ایک دوسرے سے دل بھر جائے گا ہم جدا ہو جائیں گے۔''

(کیتھی چن ص ٦٦)

لیکن بعض دفعہ ایک سفر میں ملی ہوئی دوشیزہ دوسرے سفر میں نمودار ہو جاتی ہے۔

''مجھے وہ لڑکی ایک سابقہ سفر کے دوران ملی تھی۔'' اور کبھی کبھار یہ رشتے برس ہا برس تک چلتے ہیں۔ (مبروک مبروک ص ۱۱۱)

''ساتھ کے کونٹر پر ایک عورت فرانسیسی اور عربی کی کھچڑی بنانے میں مصروف تھی۔ میرے رخ موڑتے ہی وہ بھی میری طرف متوجہ ہوئی اور جیسے بجلی کی کوند کی طرح۔ میں نے اسے اور اس نے مجھے پہچان لیا دوسرے ہی لمحے باربرا میرے بازوؤں میں تھی خوشی کے مارے اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ وہ ویسے ہی پیاری لگ رہی تھی جیسے میں نے اسے اپنی یادداشت میں محفوظ کر رکھا تھا اگرچہ ہمیں ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے بیس برس بیت چکے تھے۔''

اور ان رومانوی رشتوں میں صرف ایک موقع ایسا آتا ہے جب دو نوجوانوں کی محبت ایک بیٹی کا روپ دھارتی ہے لیکن وہ بھی ایک طویل عرصے تک صیغۂ راز میں رہتی ہے

''باربرا یہ تو تمہاری اصل کاپی ہے'' بے اختیار میرے منہ سے نکل

گیا

"ہاں اصل کاپی کا نام نطالی ہے اور یہ تمہاری بیٹی ہے۔"

(جنم جنم کا ساتھ ص ۱۵۷)

منیر الدین احمد کے افسانوں کے رومانوی رشتوں میں ایک خاص قسم کی تازگی، معصومیت، بے تکلفی اور حیرت ملتی ہے جو نوجوانی کی زندگی کی آزاد خیالی اور رومان پسندی کا حصہ ہیں اور مغربی معاشرت کا خاصہ۔ منیر الدین احمد نے ان رشتوں کی دل پذیر انداز میں عکاسی کی ہے۔

بازاری پہلو

ان افسانوں کے نسوانی کرداروں کا دوسرا پہلو وہ ہے جہاں وہ طوائف یا رنڈیوں کے بازار میں بسنے والی یا ایک کال گرل کے طور پر سامنے آتی ہیں۔

"اس لیے جب بھی کوئی عورت ٹیلی فون پر بات کرتی تھی تو خیال گزرتا تھا کہ آواز پاولا کی ہی تھی مگر جب میں تفصیلات پوچھتا تھا تو ان محترمہ کا تعلق بھی دنیا کے قدیم ترین پیشے سے نکلتا تھا۔ بعض مہم جو خواتین تو سیدھی میرے ہوٹل میں پہنچ گئیں اور ان سے جان چھڑانی مشکل ہوگئی۔"

(اسمگلر ص ۴۴)

"مگر میری توقع کے الٹ اس نے جو پہلی بات کہی وہ یہ تھی کہ اس نے مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا کہ میں اس کا پرانا واقف کار عبداللہ تھا جس کے ساتھ اس کی ملاقات کئی سال ادھر ہمبرگ کے بیسواؤں کے بازار ریپر باہن میں ہوئی تھی۔"

(ہنوورکا سفر ص ۱۰۳)

"لگتا تھا کہ اس کے رات کے ٹھکانے کی فکر مجھے اس سے زیادہ لگی ہوئی تھی اسی وجہ سے وہ میرا مذاق اڑانے لگی۔ پھر وہ یکدم سنجیدہ ہوگئی اور کہنے لگی کہ وہ کسی بھی شراب خانے میں جاکر کسی بھی مرد کی گود میں بیٹھ سکتی ہے۔ بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے اس موضوع کو چھوڑ دیا۔"

(ہنوور کا سفر ص ۱۰۸)

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ان افسانوں کا مرد ہیرو جو بنیادی طور پر آزاد خیال انسان ہے اور رومانوی اور جنسی آزادی پر اور عورت کی قربت سے لطف اندوز ہونے پر ایمان رکھتا ہے جب کسی طوائف یا کال گرل سے ملتا ہے تو دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے وہ نہ تو اس کے ساتھ جنسی طور پر ملوث ہوتا ہے نہ ہی پوری طرح قطعِ تعلق کرتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ وقت تو گزارتا ہے لیکن ایک دوست کی حیثیت سے ایک عاشق کی حیثیت سے نہیں۔

"وہ مجھے یوتھ ہوسٹل کے گیٹ پر چھوڑ کر جانے لگی تو مجھے اس پر بے حد پیار آیا۔ اس روز تک میں سمجھتا آیا تھا کہ بیسواؤں کے سینے میں دل نہیں ہوتا جبکہ ریناٹے نے سارا دن ایک اجنبی کے ساتھ گزار دیا تھا اور وہ تہوار کا دن تھا۔ میں نے سارے دن کے دوران اس کو ایک بوسہ تک نہ دیا تھا۔ رخصت کے وقت میں نے اس کے گال چوم لیے۔"

(ہنوور کا سفر ص ۱۰۹)

میں ابھی بمشکل بیس قدم گیا ہوں گا کہ وہ لڑکی اندھیرے میں سے برآمد ہوئی اور میرے برابر چلنے لگی۔ بلب کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کا ناک نقشہ بہت دلکش لگ رہا تھا۔ میں نے زندگی میں رنڈیاں تو بہت دیکھی ہیں مگر اس جیسی خوش شکل عورت اس پیشے سے متعلق میری نظر سے نہ گزری تھی۔

چلو گے میرے ساتھ؟" لڑکی نے پوچھا

"کہاں؟"

"یہاں قریب ہی ایک ہوٹل میں، کل بیس بر لگیں گے۔ میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"ناں بی بی مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے اتنی عمدہ انگریزی کہاں پر سیکھی۔" ....

"میں نے اویلس ابابا کی یونی ورسٹی سے گریجوئشن کر رکھی ہے۔"

"اور اس کے باوجود تم اسی پیشے کو اختیار کیے ہوئے ہو۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں یہاں کے حالات سے واقفیت نہیں ہے......

اس شام کے بعد ہمارا روز کا معمول بن گیا کہ فاطمہ شام کے آٹھ بجے میرے ہوٹل کے دروازے پر آجاتی تھی اور ہم گھنٹہ بھر، بعض اوقات دو دو گھنٹوں تک ہوٹل کی قریبی سڑکوں پر گھومتے اور دنیا جہاں کی باتیں کرتے تھے"

جب ہم منیرالدین احمد کو ایک طوائف کی روح میں جھانک کر عورت کی ذات کو تلاش کرتے دیکھتے ہیں تو ہمیں منٹو کی بہت یاد آتی ہے فرق یہ ہے کہ منٹو کے ہیرو تماشا بننے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے البتہ منیرالدین احمد کے ہیرو بہت آگے تک جاتے ہوئے گھبراتے ہیں

نفسیاتی پہلو

ان افسانوں کے نسوانی کرداروں کا تیسرا پہلو نفسیاتی ہے منیرالدین احمد کی کہانیوں کے کئی کردار نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں ان کے لاشعوری تضادات قدم قدم پر ان کی زندگیوں میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں، ان کے رومانوی رشتوں کو متاثر کرتے ہیں اور بعض دفعہ دھیرے دھیرے ان کے جیون میں زہر گھولتے رہتے ہیں۔ یہ کردار اپنی زندگی کو حتی الامکان نارمل بنانے کے لئے بعض دفعہ لاشعور میں دھکیل دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بسا اوقات وہ برسوں کی اذیت کے بعد ایک تشدد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان مسائل میں سے ایک مسئلہ بعض عورتوں کا بچپن میں مردوں کی جنسی ہوس کا نشانہ بننے سے پیدا ہوتا ہے اور بعد میں نفسیاتی مسائل اتنی شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ ان عورتوں کے لیے زندگی گزارنا اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ان مسائل کا حل یا تو خودکشی یا قتل میں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہیں۔

ان مسائل کی چند جھلکیاں ہمیں منیرالدین احمد کے دو افسانوں "بھنور

کا سفر'' اور ''جہنم کے نو ماہ'' میں واضح طور پر ملتی ہیں۔

''اس نے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے باپ کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ جب اس کے اشارے سے بھی بات میرے پلے نہ پڑی تو اسے کھل کے بتانا پڑا کہ اس کے باپ کی خواہشات جنسی تھیں اور یہ کہ وہ اس کی زندگی کا پہلا مرد بن کے آیا تھا۔ اس کی ماں کو اس بات کا پتہ تھا مگر وہ ریناٹے کی مدد کرنے کے قابل نہ تھی۔ ریناٹے کا باپ بے تحاشہ شراب پیتا تھا اور نشے میں اس کی ماں کو مارا بھی کرتا تھا۔ اس نے اسے دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر اس نے پولیس کے پاس رپورٹ کی تو وہ اسے جان سے مار دے گا'' .... ''بالآخر ریناٹے کو ماننتے ہی بنی کہ اس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔''

(ہنوور کا سفر ص ۱۰۵، ۱۰۷)

منیرالدین احمد کے افسانوں کا یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ جب ان کے نسوانی کردار اپنے نفسیاتی مسائل کا اظہار کرتے ہیں تو افسانوں کا ہیرو ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ یا تو خود ایک ماہر نفسیات کا کردار ادا کرنا شروع کر دیتا ہے اور یا انہیں کسی نفسیاتی معالج سے رجوع کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

''وہ پہلی بار نہ تھی البتہ اپنی مرضی سے میں پہلی بار فرانس میں بیتائیل کے ساتھ سوئی تھی دراصل میں بارہ برس کی عمر میں ماں کے ایک دوست کی ہوس کا شکار بنی تھی اس نے مجھے دھمکایا تھا کہ ماں کو نہ بتانا ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ مگر خون بند ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ اس قدر درد ہو رہا تھا کہ میری برداشت سے باہر تھا۔ جب ماں گھر آئی تو اس کا دوست جا چکا تھا۔ ماں نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو غصے سے پاگل سی ہو گئی۔ مجھے گلے سے لگا کر روتی رہی تھی۔ وہ پہلا اور آخری موقعہ تھا کہ میں نے ماں کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔''

"اس قسم کے واقعات کے نتیجے میں اکثر گہری نفسیاتی الجھنیں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔" میں نے اپنی معلومات کا رعب جمانے کے لیے کہا۔

"میری اندرونی سردی اگر نفسیاتی الجھن نہیں تو آخر کیا ہے؟"

"تمہیں علم نفسیات کے کسی ماہر سے مشورہ چاہئے ہو سکتا ہے تم محض وہم کا شکار ہو۔" ......

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ ماں کی محبت کا امتحان کرنا چاہتی تھی ہو سکتا ہے اسے ماں کی محبت کا یقین نہ ہو۔" میں از سر نو نفسیات کو بیچ میں لے آیا......

"میں اپنے دل میں تو ہمیشہ سے ہپی تھی۔ طلاق کے بعد چرس اور افیون کا استعمال بڑھتا گیا میری دوستی انہی حلقوں میں ہونے لگی جہاں سے ایسا مال خریدتی تھی مگر میں نے اپنے دل میں قسم کھالی تھی کہ کسی مرد کے ساتھ آئندہ جسمانی تعلق نہیں رکھوں گی ہپیوں کے گروہ میں دراصل ہر شخص تنہا ہے جس کا جو جی چاہے کرتا ہے۔ کوئی اسے پوچھتا نہیں نہ روکتا ہے۔ میں نے سوچا اس سے بہتر فلاسفی اور ہپیوں سے بڑھ کر رواداری مجھے کہاں مل سکتی ہے اس وجہ سے میں نے اپنی بقیہ زندگی ہپی بن کر گزارنے کا فیصلہ کیا۔"

میں نے مشورہ دیا کہ اسے کسی ماہر نفسیات کے پاس جانا چاہئے۔"

(جہنم کے نو ماہ)

ان کہانیوں کے کرداروں سے واضح ہے کہ منیر الدین احمد کی عورتوں کی نفسیات اور ان کے مسائل پر گہری نظر ہے۔ وہ پیشے کے حوالے سے ماہر نفسیات نہ سہی (اگر ہوتے بھی تو میرے خیال میں بہت کامیاب ہوتے) لیکن ایک ادیب کے ناتے انسانی نفسیات کے ماہر ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب لکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

نظریاتی پہلو

منیر الدین احمد کے افسانوں کے نسوانی کردار ایک نظریاتی پہلو بھی

رکھتے ہیں اور اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل پر سنجیدگی سے غور اور مردوں کو اپنے مسائل سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیسویں صدی میں جو معاشرتی تبدیلیاں آئی ہیں ان کی وجہ سے عورتیں دوراہے پر آکھڑی ہوئی ہیں وہ گھر کی ذمہ داری بھی محسوس کرتی ہیں، مائیں بھی بننا چاہتی ہیں لیکن ملازمت بھی کرنا چاہتی ہیں اس طرح انہیں ایسی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس دور سے پہلے ممکن نہ تھا۔ افسانوں کے نسوانی کردار ہماری توجہ ان مسائل کی طرف مبذول کرواتے ہیں۔ عورتوں کی آزادی اور خودمختاری کے سوال اٹھاتے ہیں اور معاشرے میں اپنا نیا مقام متعین کرنے کے لیے ہمدردانہ سلوک کا مطالبہ کرتے ہیں۔

''اس کا کہنا تھا کہ ایسی شادی بھی کیا ہوئی جو غلامی کے مترادف ہو۔''
(ملوک سنگھ کا پوتا ص ۷۱)

میں اسی لیے معاشرے میں تبدیلی لانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اس معاشرے میں عورتوں نے دوہرا بوجھ اٹھا رکھا ہے مرد ہیں کہ گھر آئے، بیر کی بوتل فریج میں سے نکالی اور ٹیلی ویژن کے سامنے ڈھیر ہوگئے انہیں نہ تو فکر ہے کھانا تیار کرنے کی نہ بچوں کی۔ تربیت کی یہ کام گھر کی لونڈی کسی نہ کسی طرح سے انجام دے ہی دے گی۔''..........

''میرے نزدیک اس مسئلے کا حل اتنا آسان نہیں، جتنا تم سمجھتے ہو جب تک اس معاشرے کی جڑیں نہ اکھاڑ دی جائیں اس وقت تک کسی تبدیلی کی امید رکھنی بے وقوفی کے مترادف ہے۔ ہمارا معاشرہ مردوں کے حقوق کی نگہداشت کرتا ہے مگر عورتوں کے دم قدم سے قائم ہے''..........

''رحم میرے جسم کا حصہ ہے۔ اس کو استعمال میں لانا یا نہ لانا میرا نجی معاملہ ہے۔'' (جنم جنم کا ساتھ)

منیرالدین احمد کو اندازہ ہے کہ عورتوں کے مسائل نہ حل ہونے کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ صدیوں سے مرد انفرادی اور اجتماعی طور پر

عورتوں کی زندگی کے بارے میں فیصلے کرتے آئے ہیں لیکن اب وہ وقت آگیا ہے کہ عورتیں مردوں سے کہہ سکتی ہیں۔ ''کہ آپ کی دوستی اور نیک نیتی اور کرم فرمائی اپنی جگہ لیکن ہم اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرنا چاہتی ہیں۔ اس صورتِ حال کا خوبصورت اظہار 'کیتھی چن' افسانے کے اختتام پر ملتا ہے۔

''ایکاایکی کیتھی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں حیران کہ معاملہ کیا تھا مجھے یہ علم تو تھا کہ کیتھولک چرچ اینٹی بے بی گولیوں کے استعمال سے روکتا ہے مگر آج کل کون چرچ کی باتوں پر عمل کرتا ہے۔ کیا کیتھی اس پر عمل کرتی تھی؟

''کاش میں نے اس پر عمل نہ کیا ہوتا تو آج اس مصیبت میں مبتلا نہ ہوتی جس میں پھنسی ہوئی ہوں اور فیصلہ نہیں کرپاتی'' کیتھی کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں۔

''کون سا فیصلہ؟'' مجھے اعتراف ہے کہ میں پہیلیاں بوجھنے میں کمزور ہوں۔

''یہ فیصلہ کہ مجھے وضع حمل کروانا چاہیے یا نہیں.........

''میں اگر تمہاری جگہ پر ہوں تو کبھی وضع حمل کا رستہ اختیار نہ کروں'' بے اختیار یہ فقرہ میرے منہ سے نکل گیا حالانکہ کیتھی نے مجھ سے کوئی مشورہ نہیں مانگا تھا۔ میں ایسے معاملات میں دخل دیے بغیر نہیں رہ سکتا.........

''مگر اس کا مطلب تو یہ بنتا ہے کہ مجھے بچے کی خاطر شادی کرنی پڑے گی اور میں ایک مرد کی پسند اور ناپسند اور اس کے فیصلوں کی پابند ہو کر رہ جاؤں گی'' کیتھی کی باتوں میں تلخی تھی.........

''کیتھی نے مجھے یاد دلایا کہ ہم نے ایک دوسرے سے طولیدو میں طے کیا تھا کہ جب ہمارا ایک دوسرے سے دل بھر جائے گا ہم جدا ہو جائیں گے

''کیا اس کا وقت آگیا ہے؟'' میں نے پوچھا

''ہاں مگر اس وجہ سے نہیں کہ میرا تم سے دل بھر گیا ہے بلکہ اس وجہ

سے کہ میں اپنے حمل کے بارے میں فیصلہ اکیلی کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے چونکہ علم ہے کہ تم مجھے کیا مشورہ دو گے اس لیے ہمیں ایک دوسرے سے جدائی اختیار کرنی چاہیے۔ میں نے سیلمن کا سفر بھی اس وجہ سے کیا تھا کہ عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں سے دور جاکر تن تنہا فیصلہ کروں''

مختصراً یہ کہ منیرالدین احمد کے افسانوں کے ہیرو کے عورتوں کے ساتھ تعلقات کافی پیچیدہ ہیں۔ وہ ان کے ساتھ رومانوی شامیں بھی گزارتا ہے، انکی تاریک راتوں میں جس میں وہ مردوں کی ہوس کا نشانہ بنتی ہیں ان کا ہمدرد دوست بھی بنتا ہے اور اس دن کی امید بھی رکھتی ہے جب عورتیں آزادی اور خودمختاری کی زندگی گزار سکیں گی۔ معاشرہ انہیں دوسرے درجے کا شہری نہ سمجھے گا اور مرد انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی بجائے اپنا دوست اور شریک سفر سمجھیں گے۔

منیرالدین احمد کے افسانے ان کی مغربی عورت کے مسائل سے آگہی کی پوری پوری عکاسی کرتے ہیں۔

آپ بیتی کے رنگ

منیرالدین احمد کے افسانوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں آپ بیتی کے رنگ بہت نمایاں ہیں اور اپنے بیشتر افسانوں کا ہیرو وہ خود ہوتے ہیں اور جابجا اپنی ذات، اپنی شخصیت اور اپنی طرزِ زندگی کے نقوش چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔

''میرا نام کیتھی ہے اور میں کیلیفورنیا سے آئی ہوں۔''

''مجھے منیر کہتے ہیں اور میں ہمبرگ سے ہوں'' ....

میں نے اسے بتایا کہ میں نے اپنی عمر جرمنی میں بتادی تھی مگر اندر سے بدستور پاکستانی تھا۔ (کیتھی چن)

''میں صبح کے وقت شیو کرنے اور نہانے پر بہت وقت لگاتا ہوں۔''

(کیتھی چن)

''اس نے تصویر والا صفحہ کھولا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ تصویر دس سال پرانی تھی اس زمانے میں میرے سر پر خوب گھنے بال ہوا کرتے تھے اب تو بس بالوں کا بھرم رہ گیا ہے سر آدھا گنجا ہو چکا ہے عینک بھی اب میں نئے فیشن کی لگاتا ہوں۔'' (عدل کی گرفت)

''میرا اپنا قد پانچ فٹ چھ انچ ہے جس کے سبب شمالی یورپ میں میرا شمار چھوٹے قد والوں میں ہوتا ہے مگر جب میں پرتگال میں کسی مجمع میں کھڑا ہوتا ہوں تو اکثر لوگوں کے سروں کے اوپر سے دیکھ سکتا ہوں۔''

(نروان)

''جب آدھ گھنٹے کے بعد روانگی کی خاطر میں نے کار اسٹارٹ کرنا چاہا تو دو ایک بار کسی دق زدہ مریض کی طرح کھانس کے وہ روٹھ گئی۔ میں کار چلانے کو تو بہت عرصے سے چلا رہا ہوں مگر کار خراب ہو جائے تو بالکل بے بس ہو جاتا ہوں۔'' (نروان)

''میں پارٹیوں میں جانے سے کتراتا ہوں کیوں کہ وہاں پر لوگ آپس میں محض سرسری باتیں کرتے ہیں۔ ہر کوئی بس ادھر ادھر کی ہانکتا ہے اور جونہی بات کسی قدرے سنجیدہ موضوع تک پہنچتی ہے ایکا ایکی آپ کے شریکِ گفتگو کو کوئی پرانا چہرہ نظر آجاتا ہے جس سے اسے بلا تاخیر ملنا ہوتا ہے''

(اسمگلر)

منیرالدین احمد کے افسانوں میں نہ صرف ان کی ذات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں بلکہ اس انسٹی ٹیوٹ کا ذکر بھی ملتا ہے جس میں وہ کام کرتے ہیں اور اس گھر کا بھی جس میں وہ رہتے ہیں۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ان کی بیوی اور شریکِ سفر اوتا پہلے دبے پاؤں اور پھر واضح طور پر ان کی کہانیوں میں داخل ہوئی ہیں۔

دلچسپی کی بات یہ بھی ہے کہ ان کی پہلی کتاب میں وہ اکثر تنہا سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ ان کے ساتھ ان کی بیوی ہیں لیکن وہ اپنا

تعارف تو کرواتے ہیں لیکن بیوی کے بارے میں دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔

''ہمیں آپس میں جرمن بولتے ہوئے سن کر اس نے جان لیا تھا کہ ہم جرمنی سے آئے تھے اس کے پوچھنے پر ہم نے بتایا کہ ہم ہمبرگ سے آئے تھے البتہ میں رہنے والا پاکستان کا تھا۔'' (نروان)

لیکن دوسری کتاب میں منیرالدین احمد اپنی بیوی کا ذکر نام لے کر کرتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔

''کھانا ہم نے بندرگاہ کے ایک بے حد نفیس ریستوران میں کھایا اوتا کا قیاس تھا کہ اس کے مالکان یقیناً کرسٹوف سائٹز کی آل اولاد میں سے ہوں گے''

''اوتا نے بالآخر کلاڈس سے پوچھ ہی لیا کہ کیا اس کا کرسٹو نسائٹز کی فیملی کے ساتھ کوئی تعلق تھا۔'' (تیسری زندگی)

''شجر ممنوعہ'' کے افسانوں میں ایک اور چیز جو ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے وہ یہ کہ ایک طرف تو منیرالدین اپنی خوشحالی اور آسودہ حالی کی زندگی سے خوش نظر آتے ہیں لیکن دوسری طرف اپنی زمانۂ طالب علمی میں بے سروسامانی کے عالم میں سفر کرنے کے بارے میں تھوڑے سے نوسٹلجیا کا شکار بھی نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ان کا افسانہ 'قربانی' ہے۔

''ہمیں سال بھر میں چھ ہفتوں کی چھٹیاں ہیں۔ جنہیں ہم عام طور سے تین تین ہفتوں کی دو قسطوں میں لیتے ہیں۔ سفر پر جانے سے مہینوں قبل منزل کا تعین کیا جاتا ہے۔ وہاں کے جغرافیائی اور تاریخی کوائف مہیا کیے جاتے ہیں اور اس علاقے کے سیاسی و سماجی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے اس مقصد کے لیے کتابوں، رسالوں اور سفرناموں کو کھنگالا جاتا ہے۔ اپنے جان پہچان والے لوگوں سے، جنہیں اس علاقے کے سفر کا اتفاق ہو چکا ہوتا ہے۔ کرید کرید کر سوال پوچھے جاتے ہیں'' ....

''طالب علمی کے دنوں میں سفروں پر جانے کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ دو چار قمیص اور پتلونیں باندھیں، ٹکٹ خریدنے

کے لیے پیسے ہوئے تو ٹکٹ کٹوایا، نہ ہوئے تو بیچ ہائی کنگ کرنے چل دیے۔ سفر سفر کی صرف سمت متعین ہوتی تھی۔ منزل کا انتخاب اتفاق پر چھوڑ دیا جاتا تھا سر چھپانے کے لیے کوئی نہ کوئی چھت ہمیشہ مل جاتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ جیب میں پیسوں کی کمی ہوتی تھی مگر ہمارے پاس وقت کی فراوانی ہوتی تھی عام لوگوں کی طرح ہم دو تین ہفتوں کے لیے نہیں نکلتے تھے بلکہ اکثراوقات دو تین مہینے سیر وسیاحت میں گزارتے تھے۔

مگر وہ وقت کبھی کا لد چکا ہے۔ (قربانی)

اس آخری جملے میں ایک کسک بھی ہے، ایک درد بھی، گزرے دنوں کی یاد بھی اور ایک دبی دبی خواہش بھی کہ ''کاش ایسا دوبارہ ممکن ہوتا۔''

ماضی کی طرف دیکھنے کا یہ عمل صرف سفر کی حد تک ہی نہیں ہے بلکہ منیر الدین احمد کے افسانوں میں ایک بڑے پیمانے پر در آیا ہے۔ انہوں نے تیس سال مغرب میں گزارے، تعلیم حاصل کی، شادی کی، گھر بنایا، تعلیم و تدریس میں بھرپور حصہ لیا، گھومے پھرے، مغربی معاشرت کو قریب سے دیکھااور اس معاشرے کی اپنے افسانوں میں عکاسی کی۔ ان کے شروع کے افسانوں میں (تقریباً ۱۹۸۸ء تک) ماضی کا اور مشرق کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن اب ایسا محسوس ہوتا جیسے انہوں نے اپنے بچپن، نوجوانی، خاندان، پاکستان اور مشرقی روایات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے اور اس کی جھلکیاں ان کے تازہ افسانوں میں نظر آنے لگی ہیں نگری نگری پھرنے والا مسافر تخلیقی سطح پر گھر کا رخ کرتا ہے۔ ''ملوک سنگھ کا پوتا'' ''مامی سارہ'' اور ''مرتے کنویں کے سائے میں زندگی'' اس تبدیلی کی مثالیں ہیں جو دوسرے مجموعے میں شامل ہیں۔ اس قسم کے افسانے آپ کو پہلے مجموعے میں نہیں ملیں گے۔

''۶ مارچ ۱۹۴۷ء کو میں ساری عمر نہیں بھولوں گا میں اسلامیہ ہائی اسکول مریٹر حسن میں پڑھتا تھا اور اس روز معمول کے مطابق اسکول گیا ہوا تھا گیارہ بجے کے قریب ایک استاد نے کلاس روم میں آکر اعلان کیا کہ شہر میں

ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔" (ملوک سنگھ کا پوتا)

"ہندوستان کی آزادی اور ملک کی تقسیم کے سبب حالات یکلخت بدل گئے۔ ہماری نانی، خالہ اور منجھلے ماموں مشرقی پنجاب کے ایک قصبے میں رہتے تھے جہاں پر ہمارے نانا اس صدی کی دوسری دہائی میں جاکر آباد ہو گئے تھے"......

"ملک کے بٹوارے کے اعلان کے تھوڑے دنوں کے بعد ہمیں لاہور سے ایک تار آیا جس میں یہ اطلاع تھی کہ ہمارے رشتہ دار مشرقی پنجاب سے جانیں بچاکر لاہور میں پہنچ گئے تھے اباجی نے اسی روز راولپنڈی، جہاں پر ہم رہتے تھے، کی گنگ منڈی کے ایک بیوپاری سے بات کی اور اس سے ایک ٹرک کرائے پر لینا چاہا تاکہ اپنے رشتہ داروں کو لاہور سے گاؤں پہنچایا جاسکے"

(مامی سارہ)

منیر الدین احمد جب مغرب میں تیس سال زندگی گزارنے کے بعد مشرق کا ذکر کرتے ہیں تو جہاں وہ ایک طرف اپنے ذاتی اور خاندانی ماضی اور تاریخ کا سراغ لگاتے نظر آتے ہیں وہیں وہ ان سیاسی، معاشرتی اور خاندانی روایات کو بھی تنقیدی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں ہم بغیر سوچے سمجھے نسلوں سے گلے لگائے چلے آئے ہیں۔ یہ اندازِ فکر بھی اپنی جگہ قابلِ غور ہے اور ہمیں منیر الدین کے بارے میں ہی نہیں اپنی مشرقی روایات کے بارے میں دعوتِ فکر دیتا ہے۔ اس کی عمدہ مثال 'مامی سارہ' افسانے کا اختتام ہے۔

"آخری سالوں میں ان کی آنکھیں جواب دے گئی تھیں۔ چھوٹے ماموں کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ ایک روز میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے کیوں نانی کی باتوں میں آکر مامی سارہ کو طلاق دے دی تھی۔ ماموں نے کہا کہ ماں کی فرماں برداری انسان پر فرض ہے کیوں کہ اس کے قدموں کے نیچے جنت پائی جاتی ہے۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا کہ شاید اس کے قدموں کے نیچے اگلے جہاں کی جنت پائی جاتی ہے مگر بسا اوقات اس جہاں کا جہنم بھی۔"

(مامی سارہ)

یہ تخلیقی ادب کا وہ موڑ ہے جہاں آپ بیتی اور جگ بیتی آپس میں گلے مل جاتے ہیں اور منیرالدین احمد کے اٹھائے سوال ہم سب کے سوال بن جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سمندر ہے جس میں بہت کم لوگوں کو اترنے کی ہمت ہوتی ہے۔

اختتامی تاثرات

میں ذاتی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ منیرالدین احمد اردو ادب کے ان چند خوش قسمت ادیبوں میں سے ایک ہیں جنہیں:

مغرب میں ایک طویل عرصہ رہنے کا،

مغرب کی معاشرت کو قریب سے دیکھنے کا،

دنیا کے بیشتر حصے کی سیاحت کا،

اور بین الاقوامی ادب کے مطالعے اور ترجمے کا موقع ملا اور پھر انہوں نے ان مشاہدات اور تجربات کو تخلیقی سطح پیش کر کے اردو ادب میں اضافہ کیا۔ منیرالدین احمد مغرب میں رہنے والے اردو ادیبوں کے گروہ کا ایک اہم نام ہیں اور مجھے امید ہے کہ جب اردو کے 'ہجری ادب' کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں ان کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔

میں ذاتی طور پر ان سے کئی حوالوں سے identifyاور اتفاق کرتا ہوں۔ ان کی ملاقات اور افسانوں نے میرے اپنے بہت سے خیالات کو تقویت بخشی ہے اور مجھے بہت سے نئے مسائل پر سوچنے پر مجبور کیا ہے۔

بالآخر میرا اور ان کا چودہ گھنٹوں کا ریل کا سفر بیکار نہیں گیا۔
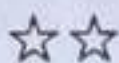
مارچ ۱۹۹۳ء

"سعید انجم

برزخ کے باسی"

(سعید انجم کی کہانیوں کے کردار)

حصہ اول...... ایک تاثر

حصہ دوئم......کرداروں کا تعارف

حصہ سوئم......کرداروں کا تجربہ

حصہ چہارم......ایک نظم

حصہ پنجم......ایک تاثر

ایک تاثر

سعید انجم کی
کہانیوں کے کردار
مشرق میں پیدا ہوئے
اور مغرب میں جا بسے
اور ساری عمر
دو تہذیبوں، دو ثقافتوں اور دو نظریوں
کی چکی میں پستے رہے
انہیں نہ مشرق راس آیا نہ مغرب
بیسویں صدی کے دیگر مہاجروں کی طرح
ان کی خوش قسمتی میں بد قسمتی
اور بد قسمتی میں خوش قسمتی
کے رنگ نمایاں رہے

وہ عمر بھر
مذہبی اور سیاسی تضادات کے پل صراط پر
شناخت کی صلیب اٹھائے
چلتے رہے
وہ لمحۂ موجود کا دکھ سہتے رہے
ان کے رشتے
ماضی سے بھی منقطع ہوگئے
مستقبل سے بھی
زمین سے بھی کٹ گئے
آسمان سے بھی
وہ دن رات
جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے رہے
اذیت ناک سوچیں سوچتے رہے
خوف اور ڈر کے سانپوں کو گلے لگاتے رہے
برزخ کے عذاب سہتے رہے
اور ایک دن
اپنی لاشیں چھوڑے
اپنے خوابوں کی تعبیریں تلاش کرنے
اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے
اور ان کے لواحقین
یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ انہیں
مشرق میں دفن کیا جائے یا مغرب میں

کرداروں کا تعارف

سعید انجم کی کہانیوں کے کرداروں نے
چند خواب وراثت میں پائے تھے
وہ خواب شجاعت کے بھی تھے، بہادری کے بھی
عزتِ نفس کے بھی تھے خودداری کے بھی
عدل کے بھی تھے، انصاف کے بھی
خدمتِ خلق کے بھی تھے، انسان دوستی کے بھی
انہیں بچپن سے ہی
اسکولوں میں
اپنے بزرگوں، اپنے غازیوں، اپنے مجاہدوں
کے نقشِ قدم پر
چلنے کی ترغیب دی گئی

"اسکول کے معائنے کے لیے انسپکٹر صاحب آ رہے تھے اور تمام طالب علم چارٹ بنا رہے تھے۔ خوش خط طالب علم تو بہت ہی مصروف تھے۔ شاہد بھی ان میں سے ایک تھا۔ اب تک اس نے محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور شیر شاہ سوری کے چارٹ بنائے تھے۔ یہ تینوں مجاہد اس کے ہیرو تھے۔ وہ محمد بن قاسم کی طرح نوعمر سپہ سالار بننا چاہتا تھا اور کسی مظلوم مسلمان لڑکی کی مدد کے لیے کسی راجہ کو شکستِ فاش دینا چاہتا تھا۔ محمود غزنوی کی طرح وہ ہندوؤں کے کسی سومناتھ پر حملے پر حملہ کرنا چاہتا تھا اور شیر شاہ سوری کی طرح لمبی سڑکیں بنا کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سرائیں بنانی چاہتا تھا تاکہ رعایا آرام سے رہے اور اسے دعائیں دے۔"

"شاباش" ماسٹر جی نے چارٹ دیکھ کر کہا (اخبار آگیا ہے)

لیکن ان خوابوں کے ساتھ ساتھ
انہوں نے
چند تضادات بھی وراثت میں پائے
وہ تضادات
مذہبی بھی تھے، سیاسی بھی
خاندانی بھی تھے، معاشرتی بھی
انفرادی بھی تھے، اجتماعی بھی
اور ان تضادات کی زنجیروں کی کھنک
مدرسوں میں بھی سنائی دیتی
گھروں میں بھی

''جی!۔ میں عربی زبان کا استاد ہوں۔ عربی میں جو ہماری مذہبی زبان ہے'' ''سبحان اللہ!''

میں نے حکم دیا۔ میری کلاس میں طاغوتی زبان نہیں چلے گی۔ ہمارے آقا کی زبان استعمال ہو گی وہ زبان جس میں اللہ تبارک تعالیٰ نے فخر دوجہان سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا۔

''صدقے یا رسول اللہ'' احمد علی نے اپنی انگلیوں کی پوریں چوم کر آنکھوں سے لگائیں۔......

''اگلے روز میں کلاس میں گیا تو آپ کا بیٹا امجد ''قومو'' کی بجائے بولا ''کھڑے ہو جاؤ''۔......

...... میرے پوچھنے پر وہ بولا کہ طاغوتی زبان میں حکم دینا واقعی غلط بات ہے لیکن ہم پاکستانی ہیں۔ ہم اپنی قومی زبان کیوں نہ استعمال کریں۔ اب احمد علی صاحب آپ خود ہی بتایئے جس قوم کو اپنی مذہبی زبان بھی نہ آتی ہو وہ بھلا

ایک قوم رہ سکتی ہے"۔

"بے شک نہیں رہ سکتی.........."

(دیکھ کبیرا ہنسا)

"امجد کے کرتوت ہی دیکھو گے کہ اس کے کارنامے بھی۔" احمد علی کی بیوی نے کہا

"کارنامے" احمد علی نے حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

"دسویں کا امتحان پاس کرنا کوئی بات ہی نہیں۔"

"دنیا کرتی ہے"

"لوگوں کے بچے پاس ہوں تو وہ مٹھائی بانٹتے ہیں آگے کا سوچتے ہیں"

"میں نے بھی سوچا تھا پیرومرشد سے بات کی ہے"

"پھر کیا بولے؟"

"کہتے ہیں لڑکے کو ان کے مدرسے میں بھیج دیں"

"مولوی بنانے کے لیے"

"عالم دین بنانے کے لیے"

"میرا لال کوئی لولا لنگڑا ہے؟ اندھا کانا ہے؟ لوگ نابینوں کو حافظ بناتے ہیں"

"تمہیں کوڑھ ہو جائے۔ تم کفر بکتی ہو"

"مجھے تو بکنے دو۔ کسی اور سے بات کی؟"

"میاں فضل دین کہتا ہے فوج میں بھرتی کرادو اور منشی شہاب کہتا ہے کالج میں داخل کرادو"

"منشی شہاب کہتا ہے اگر اب فوج میں گیا تو زیادہ سے زیادہ صوبیدار ہو جائے گا۔ بارہ جماعتیں پڑھ گیا تو کمیشن مل جائے گا کرنل جرنل ہو سکتا ہے"

بس پھر کالج میں داخل کرادو"

(دیکھ کبیرا ہنسا)

ان کرداروں کو

لڑکپن سے جوانی تک

اسکول سے کالج تک

پہنچتے پہنچتے یہ اندازہ ہو گیا کہ

وہ جس ماحول میں پل بڑھ رہے ہیں وہاں

گفتار اور کردار

قول اور فعل

نظریے اور عمل میں

کوئی ہم آہنگی نہیں

چاہے وہ والدین ہوں یا اساتذہ

مذہبی رہبر ہوں یا سیاسی رہنما

سب منافقت کی زندگی گزار رہے ہیں

اور ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں

کہ اس کا خلوص دل سے

اقرار کر سکیں

اسکول اور کالج میں کیا فرق محسوس کیا؟" پروفیسر نے پوچھا

"کالج میں سٹوڈنٹس یونین ہوتی ہے" امجد نے جواب دیا

"اور؟"

"کالج میں الیکشن ہوتے ہیں"

"ہاں! تعلیمی ادارے معاشرے کے لیے ایک تربیت گاہ کی حیثیت رکھتے

ہیں۔ سٹوڈنٹس یونین۔ بحث مباحثہ اور الیکشن نوجوانوں کی تربیت کے لیے ہوتے ہیں تاکہ وہ مستقبل میں اپنی ذمہ داریوں کو بہتر طور پر سرانجام دے سکیں۔"

"ہمارے ملک میں الیکشن کیوں نہیں ہوتے؟" امجد نے پوچھا

"کالج ایک تعلیمی ادارہ ہے سیاسی اکھاڑہ نہیں۔ ہمیں سیاسی باتوں سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے" پروفیسر نے جواب دیا

امجد پہلے ہنسا پھر وہ رو دیا

(دیکھ کبیرا ہنسا)

ان کرداروں نے جب
تعلیمی درسگاہوں کی خوابوں کی دنیا
سے نکل کر
عملی زندگی میں قدم رکھا تو
ان کے خوابوں کے شیش محل
چکنا چور ہو گئے

"پھر ملک میں امن و امان قائم کرنے کے لیے ملٹری ہیڈ کواٹرز میں اہم میٹنگیں ہونے لگیں اور شاہد ان میں شریک ہونے لگا وہ شاہد جو محمد بن قاسم بن کر کسی مظلوم لڑکی کی مدد کرنے کے لیے کسی راجہ کو سبق دینا چاہتا تھا اور سلطان محمود غزنوی کی طرح ہندوؤں کے کسی سومناتھ پر حملے کرنا چاہتا تھا۔ ملٹری ہیڈ کواٹرز میں اہم فیصلے ہوئے اور پاکستان فوج کے مجاہدین نے سنگینوں، بندوقوں اور اسٹین گنوں کی مدد سے امن و امان قائم کیا" (اخبار آ گیا ہے)

ان کرداروں نے جب

اپنے ملک میں ہی
عوام پر ظلم
اور ان کے حقوق کا استحصال ہوتے
دیکھا تو
اس کے خلاف آواز بلند کی
احتجاج کیا
اور جب ان کی آوازوں
کو خاموش ہونے
ہونٹوں کو سل جانے
ہاتھوں کو قلم ہونے
کا حکم آیا تو وہ
زیر زمین چلے گئے
اور یا گرفتار ہو کر
جیلوں میں پہنچ گے
"دیکھو سیدھی طرح بتا دو!"
"کیا بتا دوں؟"
"اپنے دوستوں کے نام جو زیرِ زمیں سرگرمیوں میں مصروف ہیں"
"میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو زیر زمین سرگرمیوں میں ملوث
ہو"
"تمہارا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟"
"میرا کوئی ہیڈ کوارٹر نہیں ہے"
"کیا تم کمیونسٹ ہو؟" پولیس افسر نے پوچھا

''نہیں''

(خوش قسمت)

''فیصلہ احمد علی کی بجائے امجد نے کرلیا۔ وہ پیرومرشد کے مدرسے جانے یا قانون پڑھنے سے پہلے ہی متحرک ہوگیا اور جیل پہنچ گیا۔ احمد علی ملاقات کے لیے پہنچا تو وہ سلاخوں کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا

''تمہیں جلوس میں جانے سے منع کیا تھا نا؟''

''جی ابا جی''

''پھر کیوں گئے؟''

''آپ بھی تو اپنے وقت میں جلوسوں میں جاتے رہے ہیں''

''ہمارے پاس تو دو قومی نظریہ تھا تمہارے پاس کیا ہے؟''

''دو فوجی نظریہ! اس ملک میں یہ فوج اور ہم اکٹھے نہیں رہ سکتے ہمیں اپنی الگ فوج بنانی پڑے گی''

''بکواس بند'' پہرے پر کھڑے باوردی سپاہی نے اپنی بندوق کا بٹ امجد کے منہ پر مارا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔

''یہ جیل ہے۔ موچی دروازہ نہیں ملاقات ختم'' پہریدار چلایا اور پھر امجد کو گھسیٹے ہوئے اندر لے گیا۔

جیل کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے احمد علی پہلے رویا پھر وہ ہنس دیا۔

''تم روئے کیوں اور ہنسے کیوں؟'' گھر میں احمد علی کی بیوی نے پوچھا۔

''رویا میں اس لیے کہ دشمنوں نے میرے بیٹے کو میرے سامنے مارا اور ہنسا میں اس لیے کہ میرے بچے کے پاس اپنے مستقبل کے لیے ایک نظریہ ہے''

(دکھ کیبرا ہنسا)

ان کرداروں کو یہ یقین ہو گیا کہ
ان کی دعائیں بے اثر ہیں
اور محنتیں رائگاں
اور وہ
اپنے ملک کے مستقبل سے
ناامید ہو گئے
تو انہوں نے
اپنے خوابوں کی تعبیریں تلاش کرنے کے لیے
مغرب کا رخ کیا
اور جب ان کے
والدین، دوست اور محبوب
انہیں الوداع کہنے آئے
تو وہ اپنے اپنے ادھورے خوابوں کے
تحفے دے گئے

ندیم کے ابا نے کہا۔ ’’بیٹے اب تم ذمہ دار ہو۔ میرا فرض تھا تمہیں تعلیم دلانا، وہ تم نے مکمل کرلی، اب تم میرا دایاں ہاتھ ہو میرا مستقبل ہو۔ میرے تشنہ خوابوں کی تکمیل ہو۔ اس کے لیے تمہاری ہمت اور میری قربانی کی ضرورت ہے۔ میں نے سینے پر پتھر رکھ لیا ہے اور تمہیں اپنی آنکھوں سے دور بھجوا رہا ہوں میری بس ایک نصیحت ہے، سور، شراب اور لڑکی سے پرہیز کرنا۔ سور آنکھوں سے حیا چھینتا ہے، شراب انسان کی عقل سلب کرتی ہے اور لڑکی انسان کو والدین سے جدا کرتی ہے۔ اب میں انتظار کروں گا اور دیکھوں گا کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں۔‘‘

ندیم کے دوستوں نے اس کی دعوت کی

''ہم یورپ تو نہیں جاسکتے لیکن اگر تم چاہو گے اور مطلوبہ کلنڈر رسالے بھیجتے رہو گے تو ہم یہاں بیٹھ کر بھی وہاں کے مزے لوٹ سکیں گے۔''

آخر میں ندیم کو فوزیہ ملی۔ فوزیہ جس سے ندیم کو محبت تھی اس نے کہا

''ندیم تم جو ہمیشہ سے محبت میں لمس کے قائل رہے اب وہاں جا رہے ہو جہاں محبت ہوتی ہی لمس کی بنیاد پر ہے۔ میں غریب باپ کی بیٹی ہوں اور میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ اب خوش حال گھرانوں کی لڑکیوں کے باپ تمہیں قیمتی جہیز کے عوض خرید لیں گے اب میرا تمہارے اوپر کوئی حق نہیں۔ مگر وہ لمحات جو ہم نے مل کر گزارے ہیں آؤ ان کی شہادت کے لیے ایک زوردار معانقہ کرلیں ہمارا یہ پہلا اور آخری لمس میری بدقسمتی کے نام ہوگا۔''

(خوش قسمت)

وہ کردار جب
مغرب کی دنیا میں پہنچے
تو ایک آزاد دنیا نے
ان کا استقبال کیا
ایسی آزاد دنیا جہاں
نہ تو سیاسی پابندیاں تھیں
نہ معاشرتی
نہ تو نفسیاتی رکاوٹیں تھیں
نہ جنسی
اس نئے ماحول میں
ان کرداروں کو

نہ اپنی آنکھوں پر یقین آتا
نہ کانوں پر
''فیکٹری میں ندیم نے اس نارؤمتین سے پوچھا ''تمہیں لال جھنڈیوں کے جلوس میں جاتے ہوئے ڈر نہیں لگتا''
''ڈر کیوں لگے گا؟''
''پولیس پیچھے لگ جاتی ہے''
وہ زور سے ہنسا ''ایسا پاکستان میں ہوتا ہوگا۔ یہاں نہیں''
''اچھا۔ ندیم نے غیر مطمئن لہجے میں کہا
''کیوں۔ پولیس کبھی تمہارے پیچھے لگی تھی؟
''ہاں۔ میرا ایک دوست کمیونسٹ تھا۔ میں اس سے ملا تو پولیس نے مجھے پکڑ لیا'' (خوش قسمت)

لیکن ان کرداروں کو
جلد ہی احساس ہو گیا
کہ اس سیاسی اور جنسی آزادی کی بھی
حدود ہیں
قیمتیں ہیں
مسائل ہیں
صرف ان کی نوعیت مختلف ہے
اس نئے معاشرے کے بھی
تعصبات ہیں
مسائل ہیں

تضادات ہیں
صرف ان کے انداز مختلف ہیں

آخر وہ منشیات سمگل کرنے والے لوگوں کے ساتھ ملوث ہونے کے الزام میں ایک ہفتہ جیل میں رہا۔

''چند روز بعد پول جانسن خود ہی پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ ندیم بے قصور تھا۔ ہالی وڈ کی فلموں کے پیشہ ور قاتلوں کا ہم شکل ندیم کے پاس پہنچا اسی نے ندیم کی کلائی پکڑی عمارت سے باہر لایا اور دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا

''جاؤ۔ تم خوش قسمت ہو۔''

(خوش قسمت)

جوں جوں
ان کے مستقبل کے خواب بے رنگ ہونے لگے
وہ ماضی کے خواب دیکھنے لگے
انہیں
کبھی دوست یاد آتے کبھی رشتہ دار
کبھی گانے یاد آئے کبھی فلمیں
کبھی اپنی زبان یاد آتی کبھی اپنے دھرتی
کبھی اپنی گالیاں یاد آتیں کبھی لطیفے
کبھی اپنے دکھ یاد آتے کبھی سکھ

اور وہ سوچنے لگتے کہ
مشرق سے مغرب میں آکر

انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا
اور اس نئے ماحول میں انہیں
کیا اپنانا ہے اور کیا رد کرنا

"ناروے میں رہتے تھے۔ کام کرتے تھے۔ پیسے کماتے تھے اور گھر بھیجتے تھے۔ فارغ وقت میں ساتھ اٹھتے بیٹھتے۔ گپ شپ ہوتی۔ سیر و تفریح کرتے۔ جمعہ ہفتے کی شام کو دیر تک اکٹھے رہتے پھر اپنے اپنے گھروں میں جاکر سو جاتے اور خواب دیکھتے۔ کبھی دل لبھانے والے اور کبھی دل لرزانے والے اچھے خواب خود تک محدود رکھتے اور برے خواب ایک دوسرے کو سناتے اگر ڈر جاتے تو حوصلہ بڑھاتے۔ سگریٹ کا کش، الکحل کی چسکی اور کسی کلب رستوراں کا پھیرا اپنی حدود کے مطابق تسکین بخشتا تو باتیں کرتے کبھی خوش ہو جاتے۔ کبھی اداس باتوں سے تھک جاتے، تو چپ ہو جاتے۔ پھر فلمی گانے سنتے۔ گانوں سے تنگ آجاتے تو پھر باتیں شروع کر دیتے" "پھر بحث ہوتی کون اپنا کون پرایا؟ ناروے میں کیا کھویا کیا پایا؟ اس نئے معاشرے میں کیا اپنائیں اور کیا رد کریں؟"

(جیل کی یاری)

مشرق سے مغرب کے اس سفر میں
ان کرداروں کی
سوچ بھی بدل گئی فکر بھی
خواب بھی بدل گئے تعبیریں بھی
انداز بھی بدل گئے طرزِ زندگی بھی

"جمہوری حکومت میں حکام پر گرفت تو ہو سکتی ہے نا" شہباز نے تبصرہ کیا تھا۔

"یہاں پر کیا اپنائیں اور کیا رد کریں" ظہیر نے بے دلی سے کہا تھا

"رد کرنے کی چیزیں تو سامنے ہیں" شہباز نے پردہ اٹھا کر برف باری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا "یہاں کا موسم سردی اور برفیلی ہوائیں"

"اور اپنانا کیا چاہیے" ٹی وی کے سامنے بچھے صوفے پر بیٹھا ظہیر مسکرایا۔

"ملک کے وسائل کی تقسیم کا ایسا طریقہ کار جو پاکستان کے گرم موسم میں وہاں کے سب مزدوروں کو ایر کنڈیشنڈ گھر دے تاکہ وہ بھی صوفوں پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھیں نہ کہ ملک چھوڑنے کے خواب" شہباز نے جواب دیا تھا

(جیل کی یاری)

نئے خوابوں کے ساتھ ساتھ
ان کرداروں کا
نئے تضادات سے بھی تعارف ہوا
وہ تضادات
انفرادی بھی تھے اجتماعی بھی
نفسیاتی بھی تھے معاشرتی بھی
سیاسی بھی تھے مذہبی بھی
اور وہ کردار سوچنے لگے کہ
کیا وہ اس نئے ماحول میں
نئی دنیا میں
بدلنا چاہتے بھی ہیں کہ نہیں؟
بدل سکتے بھی ہیں کہ نہیں؟

"بین الاقوامیت دونوں دوستوں کو اچھی لگتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان دونوں میں تھوڑی تھوڑی پائی جاتی ہے ایک قوم کا فرد جب دوسری قوم کے ملک میں جاکر کام کرنے لگے تو دونوں قوموں کے درمیان کچھ نہ کچھ وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔ جو ہوتا ہے اس کا تھوڑا بہت اثر اس فرد پر بھی پڑتا ہے جو نقل مکانی کرتا ہے چنانچہ اس تھوڑے بہت اثر کو تھوڑی بہت بین الاقوامیت کہا جاسکتا ہے۔ اسی لیے وہ سمجھتے تھے کہ یہ تھوڑی بہت ان دونوں میں پائی جاتی ہے باقی رہی قومیت وہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ڈاک خانے تھانے اور کچہری۔ ہر جگہ وہ اپنا پاکستانی پاسپورٹ ساتھ لے کر جاتے اوسلو آنے والے قوالوں کے شو کا ٹکٹ وہ مہنگا ہونے کے باوجود خریدتے۔ پاکستان بھیجی ہوئی رقم میں سے زکوٰۃ کی کٹوتی پر کبھی نہ بولتے۔ چودہ اگست کے جلسے میں شلوار قمیص پہن کر خوشبو لگاکر پہنچتے........

"بندے میں تھوڑی بہت تبدیلی تو آنی چاہیے" شہباز کہتا

"وہ مرد کیا ہوا جو بدل جائے" ظہیر جواب میں بولتا

"وقت کے ساتھ ہر چیز بدلتی رہتی ہے" شہباز جواب دیتا

"چیز بدلتی ہے یار۔ مرد نہیں۔ مرد وہ ہے جو مرد رہے۔

(جیل کی یاری)

ان کرداروں کو

اپنے مسائل کا

اپنے تضادات کا

اپنی دشواریوں کا

کوئی حل نظر نہ آیا

وہ اپنے ماضی پر

فخر بھی کرتے رہے ندامت بھی

اور وہ تضادات

ان کی سوچ

ان کی ذات

ان کے کردار میں

تلخیاں گھولتے رہے

''ہاں خالق! ایکے برگ ہر سال ایسے ہی ہوتا ہے نئے سال کے قدموں کے نشان وہاں بن جاتے ہیں۔ پھر برف ان کو ڈھانپ لیتی ہے'' نارویجن لڑکی نے کہا۔

''لیکن پٹرول اور بارود کی بو وہاں گھومتی رہتی ہے''

''اس بو نے پوری دنیا کو گھیر رکھا ہے''

''ہاں! پٹرول والوں کو بارود چاہئے اور بارود والوں کو پٹرول''

''بارود تو وہ بھی خریدتے ہیں جن کے پاس بیچنے کو پٹرول نہیں ہے'' نارویجن لڑکی بولی

''ہاں! جن کے پاس پٹرول نہیں ہے وہ انسان بیچتے ہیں اور بارود خریدتے ہیں''

''آج کل انسان نہیں بکتے غلامی کا دور ختم ہو گیا ہے'' نارویجن لڑکی نے حالت کی تصحیح کی۔

''غلامی کا دور ختم ہو گیا ہے اور فارن ورکر کا دور شروع ہو گیا ہے'' خالق اپنی رائے پر قائم تھا۔

''سنو!'' نارویجن لڑکی آگے کو جھک آئی'' تم لڑتے کیوں ہو ناچتے کیوں نہیں؟''

(نیا سال)

''خالق''

''میں نے سنا ہے تم لوگوں کے ناموں کا کچھ نہ کچھ مطلب بھی ہوتا ہے''

''ہاں میرے نام کا مطلب ہے تخلیق کرنے والا؟

''کچھ تخلیق کرتے ہو؟''

ہاں! پیداوار نارویجن صنعت کار کے لیے''

''تمہارے اندر تلخی رچی ہوئی ہے آؤ دوستی کرلیں۔''

نارویجن لڑکی بولی۔

(نیا سال)

ان کرداروں نے

مغربی لڑکیوں کے ساتھ

سگریٹ بھی پیے شراب بھی

گانے بھی گائے ناچے بھی

لیکن انہیں

نہ تو دوست بنایا نہ شریک حیات

اور

مشرق کی روایتی عورتوں سے

شادی کرلی

مبادا وہ

اپنی تہذیب اپنی ثقافت

اپنی زبان اپنی جڑوں سے

نہ کٹ جائیں
لیکن ان شادیوں نے
مسائل کی گتھیوں کو نہ سلجھایا
بلکہ ان میں اضافہ ہی کر دیا
اور
مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے
قومی اور بین الاقوامی شناخت کے
انفرادی اور معاشرتی خوابوں کے
تضادات کے ناگ
ان کی زندگیوں کو ڈستے رہے
ان کی رگوں میں
زہر گھولتے رہے
اور وہ زہر
ایک خوف ایک ڈر
ایک تشنج، ایک ہیجان بن کر
ان کے سراپا میں پھیلتا گیا
ان کے اعصاب کو متاثر کرتا رہا۔

''ابا جی! میں ڈرا بیٹھا ہوں........ پردیس کی دوری نے مجھے مار دیا ہے۔ ابا جی مجھے رونا آتا ہے لیکن رویا نہیں جاتا۔ آنکھیں خشک رہتی ہیں۔ حلق دکھنے لگتا ہے۔ مجھے قبض ہو جاتی ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں وہ کہتا ہے تمہاری بیماری جسمانی نہیں ذہنی ہے۔ تم چھٹی پر پاکستان جاؤ۔ ابا جی میں کیسے پاکستان

آؤں۔ مجھے پاکستان سے بھی ڈر لگتا ہے........ میری بیوی کہتی ہے یہ سب میرے وہم ہیں۔ اگر میں اپنے مقدر پر شاکر ہو جاؤں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں اپنے مقدر پر کیسے شاکر ہو جاؤں۔ میری بیوی کہتی ہے سوچنا چھوڑ دو اپنے آپ شاکر ہو جاؤ گے۔ میرا خیال ہے میں نے اپنی زندگی میں سوچنا کبھی شروع ہی نہیں کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ سوچنے والوں کا انجام برا ہوتا ہے........ تھوڑی سی دیر کے لیے مجھے لگتا ہے کہ میں ایک بہادر آدمی ہوں لیکن میری بیوی...... وہ کہتی ہے اب بہادری کا کوئی کارنامہ سرانجام دو۔ اب مجھے پردیس کے نہ تو کارناموں کا پتہ ہے اور نہ یہ معلوم کہ ان کو سرانجام کیسے دیتے ہیں۔ شاہ جی کو ان سب باتوں کا پتہ ہے........ دو چار میرے بیلی ہیں ان کو میں پسند نہیں کرتا۔ وہ کوئی نہ کوئی نشہ کرتے ہیں کسی کو شراب کا نشہ ہے کسی کو محبت کا اور کسی کو مذہب کا نشہ ہے شاہ جی کہتے ہیں کہ عقل ہر نشے کو کنٹرول کر سکتی ہے سوائے مذہب کے نشے کے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اب شاہ جی بھی ڈر گئے ہیں۔ میں بھی اسی لیے ڈر گیا ہوں شاہ جی کی بیوی اپنے بچوں کو لے کر ایک دوسرے شہر میں چلی گئی تھی........ آپ وہاں پاکستان میں بیٹھے ہیں۔ میں یہاں پردیس میں........ مجھے تو بہت سی چیزوں سے ڈر لگتا ہے۔ میں پولیس سے ڈرتا ہوں بلکہ وردی والے ہر بندے سے جو پاکستان میں ہے۔ میں کیا کروں؟ آپ ہی کچھ بتائیں“

(فرش و عرش)

وہ کردار
مغرب سے مایوس ہو کر
بے دل ہو کر
گھبرا کر

واپس مشرق کی طرف بھاگے
تاکہ دوستوں رشتہ داروں سے مل سکیں
زخموں پر مرہم لگا سکیں
لیکن مشرق کے سفر نے
زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے اور ہی
نمک چھڑکا
کچو کے اور
چر کے لگائے

"آپ ٹھیک نہیں کر رہے صاحب جی۔ آپ مجھے میرے گھر میں داخل ہونے سے روک رہے ہیں۔ یہ میرا وطن ہی نہیں میرا گھر بھی ہے۔ میری جان ہے۔ میری پہچان ہے۔ ہر سال میں چودہ اگست اور ۲۳/ مارچ کے جلسے میں شامل ہوتا ہوں سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد والا ترانہ مجھے زبانی یاد ہے پاک سرزمین شادباد کی دھن بجتی ہے تو میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ پاکستان سے روانہ ہوتے وقت میں قومی اور ملی نغموں والی کیسٹ ساتھ لے کر گیا تھا۔ انڈین فلموں کی بجائے میں پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام دیکھتا ہوں اور آپ ہیں کہ پھر بھی مجھے پاکستان ہی کے ایرپورٹ پر روک رہے ہیں آپ نے اب تک جو کچھ مجھے کہا ہے میں نے کیا ہے اور آپ نے۔ آپ نے اب تک وہی کچھ کیا ہے جو کچھ گوروں نے آپ سے کہا ہے۔ میری تو گورے مجبوری ہیں کہ میں ان کے ملک میں رہتا ہوں لیکن آپ کو کیا مجبوری ہے آپ تو اسلام کے قلعے کے محافظ ہیں۔ آپ کیوں وہ وہ کچھ کرتے ہیں جو گورے آپ سے کہتے ہیں؟"

(نیک بندوں کا زیور)

آخر وہ کردار
اپنے ماضی اپنے مستقبل
اپنی ذات اپنے خاندان
اپنے نقطہ نظر اپنی طرز زندگی سے
اتنے پریشان ہوئے کہ
نفسیاتی ہسپتال پہنچ گئے
اور برسوں کی بے سود ریاضت پر
ماتم کرنے لگے۔
زخمی خط لکھنے لگے۔

"اس خط کے ساتھ تمہیں بھی ایک فوٹو ملے گا۔ میرے بچے میرے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میری بیوی اس تصویر میں نہیں ہے۔ اس کی غیر موجودگی سے تم یہ مت سمجھ لینا کہ ہمارے خاندان میں ایک فرد کی کمی ہوگئی ہے ہم بدستور میاں بیوی ہیں اور اکٹھے ہی رہتے ہیں۔ تصویر میں وہ اس لیے نہیں ہے کہ اس کو نارویجن ماڈل کے مطابق خط اور اس کے ساتھ منسلک کی جانے والی تصویر کے آئیڈیا سے اختلاف ہے۔

ہمارے درمیان اختلاف اس وقت شروع ہوا جب ہم پہلی دفعہ والدین بننے والے تھے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے وقت وہ اپنی ماں کے گھر میں ہو۔ میرا اصرار تھا کہ بچے کی پیدائش ناروے میں ہو۔ میں چاہتا تھا کہ ہم یہاں پر میسر جدید سہولتوں کا فائدہ اٹھا سکیں۔ میرے خیال میں ایک نارویجن ہسپتال جراثیم سے پاک محفوظ ادارہ تھا۔ میری بیوی کے لیے اس کا خاندان جذبات سے بھرپور تحفظ کا ایک سہارا تھا۔ مجھے حقیقت پسندی کا دعویٰ تھا

تو میری بیوی کو رسم و رواج کا۔ اس نے مجھے ناروے سے مرعوب ہونے کا طعنہ دیا میں نے اس کو قدامت پرستی کا۔ اس نے کہا تم نے مجھے میرے غول سے الگ کر دیا ہے میں نے کہا عقاب تنہا اڑتے ہیں۔ اس بحث کو پندرہ سال ہو چکے ہیں لیکن میری بیوی اسے بھول نہیں سکی۔ جب کبھی کوئی نارویجن رویہ مجھے متاثر کرتا ہے اور میں اسے اپنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری بیوی میرا ساتھ نہیں دیتی وہ کہتی ہے ''تنہا اڑو۔ عقاب صاحب۔ تنہا!''

(اڑان اک عقاب کی)

آخر وہ مسائل
اس حد تک پہنچ گئے
کہ وہ تنہا عقاب اپنے
امن اور آشتی
عدل اور انصاف
عزت نفس اور انسان دوستی کے
خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے
کسی نئی دنیا کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے
اور ان کے لواحقین
یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ
ان کی لاشوں کے ساتھ
کیا سلوک کیا جائے

''آپ کا سوال کیا ہے؟'' عثمان نے تصویر تھامتے ہوئے پوچھا
''صابر کو دفن کہاں کیا جائے؟'' نینا نے جواب دیا

"صابر نے مرنے سے پہلے الزبتھ کو کہا تھا کہ وہ اسے ناروے میں دفن کرے لیکن ڈاکٹر سے اس نے درخواست کی کہ اس کی میت کو پاکستان روانہ کیا جائے"

(اڑان اک عقاب کی)

کرداروں کا تجزیہ

سعید انجم نے اپنی کہانیوں میں جس معاشرے، جس قوم، جس ماحول اور جن خاندانوں کو اپنا موضوع بنایا ہے ان خاندانوں کے مرکزی کردار

فرد ہیں

مزدور پیشہ ہیں

مہاجر ہیں

لیکن

ناخوش ہیں

پریشان حال ہیں اور

نفسیاتی مسائل کا شکار ہیں

وہ کردار چند بنیادی تضادات کا شکار ہیں ایسے تضادات جن کا وہ عمر بھر کوئی صحت مند حل تلاش نہیں کرپائے

وہ کردار

سیاسی شعور تو رکھتے ہیں

لیکن

نفسیاتی بصیرتوں سے محروم ہیں

معاشرتی خوشحالی کے خواب تو دیکھتے ہیں

لیکن

انفرادی زندگی کو بہتر نہیں بنا سکتے

خارجی تبدیلیاں تو لانا چاہتے ہیں

لیکن

داخلی تبدیلیاں لانے میں ناکام رہتے ہیں

وہ کردار لاشعوری طور پر یہ یقین کر بیٹھے ہیں کہ وہ جس ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں، چاہے وہ مشرق ہو یا مغرب، پاکستان ہو یا ناروے، اس ماحول کے سیاسی جبر اور معاشرتی تعصبات کے آگے وہ کافی حد تک بے بس ہیں۔

انہیں یقین ہو گیا ہے کہ ان کا ذاتی مستقبل اجتماعی مستقبل سے ایسا جڑا ہوا ہے کہ جب تک معاشرہ نہ بدلے گا وہ خوش نہیں ہوں گے۔

انہوں نے اپنے آپ کو اس بات کا قائل کر لیا ہے کہ یہ مسائل ان کے مقدر میں لکھے ہیں اور وہ ان سے رہائی حاصل نہیں کر سکتے۔

سعید انجم کے افسانے وہ آئینے ہیں جو ہمیں ان مرکزی کرداروں کی طرزِ زندگی اور انسانی رشتوں کے عکس دکھاتے ہیں جن کے مطالعے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کرداروں نے ایسے خاندانوں میں پرورش پائی ہے:

جہاں مرد (باپ) تو
پڑھے لکھے تھے
معاشرے کے فعال ممبر تھے
سیاسی شعور رکھتے تھے
لیکن عورتیں (مائیں)
ان پڑھ تھیں
سادہ اور معصوم تھیں
روایتی تھیں
ان کی جداگانہ شناخت نہ تھی
وہ بیٹوں اور خاوندوں کے حوالے سے جانی پہچانی جاتی تھیں

ان کے خاوند ان کی رائے کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

''کہتے ہیں لڑکے کو ان کے مدرسے میں بھیج دو''

''مولوی بنانے کے لیے''

''عالم دین بنانے کے لیے''

''میرا لال کوئی لولا لنگڑا ہے؟ اندھا کانا ہے؟ لوگ نابینوں کو حافظ بناتے ہیں''

''تمہیں کوڑھ ہو جائے۔ تم کفر بکتی ہو''

''مجھے تو بکنے دو۔ کسی اور سے بات کرو''

(دیکھ کبیرا ہنسا)

وہ مرکزی کردار جب جوان ہوتے ہیں تو محبوباؤں سے رشتے قائم کرتے ہیں لیکن وہ رشتے کبھی بار آور نہیں ہوتے اور وہ کردار انہیں چھوڑ کر کہیں اور جا بستے ہیں

فوزیہ ''اب میرا تمہارے اوپر کوئی حق نہیں۔ مگر وہ لمحات جو ہم نے مل کر گزارے ہیں آؤ ان کی شہادت کے لیے ایک زور دار معانقہ کرلیں ہمارا یہ پہلا اور آخری لمس میری بدقسمتی کے نام ہوگا۔''

(خوش قسمت)

جب وہ کردار مغرب میں پہنچتے ہیں تو ان کے لڑکیوں سے تعلقات سطحی اور جنسی ہوتے ہیں۔

وہ ان لڑکیوں سے سیاسی بحثوں میں تو الجھتے ہیں لیکن دوستی اور رفاقت کے رشتے میں منسلک نہیں ہوتے۔ انہیں یہ بھی خطرہ لگا رہتا ہے کہ وہ کہیں جنسی امراض میں نہ مبتلا ہو جائیں۔

''ندیم کے نام ایک چٹھی آگئی ایک ڈاکٹر کی طرف سے اسے چیک اپ کے لیے بلایا گیا تھا۔ معلوم ہوا وہ لڑکی کسی جنسی بیماری میں مبتلا تھی۔ تفتیش کے بعد اس نے کچھ مردوں کے نام اور پتے مہیا کردیے تھے جن کے ساتھ وہ سوئی تھی۔ ندیم کا چیک اپ ہوا تو وہ صحت مند ثابت ہوا ڈاکٹر نے کہا ''تم خوش قسمت ہو۔ لیکن احتیاطاً ایک ٹیکہ لگائے دیتا ہوں۔''

(خوش قسمت)

آخر اپنے رومانوی اور جنسی رشتوں سے مایوس ہوکر وہ اپنے باپوں کی طرح روایتی، مذہبی، مشرقی عورتوں سے شادی کرلیتے ہیں۔ ایسی عورتیں جو نہ تو سیاسی شعور رکھتی ہیں نہ معاشرتی مسائل کا تجزیہ کرسکتی ہیں۔ وہ اپنے خاوندوں کو مشورے دیتی ہیں کہ زیادہ نہ سوچا کرو۔

''میری بیوی کہتی ہے سوچنا چھوڑ دو اپنے آپ شاکر ہو جاؤ گے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں سوچنا کبھی شروع ہی نہیں کیا۔''

(فرش دعرش)

ان کرداروں کی بیویاں
(ان کے ماں باپ کی طرح)
ان کی ذہنی، جذباتی اور نظریاتی شریکِ سفر نہیں بنتیں
اور
ان کی ازدواجی اور رومانوی زندگیاں
بے رنگ رہ جاتی ہیں
وہ کردار شادی شدہ ہوکر بھی
تنہا رہتے ہیں
ان کرداروں میں نہ تو اتنی ہمت ہے کہ وہ

اپنی پسند کی مشرقی لڑکیوں سے شادی کریں
جن سے ان کی ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی ہو
اور نہ ہی اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ
مغربی لڑکیوں سے دوستی کریں
اور انہیں
شریکِ سفر بنانے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کریں

ایسی روایتی شادیوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ برسوں بعد بھی جب وہ کردار مغربی زندگی کے صحت مند پہلوؤں کو اپنانا چاہتے ہیں تو بیویاں ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور انہیں طعنے سننے پڑتے ہیں۔

''جب کبھی کوئی نارویجن رویہ مجھے متاثر کرتا ہے اور میں اسے اپنانے کی کوشش کرتا ہوں میری بیوی میرا ساتھ نہیں دیتی وہ کہتی ہے ''تنہا اڑو۔ عقاب صاحب۔ تنہا!''

(اڑان اک عقاب کی)

ان کرداروں کے خاندانی اور رومانوی رشتوں کی طرح ان کے دوستانہ اور معاشرتی رشتے بھی غیر تسلی بخش ہیں۔

وہ ایک طرف تو سگریٹ پیتے ہیں، شراب پیتے ہیں۔ سور کھاتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کی محفل میں بھی بیٹھتے ہیں جو ہمیشہ ان پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔

لنچ کے وقفے میں کینٹین کی سب میزوں پر نارویجن بکھرے پڑے تھے۔ ایک لمبی میز کے کونے پر اسے دوچار پاکستانی نظر آئے۔ ارشد بھی وہیں جا بیٹھا اس نے اپنا کھانا نکالا تو ایک پاکستانی اس کے کھانے کی طرف اشارہ کر کے بولا

''تم یہ پیلا پنیر کھاتے ہو؟''

''ہاں! کیا ہوا اس کو؟''

اس میں سور کی چربی ہوتی ہے'' اس نے بتایا

''میرا خیال ہے تمہاری آنکھ میں سور کا بال ہے'' ارشد نے جواباً کہا اور پیلے پنیر والا بریڈ کا پیس کھانے لگا۔''

(سوتا جاگتا خواب)

اور وہ پاکستانی دوست جو فلمی گانے سننے اور فلمیں دیکھنے میں تو ساتھ دیتے ہیں لیکن یکم مئی کے مزدوروں کے دن کی خوشی منانے کا وقت آتا ہے تو انہیں تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔

ان کرداروں کا المیہ یہ ہے کہ

ایک طرف وہ

اپنے خاندانوں اور محبوباؤں کو پاکستان چھوڑ آئے اور جب وہ

سور کھاتے ہیں تو رفقاء کار

مغربی روایات اپناتے ہیں تو شریکِ حیات

اور

سیاسی گروہ کا حصہ بنتے ہیں تو مشرقی دوست

انہیں خیر باد کہہ دیتے ہیں

اور دوسری طرف وہ

نہ تو تعلیمی طور پر اپنا معیار بلند کرتے ہیں

نہ مغربی مردوں کو اپنا دوست بناتے ہیں

اور

نہ مغربی عورتوں سے جذباتی، رومانوی اور دوستانہ تعلقات قائم کرتے ہیں۔

اور نہ ہی مغرب کی فنی، ثقافتی، ادبی، تہذیبی زندگی کا حصہ بنتے ہیں
وہ مغرب میں رہ کر بھی چھوٹے سے مشرق میں
ناروے میں رہ کر بھی چھوٹے سے پاکستان میں
زندگی گزارتے ہیں

اور جب کبھی وہ مغربی زندگی میں شامل ہونے کے لیے کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو انہیں اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے
وہ کردار عمر بھر
اپنے تضادات کا حل تلاش نہیں کرپاتے
وہ اپنے اندر
ایسی نفسیاتی تبدیلیاں
اور اپنی زندگی میں
ایسی معاشرتی تبدیلیاں
نہیں لاپاتے جو
ان کی زندگیوں کے دامن کو
خوشیوں، مسکراہٹوں اور کامیابیوں
کے پھولوں سے بھر دیں
وہ عمر بھر
ایسے خواب دیکھتے رہتے ہیں
جن کی تعبیریں تلاش کرنا
ان کے بس کی بات نہیں
سعید انجم کی کہانیوں کے کردار

اپنے ماحول کی فنکارانہ عکاسی کرتے ہیں
ان خاندانوں کا حال سناتے ہیں
جو عمر بھر
برزخ میں زندہ رہتے ہیں
اور
برزخ میں ہی مر جاتے ہیں
سعید انجم نے بڑی کامیابی سے
ان کرداروں کی کہانی سنائی ہے
مجھے سعید انجم کی کہانیوں اور ان کہانیوں کے کرداروں کا مطالعہ کرتے ہوئے سلمان اختر کی ایک نظم یاد آگئی جو حاضر خدمت ہے:

A WORLD WITHOUT SEASONS

(Dedicated to the Indian Immigrants in the U.S.)

In the greedy flim-flam
For two worlds, we have lost the one in hand
And now,
Like the fish who choose to live on a tree,
We writhe in foolish agony,
Our gods reduced to grotesque exhibits
Our poets mute, pace in the empty halls of our conversation
The silk of our mother tongue banned from the fabric of our dreams

And now
We hum the national anthem but our pockets do not jingle with the coins of partriotism
Barred from weddings and funerals
We wear good clothes to no avail
Proudly we mispronounce our names
And those of our monuments and our children
Forsaking the grey abodes and sunken graves of
Our ancestors, we have come to live in
A world without seasons.

Salman Akhtar

دسمبر ۱۹۹۳ء

ہجرت کا ثمر
مغرب کی اردو شاعری
کے حوالے سے

مشمولات

مشرق سے مغرب کی طرف
تیسری دنیا سے پہلی دنیا کی طرف
اور پرانے گھر سے نئے گھر کی طرف
ہجرت کرنے والوں کے بارے میں، میں نے چند سال پیشتر اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا تھا:

"ایک گھر کو چھوڑ کر دوسرا گھر بنانے والوں کے دلوں پر جو بیتتی ہے وہ ان کے دل ہی جانتے ہیں۔ جب انسان ایک ماحول میں پلا بڑھا ہو اور دوسرے معاشرے میں جابسے تو اکثر اوقات اپنی ذات کو دو کشتیوں میں سوار محسوس کرتا ہے۔ جب بچپن کی سوچ، انداز فکر اور روایات میزبان تہذیب کی طرز زندگی اور اس کی اقدار سے ٹکراتے ہیں تو کتنے لوگ اپنے آپ کو دوراہوں پر کھڑا پاتے ہیں۔ ہر شخص اور ہر خاندان ان بدلتے ہوئے حالات سے اپنے مخصوص اور جداگانہ انداز میں سمجھوتہ کرتا ہے

بعض ماضی کا اتنا بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں کہ حال اور مستقبل سے آنکھیں نہیں ملا سکتے۔ بعض نئے ماحول سے اتنی تیزی سے بڑھ کر بغل گیر ہو جاتے ہیں کہ ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ بعض ساری عمر دھوبی کے کتے کی طرح کاٹ دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔

اور بعض مختلف روایات کے ساتوں رنگ اپنے اندر اس خوبصورتی سے جذب کرتے ہیں کہ ایک نئی روشنی، نئی صبح اور نئی منزل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ زندگی کے اسٹیشنوں پر انسانی گاڑیوں کے پٹریاں بدلنے کے اس عمل میں ان لوگوں پر۔۔۔۔۔جو گھروں میں چھپے رہ جاتے ہیں اور ان لوگوں پر۔۔۔۔جو ان مہمانوں کو اپنے سینوں سے لگا کر نیا گھر بسانے میں مدد دیتے ہیں کیا بیتتی ہے وہ بھی ان کے دل ہی جانتے ہیں۔''

(دو کشتیوں میں سوار: خالد سہیل)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل اور حالات تھے جن کی وجہ سے مشرق سے مغرب کی طرف ہجرت کرنے والوں کی تعداد میں پچھلی چند دہائیوں میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ویسے تو بیسویں صدی کے آغاز سے بدلتے ہوئے معاشی، سیاسی اور سماجی حالات کی وجہ سے ساری دنیا میں ہجرت کے عمل میں اضافہ ہوا ہے لیکن جب ہم مشرقی ماحول اور زندگی پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہاں آہستہ آہستہ محرومی، مایوسی، خوف اور بے یقینی کے سائے بڑھتے رہے۔ جابر حکام، استحصال کرنے والے نظام اور غیر منصفانہ روایات کے آسیب نے عوام کو گھیر لیا اور ان کی زندگیوں پر عذاب اترنے لگے۔

ابھی تک لشکری آسیب ہے سایہ فگن ہم پر
حضور شاہ یوں لگتا ہے جیسے سر نہیں پہنچے

(سپنے جاگتی آنکھوں کے: عابد جعفری)

☆

اس درجہ روایات کی دیواریں اٹھائیں
نسلوں سے کسی شخص نے باہر نہیں دیکھا

(آزاد فضائیں: خالد سہیل)

☆

جب کبھی رنگ کی خوشبوؤں کی اڑانوں کی
آواز کی اور خوابوں کی توہین کی جائے گی
یہ عذاب ان زمینوں پر آتے رہیں گے

(بارہواں کھلاڑی: افتخار عارف)

ان ناگفتہ بہ حالات سے مجبور ہو کر بعض لوگوں نے تو گھٹنے ٹیک دیئے ہتھیار ڈال دیئے اور قفس کو آشیانہ سمجھ کر قبول کر لیا۔

بڑے خلوص سے اپنالیا ہے گھر کی طرح
میں تاحیات نظر بند جس قفس میں رہا

(باد شمال: بخش لائلپوری)

وہ لوگ جو مذہبی اور روحانی عقائد پر ایمان رکھتے تھے ان کے ہاتھ آسمانوں کی طرف اٹھ گئے اور وہ دعا کرنے لگے۔

اس گھٹن کے دور میں
رحمتوں کی اک نظر
زندگی کے دشت پر

بھیج دو تو اس طرف
اک ہوائے تازہ تر
اک صدائے بت شکن
اک رسول خوش کلام
اک مسیح معتبر
جو نوائے درد سے
گنبد سکوت کی
خامشی کو توڑ دے
اصل کائنات کا
بھید ہم پہ کھول دے

(بادشمال: بخش لائلپوری)

لیکن ان دعاؤں کا کچھ اثر نہ ہوا حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ عوام ظلم و تشدد کی چکی میں پستے رہے اور جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ

دل غریب نے جس آسماں پہ دستک دی
صدا یہ لوٹ کے آئی وہاں خدا ہی نہیں

(بادشمال : بخش لائلپوری)

تو چند باشعور شہریوں نے عوام کی غیرت کو للکارا، انہیں جھنجھوڑنے اور ان کے جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔

جمود

زندہ جو ہو تو دوستو جنبش کوئی تو ہو
قبروں سے باہر آنے کی کوشش کوئی تو ہو

چیخ و پکار ہی سہی کوئی صدا تو ہو
مرنے کی جستجو ہی سہی کچھ نہ کچھ کرو

(شناخت کی تلاش: احمد فقیہ)

لیکن جب وہ اپنے ہم وطنوں کو بیدار کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو ان میں چند ایک اپنا پرانا گھر، پرانا شہر اور پرانی بستیوں کو چھوڑ کر نئے گھر، نئے شہر اور نئی بستی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور جب ان سے ہجرت کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگے۔

دیپ جلتے رہے فروغ شب ظلمت کے لئے
کم نہ تھی بات یہ اس شہر سے ہجرت کے لئے
پوچھ سکتا ہی نہ تھا کوئی وہاں پر یہ سوال
پیڑ کیوں کٹ گئے پھولوں کی حفاظت کے لئے

(ہم اجنبی ہیں: اشفاق حسین)

میں بھی یہاں رہنے کا ارادہ نہیں رکھتا
یہ شہر اگر ظرف کشادہ نہیں رکھتا

(رشید ندیم)

جن لوگوں نے ہجرت کا فیصلہ کیا تھا وہ خون کے آنسو رو رہے تھے کیونکہ انہوں نے اپنے شہر میں امن، آشتی اور سکون کا موسم بھی دیکھا تھا اور اب وہ رنجیدہ خاطر ہو کر سوچ رہے تھے۔

لہولہان ہوا ہے ہر ایک چہرہ کیوں
کہ میرے شہر کا موسم تو تھا گلابوں کا

(ہم اجنبی ہیں: اشفاق حسین)

ان مسافروں کے لئے ہجرت کا سفر اس لئے بھی دشوار تھا کہ وہ جانتے تھے کہ شاید وہ کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے اور ان کے دوست، احباب اور رشتہ دار راہ تکتے رہ جائیں گے۔ وہ مسافر جب گھر سے نکلے تھے تو انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ مبادا ان کی ماؤں کی دعائیں اور آنسو ان کے پاؤں کی زنجیر بن جائیں۔

طاق پر جزدان میں لپٹی دعائیں رہ گئیں
چل دیئے بیٹے سفر پر گھر میں مائیں رہ گئیں

(غزال: افتخار نسیم)

لیکن وہ مجاہد اس حقیقت سے باخبر تھے کہ دنیا بھر میں صدیوں سے جب بھی کسی قوم کے عوام پر دائرہ حیات تنگ ہوا بہت سے شاعروں اور پیغمبروں نے ہجرت کی راہ اختیار کی۔

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

(حرف باریاب: افتخار عارف)

جہاں ہجرت کرنے والے قافلے میں ایسے مسافر شامل تھے جو حالات کی سختیاں مزید برداشت نہ کرسکتے تھے وہیں اس قافلے میں کچھ ایسے راہرو بھی چلے آئے تھے جنہوں نے یہ خبر سن رکھی تھی کہ سات سمندر پار ایک خوشحال اور آسودہ زندگی کا خزانہ موجود ہے اور وہ اس رنگین مستقبل کے خزانے کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے تھے۔

ایک جزیرہ اس کے آگے پیچھے سات سمندر

مات سمندر پار سنا ہے ایک خزانہ ہے

(مہر دونیم: افتخار عارف)

چنانچہ پچھلی چند دہائیوں میں مشرق کا ہر مہاجر اپنے خاندان، اپنے قبیلے اور اپنی دھرتی سے کٹ کر حالات کے سمندر میں اس طرح بہ نکلا جس طرح ایک پتہ اپنے درخت سے کٹ کر آندھیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔

چل دیا اک اور پتہ ٹوٹ کر
آندھیوں کے دوش پر تکیہ کیے

(زخم زخم اجالا: ظفر زیدی)

مشرق سے ہجرت کرنے والے مہاجر اپنے مسائل کی حدت کو پیچھے چھوڑ کر ایک خوشحال زندگی کے خنک خواب کا پیچھا کرتے کرتے مغرب کی سرزمین میں تو آنکلے لیکن آنے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ

خواب خستانہ و برفاب کے پیچھے پیچھے
گرمی شہر مقدر کے ستائے ہوئے لوگ
کیسی یخ بستہ زمینوں کی طرف آنکلے

(حرف باریاب: افتخار عارف)

اس نئی سرزمین، نئے شہر اور نئے گھر میں ان مہاجروں کو نئے مسائل، نئے مصائب، نئی تکالیف اور نئی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اس نئی بستی کی زبان تہذیب، روایت اور طرز معاشرت پرانی بستی سے بالکل مختلف تھی۔ اس نئے ماحول میں مہاجروں کو بے گھری، تنہائی، بیگانگی اور اجنبیت کا سامنا کرنا پڑا۔

پریم ڈگر پر چل کر میں نے کیا کھویا کیا پایا
کہ مجھ کو دھوپ ملی نہ چھایا

(زخم زخم اجالا: ظفر زیدی)

جو بھی اس شہر میں تنہا ہو گا
وہ مرے گاؤں سے آیا ہو گا

(ندائے امن: نزہت صدیقی)

اس نئے شہر میں مہاجروں کو اپنی ذات اور اپنے خاندان کی بقا کے لئے محبت، مزدوری، ملازمت یا کاروبار کی ضرورت تھی لیکن انہیں احساس ہوا کہ ان کی تعلیم اور تجربے کا جن پر انہیں مشرق میں بجا طور پر ناز تھا مغرب کی منڈی میں کوئی خریدار نہ تھا۔ مختلف قسم کے تعصبات ان مشکلات پر مستزاد تھے۔ ان مہاجروں کے لئے رزق کی سہولتوں کے بغیر ایک باعزت زندگی گزارنا مشکل تھا۔ چنانچہ رزق کی تلاش میں بہت سے مہاجروں کو اپنی عزت، اپنی انا اور اپنی خودداری، داؤ پر لگانی پڑی اور اپنے بچوں کے پیٹ کی خاطر ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔

کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا
جہان رزق میں توقیر اہل حاجت کیا
شکم کی آگ لیے پھر رہیں ہیں شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

(مہر دو نیم: افتخار عارف)

پیٹ کی بھوک تو قسمت نے مٹادی لیکن
کتنا ترسا کے دیا ایک نوالہ اس نے

(غزال: افتخار نسیم)

جوں جوں نئی دھرتی اور نئے شہر میں مہاجروں کے مسائل اور دشواریوں میں اضافہ ہوتا رہا وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگے۔ انہیں اپنے خاندان، اپنے دوستوں، اپنے رفیقوں اور اپنی دھرتی ماں کی یاد شدت سے ستانے

لگی اور وہ اپنے دلوں میں عجب سی بے کلی محسوس کرنے لگے۔

وطن کی یاد سر شام ہجر جب آئی
ابھرتا چاند بھی نوحہ کناں نظر آیا

(کف بہار: عرفانہ عزیز)

دل کو کچھ یوں مسلتی ہیں وطن کی یادیں
تولیہ نم کوئی جس طرح نچوڑا جائے

(دوسرا گھر: سلمان اختر)

وطن کی یاد ان کے بے گھری کے احساس میں اور بھی شدت پیدا کردیتی ہے اور شام کے وقت انہیں گھر کا خیال ستانے لگتا ہے۔

اک غول پرندوں کا ہے اور شام کا منظر
ایسے میں خیال آیا کوئی گھر نہیں اپنا

(ہم اجنبی ہیں: اشفاق حسین)

اور ساری ساری رات ہر نئے مہاجر سے دھرتی ماں کی بدحالی کے بارے میں سوال پوچھتے اور آنسو بہاتے۔

ہوتے ہیں ضمیروں کے سودے کیا آج بھی اونچی سطحوں پر
پردہ جو اٹھائے ان پر سے کیا ملک میں ان کی ہستی ہے
اے دیس سے آنے والے بتا کس حال میں میری بستی ہے

(برق وباراں: جوش مندوزئی)

ہجرت کے سفر میں وہ مرحلہ بھی آیا جب اس قافلے کے ایک گروہ نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا اس گروہ میں سے بعض اپنی دھرتی ماں کے آنول سے جڑے ہوئے تھے۔ بعض نئے شہر کے مسائل کا سامنا نہ کرپائے تھے۔ بعض اپنے

خاندانوں اور وطن کو چھوڑ کر احساس گناہ میں مبتلا تھے۔ اور بعض حب الوطنی کے جذبات سے سرشار تھے۔

باغ بغیچے میرے جب جب نذر لہو کی چاہیں
میری برکت والی مٹی مجھے بلانا بھولے ناں

(مہر دونیم: افتخار عارف)

وہ مہاجر جو واپس چلے گئے وہ پہلے تو اپنی ماں اور دھرتی ماں کو گلے لگا کر بہت خوش ہوئے۔

اپنے وطن کی بات عجب ہے اپنے وطن میں جب پہنچے
بام کو دیکھا، در کو چوما، دیواروں سے پیار کیا

(برف زار: عبدالقوی ضیا)

لیکن وہ خوشی اور مسرت عارضی ثابت ہوئی کیونکہ جب وہ ان گلیوں، بازاروں اور شہروں میں گھومے، جہاں انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے صبح وشام گزارے تھے تو انہیں اپنے گھر اور اپنے شہر میں بھی اجنبیت کا احساس ہونے لگا۔ ان کا ماحول ان کی غیر موجودگی میں بہت بدل چکا تھا اور وہ خود بھی کتنا بدل چکے تھے اس کا بھی انہیں اندازہ نہ تھا۔

گئے جو لوٹ کے گھر کو تو یوں ہوا محسوس
کھڑے ہیں اپنے ہی در پر مسافروں کی طرح

(برق و باراں :جوش مندوزئی)

ان مہاجروں کو نہ صرف اپنے شہر کی گلیاں اور بازار اور اپنے گھر کے در و دیوار عجیب و غریب لگے بلکہ وہ جب اپنے عزیزوں سے گلے ملنے گئے تو

اچانک اجنبیت کی دیوار راہ میں حائل ہو گئی۔

بہت سے جسموں کو چھو نہ پایا
جو بعد مدت کے گھر گیا میں

(دوسرا گھر: سلمان اختر)

ان مہاجروں کو یہ دیکھ کر بھی دکھ ہوا کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کے شہر کی حالت بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہو گئی ہے۔ وہاں کے عوام اب بھی محرومی اور مایوسی، ظلم اور استحصال کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں اور خوشحال زندگی کی منزل کی کوئی نشانی نظر نہیں آتی۔ انہیں یہ جان کر بھی افسوس ہوا کہ ظلم کرنے والے بھی اپنے ہی ہیں پرائے نہیں۔

سر بستہ زنجیر کیا ہم کو جنہوں نے
وہ لوگ اسی گھر کے ہیں باہر کے نہیں ہیں

(سپنے جاگتی آنکھوں کے: عابد جعفری)

ہمارا شہر تو چھوٹا ہے لیکن
ہمارے شہر کا مقتل بڑا ہے

(ابھی موسم نہیں بدلا: بخش لائلپوری)

اپنے پرانے گھر اور پرانے شہر میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد ان مہاجروں کو احساس ہوا کہ واپس اپنے گھر لوٹنے کا سفر خسارے کا سودا تھا جو خود فریبی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

دوسری ہجرت کی تیاری خود کو دھوکا دینا ہے

شاخ سے ٹوٹ کے گرنے والا پھول بھلا کب مہکا ہے

(ہم اجنبی ہیں: اشفاق حسین)

مہاجروں کے اس گروہ کے مقابلے میں جو واپس لوٹ گیا وہ گروہ جس نے مغرب کو اپنا گھر بنالیا ان کی اکثریت بھی جب ایک دوسرے سے ملتی تو پوچھتی۔

کیا شے تھی ایسی جو ہمیں گھر میں نہیں ملی
کس واسطے وطن سے بہت دور بس گئے

(دوسرا گھر: سلمان اختر)

وہ پھر ان تمام جگہوں کو یاد کرتی جہاں وہ اپنا فارغ وقت گزارا کرتی تھی۔

یہاں تو گھر ہے یا دفتر ہے یا ہے میخانہ
وطن میں اپنے کئی اور بھی ٹھکانے تھے

(دوسرا گھر: سلمان اختر)

نئے شہر میں رہنے کی آرزو اور پرانے شہر لوٹ جانے کی خواہش پہلی نسل کے بہت سے مہاجروں کی رگوں میں تضاد۔ کشمکش اور المیہ بن کر سرایت کرگئی۔ ان میں سے بعض یہ سمجھتے رہے کہ انہیں دھرتی ماں کو چھوڑنے کی سزا مل رہی ہے۔ ایسے مہاجر برسوں مغرب میں رہ کر بھی تنہائی، خوف، بے یقینی اور بے گھری کا شکار رہے نہ وہ نئے شہر کو گلے لگانا چاہتے تھے اور نہ ہی پرانے شہر کو لوٹ جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دن کو کانٹوں پر اور رات کو کروٹیں بدلتے گزار دیا تھا۔

وطن میں اجنبی باہر مہاجر
پلٹ جانے کا بھی رستہ نہیں ہے

(پس چہرہ: منیر جہاں)

گھر سے نکلے ہوئے بیٹوں کا مقدر معلوم
ماں کے قدموں میں بھی جنت نہیں ملنے والی

(حرف باریاب: افتخار عارف)

ان مہاجروں کو اپنے گھر کی جو خبر بھی ملتی وہ انہیں رنجیدہ کر دیتی۔

نہ جانے کون سی تعمیر میں خرابی تھی
کہ اپنے گھر کی جب آئی بری خبر آئی

(آدھی گواہی: نسیم سید)

اور انہیں اس بات کا اندازہ بھی تھا کہ جب ان کی حالت زار کی خبر ان کے عزیزوں کو ملتی تھی تو وہ بھی غمزدہ ہو جاتے تھے۔

گاؤں میں روئیں گے سب چھوٹے بڑے ایک ہو کر
جب مری آبلہ پائی کی خبر جائے گی

(سلمان اختر: دوسرا گھر)

آخر کار ان مہاجروں کی زندگی دیار غیر میں دن بدن بدتر ہوتی رہی، ان کے خواب چکنا چور ہو گئے اور انہوں نے کارزار حیات میں اپنی شکست کو قبول کر لیا۔

ایسی شکست تھی کہ کٹی انگلیوں کے ساتھ

کانٹوں کا ایک ہار پرونا پڑا مجھے

(غزال: افتخار نسیم)

پیدل سوار

ہم کہ شطرنج کے مہروں کی طرح
وقت سنگین بساط
اور قدرت کی یہ طرفہ چالیں
کھیل ہی کھیل میں بس کام تمام

(مزید آوارگی: جاوید دانش)

مہاجروں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو ہجرت کے سفر کی دشواریوں اور باعزت زندگی گزارنے کی آزمائشوں کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکا۔ چنانچہ اس گروہ کے افراد نے اپنی عزت، اپنی انا اور اپنی خودداری سر بازار بیچ ڈالی اور ایک خوشحال اور آسودہ زندگی اختیار کرلی۔ انہوں نے اپنے ضمیر کو سلادیا اور اپنی شرافت کو سنگسار کردیا اس طرح انہوں نے بیسویں صدی کی کاروباری اور سطحی زندگی کو قبول کرلیا۔ انہوں نے مالی اور مادی خوشیوں کو روحانی کرب اور قربانیوں پر ترجیح دی اور وہ مہاجر جنہیں اپنی شرافت پر ناز تھا آہستہ آہستہ اپنے آدرشوں سے دستبردار ہوگئے۔ دنیا بدلنے گھر سے نکلے تھے راستے میں خود ہی بدل گئے۔

اترن پہن کے اتراتے ہیں کچھ لوگ
اور میں روح کی عریانی سے ڈرتا ہوں

(بے نشاں: شاہین)

دنیا

اب یاد نہیں سینے میں کہیں
اک سورج تھا سو ڈوب گیا
اب اپنا دل ہے کھوٹ بھرا
دنیا کو بدلنے اٹھے تھے
دنیا نے بدل ڈالا کہ نہیں

(زندہ پانی بچا: ساقی فاروقی)

جب ہم مہاجروں کے اس قافلے کا جو کئی دہائیوں سے مشرق سے مغرب کی طرف سفر کر رہا ہے سنجیدگی سے مطالعہ اور تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس قافلے کا ایک گروہ مغرب میں چند برس رہنے کے بعد واپس مشرق چلا گیا۔ دوسرا گروہ مغرب میں رہا لیکن نہایت پریشان حال رہا اس نے ہجرت کے مصائب کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اور حالات سے شکست قبول کرلی۔ تیسرے گروہ نے زندگی کے آرام و آسائش کے لیے اپنے ضمیر اور انا کے سودے کر ڈالے۔ لیکن مہاجروں کا چوتھا گروہ ایسا بھی تھا جو گھر سے نکلتے وقت کشتیاں جلاکر اور دھرتی ماں سے اپنا آنول کاٹ کر نکلا تھا۔ اس گروہ کے افراد روشن مستقبل، درخشاں نصب العین اور بہتر زندگی کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لیے تیار تھے۔ ان کی ہمتیں جوان تھیں اور ارادے مصمم۔ وہ نئی دنیا کے مصائب کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا۔

ہم جب اپنے گھر سے نکلے تھے
اچھا برا سب سوچ سمجھ کر نکلے تھے

(زخم زخم اجالا: ظفر زیدی)

وہ ہجرت کے سفر میں اتنے دور آگئے تھے کہ انہیں واپس جانے کی بھی کوئی خواہش نہیں تھی۔

اب گھر بھی نہیں گھر کی تمنا بھی نہیں ہے
مدت ہوئی سوچا تھا کہ گھر جائیں گے اک دن

(زندہ پانی سچا: ساقی فاروقی)

ان مہاجروں کے لیے ہجرت کا تجربہ نئے راستوں، نئی منزلوں اور نئے آدرشوں کی تلاش کا تجربہ تھا اور وہ اس راستے میں ہر آزمائش کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔

اس نئے سفر میں جس امتحان سے ان کا سب سے پہلے واسطہ پڑا وہ ان کی اپنی ذات تھی۔ انہیں جلد اندازہ ہو گیا کہ ان کی اپنی شخصیت ہی ہر موڑ پر دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی تھی انہیں آہستہ آہستہ اس حقیقت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ ماضی کی یادوں، حال کی چکاچوند اور مستقبل کے خوابوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی ذات کی پہچان اور اپنی صلاحیتوں کا عرفان نہایت ضروری ہے۔ ہجرت کے تجربے نے ان پر یہ منکشف کیا تھا۔

اپنی ذات سے غافل ہوں
آنکھیں ہیں اور اندھا ہوں

(تلاش: خالد سہیل)

ابھرے گا اپنی ذات کی پہچان کا سوال
گہرے سمندروں میں نہ جھانکا کرے کوئی

(ہم اجنبی ہیں: اشفاق حسین)

اس آگہی کے سفر کے مسافر پہلے تو اوروں سے اپنے بارے میں پوچھتے رہے اور کسی رہنما کی تلاش میں رہے۔

میں کون ہوں کیا ہوں میری پہچان بتا دے
میں کھوج میں ہوں کوئی مجھے میرا پتا دے

(ندائے امن: نزہت صدیقی)

لیکن انہیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ سفر خارجی نہیں داخلی ہے اور اس سفر میں انسان رہبروں اور رہزنوں سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ کیونکہ اسے اپنے دل کی آواز اور اپنے شوق کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

شوق خود راستہ دکھاتا ہے
رہبری راہبر پہ ختم نہیں

(برف زار: عبدالقوی ضیا)

چونکہ یہ سفر انسانوں کو اپنی ذات کی گہرائیوں اور تاریکیوں میں کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے اس سفر میں بہت سے مسافر گھبرا کر لوٹ آتے ہیں کیونکہ ان کی آنکھیں پتھرانے لگتی ہیں۔

اس شب خود آگہی میں آئینے بولا کئے
جیسے پتھرانے لگی خود میرے ہی اندر کی آنکھ

(اندمال: حمیرا رحمان)

اس سفر میں انسانوں کو اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ سے واسطہ پڑتا ہے جو ایک تکلیف دہ عمل ہے۔

یک رنگی رسوم سے دل جوڑنا بھی ہے
اندر کا قفل زنگ زدہ توڑنا بھی ہے
تعمیر کر کے دیکھنا ہے اپنے آپ کو
اور اس نگاہ سے کہ اسے چھوڑنا بھی ہے

(تیرے شہر وصال میں: افضال نوید)

اس جانگسل سفر کے لئے فارغ وقت اور تنہائی کے لمحات کی اشد ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان اپنی زندگی اور ذات کے بارے میں سنجیدگی سے

سوچ سکے۔

اپنے بارے میں ذرا دھیان سے سوچا جائے
آج کا دن یونہی چپ چاپ گزرا جائے

(دوسرا گھر: سلمان اختر)

اس دشوار گزار سفر پر چلتے چلتے مہاجروں کو احساس ہو گیا کہ انہیں اپنے مقصد تک پہنچنے اور بصیرتوں کو پانے کے لئے کچھوے کی چال چلنا پڑے گا۔ کیونکہ انہیں ایک میراتھون رنر (Marathon Runner) کے صبر اور حوصلے کی ضرورت پڑے گی۔ اگر وہ خرگوش کی چال چلے تو جلد ہی راستے میں تھک کر سو جائیں گے اور منزل سے محروم رہ جائیں گے۔

اپنے جذبات خموشی سے مجھے سہنے دو
پھل یہ کچے ہیں انہیں پیڑ پہ ہی رہنے دو
ایک دن اپنے سمندر سے ملا دے گا مجھے
مجھ کو احساس کے دریا میں ابھی رہنے دو

(دوسرا گھر: سلمان اختر)

جب مہاجر اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترے تو ان میں سے بعض کا اپنے احساس کمتری سے تعارف ہوا وہ احساس جن سے وہ آنکھیں کترا کر نکل جانے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ ہر موڑ پر ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا تھا۔

کچھ اور بڑھ گیا میرا احساس کمتری
کچھ بھی نہ مل سکا مجھے اونچی اڑان سے

(غزال: افتخار نسیم)

وہ اس حقیقت سے بھی آشنا ہوئے کہ جب انسان خود اعتمادی کی دولت سے محروم ہو جائے تو وہ اپنے دل کی سرگوشیاں سننے کی بجائے دوسروں کے کہے

پر بھیڑ چال چلنا شروع کر دیتا ہے اور پھر بعد میں پچھتا تا ہے۔

خود کو ہجوم دہر میں کھونا پڑا مجھے
جیسے تھے لوگ ویسے ہی ہونا پڑا مجھے

(غزال: افتخار نسیم)

خود اعتمادی کے فقدان سے انسان بہت سے خانوں میں بٹ جاتا ہے اور ایک داخلی تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔

ہیں اتنی شخصیتیں میری ذات میں پنہاں
محال ہے مرا بچنا کسی تصادم سے

(بے نشاں: شاہین)

اس داخلی سفر کے مسافروں کو یہ بصیرت حاصل ہوئی کہ ان کا دشمن کوئی غیر نہیں بلکہ ان کی اپنی ہی ذات ہے اور جب تک وہ اس داخلی جنگ کو ختم کر کے اپنی ذات سے صلح نہیں کریں گے وہ امن، سکون اور آشتی کو حاصل نہ کر پائیں گے۔

زمانہ ہوگیا خود سے مجھے لڑتے جھگڑتے
میں اپنے آپ سے اب صلح کرنا چاہتا ہوں

(مہر دو نیم: افتخار عارف)

ان مہاجروں کو یہ بھی احساس ہوا کہ بیسویں صدی کے دیگر انسانوں کی طرح انہیں بوسیدہ روایات و اقدار کا سراغ لگانا پڑے گا اور ایک دفعہ پھر گناہ کا سہارا لینا پڑے گا۔ پہلا گناہ انہیں جنت سے زمین پر لے آیا تھا اور اب دوسرا گناہ انہیں اس زمین پر جنت بنانے میں مدد کرے گا۔ بیسویں صدی کا انسان اس نفسیاتی حقیقت سے آگاہ ہو گیا ہے کہ۔

مجھے گناہ میں اپنا سراغ ملتا ہے

وگرنہ پارسا و دیندار میں بھی تھا

(زندہ پانی سچا: ساقی فاروقی)

گناہ

اسی نے چہرے کو تنویر میرے بخشی ہے
اسی نے چاند مری روح میں اتارا ہے
میں اعتماد کا پیکر بنا تو جان گیا
مرے گناہ نے کتنا مجھے سنوارا ہے

(خالد سہیل)

ذات کے اس سفر میں جب مہاجر اپنی روح میں اترنے میں کامیاب ہوگئے تو ایک طرف انہوں نے اس آگ کو دریافت کیا جو ایک نئی روشنی اور توانائی کا ماخذ تھی ۔

ہر طرف ٹوٹ پھوٹ جاری تھی
ایک کہرام میرے اندر تھا
ایک دوزخ تھا میرے سینے میں
جس سے چہرا مرا منور تھا

(زندہ پانی سچا: ساقی فاروقی)

اور دوسری طرف انہوں نے وہ سمندر تلاش کیا جو اپنے تمام تر طوفانوں کے باوجود اپنی آغوش میں گوہر مقصود لئے ہوئے تھا اور انسان کو خوداعتمادی کا پیکر بنانے کے لئے کافی تھا۔

یہ بیتاب موجیں اٹھیں گی وہ طوفان آئے گا اک دن
مجھے چاند کھینچے گا اک دن کہ مجھ میں سمندر چھپا ہے

زندہ پانی سچا: ساقی فاروقی)

جب مہاجروں نے خوداعتمادی حاصل کرلی تو انہیں اپنی ذات کے ساتھ ساتھ ان گناہوں پر بھی فخر ہونے لگا جن کے بغیر وہ کبھی منزلوں سے بغل گیر نہ ہوتے۔ یہ گناہ بیسویں صدی کے ان جدید انسانوں کے گناہ تھے جو روحانی صوفیا کی طرح دنیاوی سودوزیاں سے بے نیاز روایتوں کے بت توڑتے ہوئے عرفان کی نئی منزلیں تلاش کررہے تھے۔

ایک بہتر زندگی کی تلاش میں اپنی ذات سے نبرد آزما ہونے کے بعد مشرقی مہاجروں کو جس مسئلے سے واسطہ پڑا وہ انسانی رشتے تھے۔ انہوں نے ان رشتوں کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی کیوں کہ انہیں اندازہ تھا کہ روایتی رشتوں نے انسان کے ذہن اور قلب پر گناہ و ثواب کے نام پر بہت سی زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔

اس سفر میں مہاجروں کو اندازہ ہوا کہ مشرقی طرز حیات میں انسانی رشتوں کے جسمانی پہلو کو نظر انداز کیا گیا تھا اور جسمانی خوشیوں اور لذتوں سے کنارہ کشی کی ترغیب دی گئی تھی۔ مغرب میں زندگی گزارنے سے ان مہاجروں نے انسانی جسم کا ازسرنو احترام کرنا سیکھا اور انہیں احساس ہوا کہ اگر انسانی رشتے معتبر اور مخلص ہوں تو جسمانی رشتے انسانی آزادی میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔

محبتوں میں ہمارے بدن ہوئے آزاد
غرور ٹوٹ گیا روٹھنے منانے کا

(زخم زخم اجالا: ظفر زیدی)

ہر تیرگی مٹادی اندھیرے مٹادیے
اس کے بدن نے رات میں سورج اگادیے

(دوسرا گھر: سلمان اختر)

مشرقی سوچ اور شاعری کا یہ خاصا رہا ہے کہ اس میں فراق کے تجربے

پر تو بہت توجہ مرکوز کی گئی ہے لیکن وصل کے لمحات کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ یہ رویہ مشرقی ماحول اور طرزِ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ جس میں مردوں اور عورتوں کے آپس میں کھل کر ملنے پر بیسیوں پابندیاں عائد رہی ہیں۔ مغرب میں چونکہ ایک آزادانہ فضا قائم ہے اس لیے مرد و زن کا آپس میں ملنا آسان ہے اور محبوبوں کے لیے وصل کے لمحات سے محظوظ ہونے پر پابندیاں بہت کم ہیں۔

آج رکھ دیا میں نے سر کشادہ سینے پر
زندگی کو یاد آئے دل کے زیر و بم جیسے

(کفِ بہار: عرفانہ عزیز)

ہجر میں جسم کے اسرار کہاں کھلتے ہیں
اب وہی سحر کرے پیار سے آکر لے جائے

(زندہ پانی سچا: ساقی فاروقی)

مغرب میں اگرچہ رومانوی اور جنسی رشتے قائم کرنا آسان تھا لیکن وہ رشتے نفسیاتی اور جذباتی مسائل سے الجھے ہوئے تھے اور وہ مسائل مجبوریاں بن کر رشتوں کے چاند اور سورج کو گرہن لگاتے رہتے۔

اپنے ٹھٹھرے ہوئے جذبات کی مجبوری سے
اجنبی جسموں سے قربت کی ردائیں مانگیں

(تلاش: خالد سہیل)

اپنی مجبوری بتاتا رہا رو کر مجھ کو
وہ ملا بھی تو کسی اور کا ہو کر مجھ کو

(غزال: افتخار نسیم)

مغرب میں رومانوی رشتوں کا المیہ یہ تھا کہ ان میں فراوانی تو تھی پائداری نہ تھی جذبات کی شدت تو تھی وفاداری نہ تھی اور وہ محبوب جو آج

زندگی کا محور ہوتے کل اجنبی بن جاتے۔

شب وصال سے بڑھ کر فراق کیا ہوگا
وہ مل رہا ہے گلے جو نہیں مقدر میں

(سپنے جاگی آنکھوں کے: عابد جعفری)

اور وہ رشتے جب ٹوٹتے تو مشرقی محبوبوں کے دل ٹوٹ جاتے۔ وہ مدتوں زخم چاٹتے رہتے اور ماضی کی یادوں سے ان کے ماتھوں پر ندامت اور شرمندگی کے قطرے ابھر آتے۔

ایک لمحے کی طلب نے کس طرح رسوا کیا
سوچتا ہوں اور ہوتی ہے پشیمانی مجھے

(غزال: افتخار نسیم)

شہر رومان کی سیر کرتے کرتے مہاجر محبوبوں کو احساس ہونے لگا کہ انسانی رشتے اتنے گنجلک اور پر اسرار ہیں کہ اکثر لوگ نہ تو ان کی تہوں تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی باریکیوں کو سمجھ پاتے ہیں۔ اور ان کے لیے اپنے رشتوں کو سمجھے بغیر ان کو نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

مرے لیے تو سدا تار عنکبوت رہا
میں سوچتا ہوں وہ رشتہ نبھا گیا کیسے

(سپنے جاگتی آنکھوں کے: عابد جعفری)

بعض دفعہ نئے رشتے پرانے زخموں کو بھی تازہ کر دیتے ہیں

تازہ رفاقتوں کے حسیں ناخنوں کے ساتھ
ماضی کے سارے زخم کریدا کرے کوئی

(آزاد فضائیں: خالد سہیل)

مغرب کے شہر رومان میں بہت سا وقت گزارنے کے بعد مشرقی

محبوبوں کو یہ احساس ہوا کہ انہیں انسانی رشتوں کے بارے میں ایک حقیقت پسند رویہ اپنانا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے محبوبوں سے دوستی کا رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی اور انہیں ترغیب دی کہ وہ مثبت جذبوں کے ساتھ ساتھ منفی جذبات کا بھی اظہار کریں۔

مجھ سے نفرت ہے اگر اس کو تو اظہار کرے
کب میں کہتا ہوں مجھے پیار ہی کرتا جائے

(غزال: افتخار نسیم)

اور شوہر بھی ہوتا ہوں
ہر رات اس سے
جسے زندگی کی حرارت سے موسوم کرتا ہوں
کہتا ہوں............ناراض کس لیے ہو
اگر مجھ سے حال دل کا نہیں کہہ سکو گی
تو کس سے کہو گی

(نئی پرانی نظمیں: فاروق حسن)

تاکہ عشق اور محبت کی عمارت خلوص اور بے تکلفی کی بنیادوں پر استوار ہو سکے وہ انسانی رشتوں کو اس مقام پر لانا چاہتے تھے جہاں دو محبوب آقا اور غلام بننے کی بجائے دو دوست اور دو ہم سفر بن جاتے ہیں۔

مغرب میں طویل زندگی گزارنے کے بعد مشرقی محبوبوں کو یہ احساس ہوا کہ دوستی اور احترام وہ جذبے ہیں جو انسانی رشتوں کو صحت اور پائداری بخشتے ہیں۔ اگر محبت کا رشتہ دوستی کی بنیاد پر قائم ہے تو عشق کی آگ کے ٹھنڈے ہونے کے بعد بھی وہ خلوص کی خوشبو سے مہکتا رہے گا اور دو محبوب رومانوی رشتے کے ختم ہونے کے بعد بھی دوستوں کی طرح ملنے میں کامیاب ہوں گے۔

اب وہ محبوب نہیں اپنا مگر دوست تو ہے
اس سے یہ ایک تعلق ہی بہر سو رکھو

(غزال: افتخار نسیم)

رومانوی رشتوں میں دوستی کی قدر کا سراغ لگانا انسانی رشتوں کے ارتقا کے سفر کی ایک اہم منزل ہے۔

انسانی رشتوں کے رومانوی اور ازدواجی پہلوؤں کی گتھیاں سلجھانے کے بعد مشرقی مہاجروں کو جس آزمائش کا سامنا کرنا پڑا وہ خاندانی زندگی کی روایت تھی۔ مشرق سے مغرب میں ہجرت کرنے والے مہاجروں کی اکثریت نے روایتی بڑے خاندانوں (Traditional Extended Families) میں پرورش پائی تھی جن کی اپنی مخصوص اقدار تھیں۔ جب انہیں مغرب کے چھوٹے اور غیر روایتی خاندانوں (Single Parent/Nuclear) سے واسطہ پڑا تو ان کے خاندانوں کے بارے میں نظریات، خیالات اور توقعات بہت مجروح ہوئے۔ ایک طرف وہ اپنے خاندانوں سے بہت دور آچکے تھے اور دوسری طرف انہیں نئے ماحول سے جن محبت، خلوص، قربت اور قربانی کے جذبوں کی توقع تھی وہ نہ ملے تو ان کی امیدوں، آرزوؤں اور خوابوں کے شیش محل چکنا چور ہوگئے۔

ہم کو ہر رشتے سے جنت کی تھی امید پر اب
خاندانوں کے جہنم میں جلے ہیں چپ ہیں

(آزاد فضائیں: خالد سہیل)

ہجرت کے اس سفر میں بعض مہاجر خاندان بہت سے جذباتی، معاشرتی اور معاشی مسائل کا شکار ہوگئے اور ...... بہتر زندگی کے خواب، شناخت کی تلاش، معاشرتی بے اطمینانی عدم تحفظ کا احساس اور دو ثقافتوں کے درمیان تضادات ان کی زندگیوں میں زہر گھولنے لگے۔ جن کی علامتیں مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے

لگیں۔

بعض نوجوان جوڑے ایک دوسرے سے بات بات پر لڑنے جھگڑنے لگے۔

کھل کے دونوں لڑ رہے تھے اک ذرا سی بات پر
روکنے کے واسطے گھر میں کوئی بوڑھا نہ تھا

(زخم زخم اجالا: ظفر زیدی)

بعض والدین اپنے ہمسائیوں سے معمولی معمولی باتوں پر الجھنے لگے۔

بچے کھیل ہی کھیل میں لڑ کر ایک ہو جاتے ہیں
اور ان کی خاطر ٹھن جاتی ہے ماؤں کے بیچ

(اندمال: حمیرا رحمان)

اور بعض بزرگ نرسنگ ہومز کی دہلیز پر جا بیٹھے اور انسانی رشتوں کی قربت اور حرارت سے محروم ہو گئے۔

نرسنگ ہومز

صبح سے آس کی دہلیز پہ جا بیٹھتے ہیں
دن ڈھلے یاس کو چوکھٹ سے لگا دیتے ہیں
جسم ہر عمر میں چاہت سے نمو پاتا ہے
ہو نہ رشتوں کی حرارت تو یہ مر جاتا ہے

(آدھی گواہی: نسیم سید)

مہاجر خاندانوں کا ایک اہم مسئلہ ان کے بچے تھے۔ مہاجر والدین اپنے بچوں کے بارے میں ملے جلے جذبات کا شکار تھے۔ ایک طرف وہ مشرقی والدین تھے جو مغرب کی نا آشنا زندگی اور اجنبی ماحول میں اکثر فکر مند رہتے۔

گڑیوں سے کھیلتی ہوئی بچی کی آنکھ میں

آنسو بھی آگیا تو سمندر لگا مجھے

(حرف باریاب: افتخار عارف)

انہیں احساس تھا کہ ان کے اپنے تضادات کی وجہ سے ان کے بچے متاثر ہو رہے ہیں اور ان کی جذباتی، تعلیمی اور اخلاقی زندگیاں مجروح ہو رہی ہیں۔

جو نسل واقف ہجرت تھی اس نسل کے بعد
نہ جانے آگئی کیوں ہجرتوں کے نرغے میں

(ہم اجنبی ہیں: اشفاق حسین)

مہاجر خاندانوں کے یہ بچے جب مغربی فضا اور ماحول میں جوان ہوئے تو وہ مشرقی شرم و حیا اور عزت اور احترام کی روایات سے بہت دور ہٹ گئے۔ جس کا ان کے والدین کو بہت دکھ ہوا۔

یہ بات بات پہ اب مجھ کو ڈانٹ دیتا ہے
دیار غیر میں بیٹا مرا جوان ہوا

(بادشمال: بخش لائلپوری)

جب مشرقی والدین مغرب کی زندگی کے مسائل اور تضادات کی شدت کا سامنا نہ کرسکے اور ان کی محبتوں نے تلخیوں اور شادیوں نے طلاقوں کا روپ دھار لیا تو ان کے معصوم بچے ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

طلاق یافتہ ماں باپ کے حسیں بچے
کبھی تو باپ کبھی اپنی ماں کے بچے ہیں

(تلاش: خالد سہیل)

مہاجر خاندانوں کے بچوں کو اپنے والدین کے مسائل سے بری طرح متاثر ہوتے دیکھ کر بعض حساس اور صاف گو اصحاب نظر کہنے لگے۔

ہمارے عہد کو وہ کرب آگہی کے ملے

بہت سے بچوں کو دیکھا ہے خودکشی کرتے

(آزاد فضائیں: خالد سہیل)

پریشان حال اور فکر مند والدین کے ساتھ ساتھ مشرقی خاندانوں میں ایسے والدین کی کمی بھی نہ تھی جو مغربی ماحول کی آزاد فضا سے خوش تھے اور ایسے ماحول میں والدین بننے پر شاد تھے۔

وہ لمحہ جب میرے بچے نے ماں پکارا مجھے
میں ایک شاخ سے کتنا گھنا درخت بنی

(حمیرا رحمان)

ایسے والدین اپنے بچوں کی پرورش سے بہت مطمئن تھے وہ جانتے تھے کہ ان کے بچے روایتی ماحول، فرسودہ روایات اور جابرانہ نظام کی بجائے ایک صحتمند اور لبرل ماحول میں پرورش پائیں گے جہاں نہ صرف ان کی تمنائیں اور آرزوئیں پوری ہوں گی بلکہ ان کے خواب بھی شرمندہ تعبیر ہوں گے اور جب وہ بچے اس ماحول میں جوان ہوں گے تو انسانیت کے مستقبل کے لئے ایک نئی روشنی اور آگہی کا پیغام لے کر آئیں گے۔ ایسا پیغام جو ارتقا کے سفر کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔

گھروں میں حسن محلوں میں آگہی لائیں
ہمارے بچے وہ جگنو جو روشنی لائیں

(تلاش: خالد سہیل)

اگرچہ ذہن ہیں چھوٹے پہ ہیں سوال بڑے
ہمارے بچے ہیں ہم سے ہزاروں سال بڑے
کھلی فضا جو ملی ہے تو کم سنی میں ہی
ابھر کے آنے لگے ذہن میں سوال بڑے

(ہم اجنبی ہیں: اشفاق حسین)

ہجرت کے سفر نے جہاں مہاجروں کو اپنی ذاتی، رومانوی اور خاندانی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے تیار کیا۔ وہیں اس تجربے نے ان کے سماجی شعور کو جلا بخشی۔ ان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور معاشرتی اور بین الاقوامی تضادات سے ایک نئے انداز سے روشناس ہوئے۔ ان مہاجروں کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ خاندان، اسکول یا معاشرے جو اپنے بچوں اور نوجوانوں کے ذہنوں میں نفرتوں، عداوتوں اور تعصبات کے بیج بوئیں گے وہ ایک دن اپنے اوپر عذاب نازل ہوتا دیکھیں گے۔

خاندانوں پہ عذاب آئے گا
نفرتیں خون میں بونا کیسا

(برف زار: عبدالقوی ضیا)

اور لوگ اتنا غیر محفوظ محسوس کریں گے کہ وہ اپنے گھروں کے دروازوں پر اپنے نام کی تختی لگاتے بھی گھبرائیں گے۔

چھکے گا رنگ و نسل کے داغوں کا سلسلہ
دروازے پر بھی نام نہ لکھا کرے کوئی

(ہم اجنبی ہیں: اشفاق حسین)

اگر تعصبات حد سے بڑھ جائیں تو انسانی رشتوں میں منافقت کی چنگاریاں سلگنے لگتی ہیں جو آہستہ آہستہ عداوت کے شعلوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔

عجیب لوگ ہیں اس شہر میں بنام وفا
ہوائیں دیتے ہیں اس شعلہ عداوت کو

(سپنے جاگتی آنکھوں کے: عابد جعفری)

اور اس آگ کو پورے شہر میں پھیلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

اک گھر سے پھیل سکتی ہے سارے گھروں میں آگ
جن بستیوں میں ہم ہیں وہ گنجان بھی تو ہیں

(متاعِ عزیز: عزیز الحسن)

اور ایک دفعہ یہ نفرتوں، عداوتوں اور تعصبات کے شعلے چاروں طرف پھیل جائیں تو لوگوں کے دلوں میں چھپے ہوئے سارے تاریک جذبے سانپ بن کر پھنکارنے لگتے ہیں اور پورے شہر میں قتل و غارت، جبر اور استحصال کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ یہ تضادات اور تعصبات اگر ملکی حدود کو پھلانگ جائیں تو بین الاقوامی رشتوں میں بھی تلخیوں کا زہر پھیلنے لگتا ہے اور ہمسائے ممالک دوستی کی بجائے دشمنی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔

ہمسائے بھی بن جاتے ہیں پھر خون کے پیاسے
اک حشر بپا رکھتے ہیں قوموں میں تضادات

(آزاد فضائیں: خالد سہیل)

جب حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو جائیں اور عوام نہ اپنے گھروں میں محفوظ محسوس کریں اور نہ ہی اپنے ملک میں انہیں امن اور سکون کا احساس ہو تو ان میں سے جو زیادہ باشعور ہیں وہ پوچھتے ہیں۔

تلاشِ امن ہے تو کس لئے ہیں بندوقیں
حدوں میں رہنا ہے تو اس قدر جہاز ہیں کیوں

(دوسرا گھر: سلمان اختر)

اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان ایک دوسرے سے رنگ، نسل، زبان اور مذہب سے ماورا ایک انسانیت کے رشتے میں بھی منسلک ہیں۔ وہ سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور اس ناطے سے ان کے دکھ بھی سانجھے ہیں اور سکھ بھی۔

انسانیت کے رشتے

زبان اس کی تھی لیکن سوال اپنا تھا
وہ اجنبی تھا مگر ہم خیال اپنا تھا
عجیب حال ہوا جب بھی حال اس کا سنا
زوال اس کا لگا یوں زوال اپنا تھا

(تلاش: خالد سہیل)

اور وہ مل کر اس دن کا خواب دیکھتے جب وہ انسانیت کی اکائی کو دریافت کرلیں گے اور انسانی رشتوں میں مفاہمت اور دوستی (Cooperation) کی بنیادیں مخالفت (Confrontation) کی نسبت زیادہ مستحکم ہوں گی۔

اہل زمین کے نام

ہم ایک ہیں
اگر ہم ایک ہیں تو کیوں نہ بڑھ کے ہاتھ تھام لیں
حصار درد میں کوئی شگاف پڑ ہی جائے گا
اگر ہم ایک ہیں
تو کیوں نہ امن اور صداقتوں کی راہ سے
مہرباں رفاقتوں کی راہ سے
اسی مقام پر چلیں جہاں سے ابتدا ہوئی
جہاں ہم ایک تھے

(ندائے امن: نزہت صدیقی)

ہجرت کے سفر میں مشرقی مہاجروں کو اندازہ ہوا کہ بیسویں صدی میں دنیا بھر کے انسانوں کے خدا، مذہب اور اخلاقیات کے ساتھ رشتوں میں نمایاں

تبدیلیاں آئی ہیں۔ ان انسانوں کو جو اپنے آپ کو زمین پر خدا کا نائب سمجھا کرتے تھے احساس ہوا کہ وہ ایک نامکمل تخلیق اور ادھورا خواب ہیں اور انہیں مکمل انسان بننے کے لئے ابھی بلوغت اور ارتقا کے کئی اور مراحل طے کرنے ہیں اور اس راستے میں ان کے خالق نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

تو مطمئن نہیں تو مجھے کب ہے اعتراض
مٹی تو پھر سے گوندھ مری پھر بنا مجھے

(دوسرا گھر: سلمان اختر)

کر کے تخلیق ہمیں بھول گیا ہو جیسے
پالنے والا کوئی اور خدا ہو جیسے

(بے نشاں: شاہین)

ان انسانوں نے جنہوں نے اپنے ذہنوں میں ایک مہربان، منصف اور سخی خالق کا تصور بسا رکھا تھا جب اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی تو انہیں انسانی زندگی محرومی، مایوسی، ناانصافی اور ظلم کے آسیب سے متاثر نظر آئی۔

سائل زیست کے دروازے پر کب سے کھڑا یہ دیکھ رہا ہے
بہرے کو اک گیت کا تحفہ اندھے کو اک پھول ملا ہے

(تلاش: خالد سہیل)

اسرار دو عالم

....

یہ بھی بجا ہے کہ جب کوئی نوزائیدہ
اپنی فاقہ زدہ ماں کی مرجھائی چھاتی سے مایوس ہو کر
تڑپتے ہوئے ایڑیوں کو رگڑتا ہے
اور آب زمزم تو کیا

ایک بھی بوند پانی کی لے کر فرشتے نہ آئیں
تو دل چیخ اٹھتا ہے
مذہب سے ایسے خدا سے ہمیں کیا

(دائرے: ابرار الحسن)

ان حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے انسان سوچنے لگے کہ یا تو خدا ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو اس کی حیثیت ایک خاموش تماشائی سے زیادہ کچھ نہیں۔ بیسویں صدی کے انسان اور خدا کے رشتے کا یہ المیہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی تنہائیوں میں اسیر ہوتے چلے جارہے ہیں۔

خدا کو چھوڑ دیا ہے فلک پہ انساں نے
کیا ہے ظلم بہت اس نے اپنے رب کے ساتھ

(غزال: افتخار نسیم)

مرا اکیلا خدا یاد آرہا ہے مجھے
یہ سوچتا ہوا گرجا بلارہا ہے مجھے

(زندہ پانی سچا: ساقی فاروقی)

جہاں بیسویں صدی میں خدا کے تصور میں تبدیلیاں آئی ہیں وہیں انسان کا مذاہب پہ ایمان بھی تنقید کا نشانہ بنا ہے۔ جن مذاہب کو پیغمبروں نے انسانی فلاح کے لئے پیش کیا تھا ان ہی مذاہب کو پیغمبروں کے پیروکاروں نے کاروبار بنالیا، سادہ لوح لوگوں کو جی بھر کے لوٹا اور حاکموں نے اپنے ظلم، جبر اور استحصال کے جواز کے طور پر پیش کیا۔

کوبہ کو ہوگئیں تعمیر عبادت گاہیں
جمع کرتے ہی رہے ہم تو مکاں کے پتھر

(سپنے جاگتی آنکھوں کے: عابد جعفری)

کھل گئی ہوگی دکاں شہر میں ہر معبد کی
اور معبود کی بازار میں بولی ہوگی

(تیرے شہر وصال میں : افضال نوید)

بیسویں صدی کے انسان اور خدا کے تصور کے درمیان بہت سے تضادات پیدا ہوگئے ہیں اور ان تضادات نے انسانوں کے دل میں کسک اور روح میں ایک بے چینی پیدا کردی ہے۔

کشاکش

وہ حجابوں میں پوشیدہ بکھرا ہوا
میں طلسم تجسّس کا مارا ہوا
بس خدا اور میں
اور کشاکش یہی روز و شب درمیاں
شرط اس کی اقرار پہلے کروں
شرط میری ہے دیدار میں کرسکوں
بس خدا اور میں
اور کشاکش یہی روز و شب درمیاں
بس کشاکش یہی روز و شب درمیاں

(دائرے : ابرار الحسن)

جوں جوں انسان خدا کی ذات کے بارے میں عقل، سائنس اور منطق کے حوالے سے سوچنے لگا اس کے ایمان میں کمی اور شک میں اضافہ ہونے لگا اور آخر کار وہ مذہب اور خدا کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا۔

رہبری چھوڑ دی عقیدوں نے
اب یقیں کم ہے اور قیاس بہت

(دوسرا گھر: سلمان اختر)

شروع شروع میں تو انسان مصائب اور تکالیف میں خدا کی طرف پلٹ کر دیکھتا رہا لیکن جب اس کا اپنی ذات پر اعتماد بڑھ گیا اور اس کی دہریت بلوغت کی سرحدوں کو چھونے لگی تو وہ کہنے لگا۔

لبوں پر ٹوٹتی امید کے نوحے تو آتے ہیں
مرا دل پھر بھی اے اشفاق سوئے رب نہیں آتا

(ہم اجنبی ہیں: اشفاق حسین)

آخر مغرب کے انسان نے نیٹشے (Nietsche) کی زبان میں

God is Dead

اوکٹاویاپاز(Octavio Paz) کی زبان میں

We all killed him together, you killed him and I killed him. We are all his murderers

اور برنارڈشا کی زبان میں

God is in the making

کا اعلان کر دیا۔

بیسویں صدی کے انسانوں کو آہستہ آہستہ اپنے انفرادی اور اجتماعی شعور پر اتنا بھروسہ ہونے لگا کہ انہوں نے آسمانوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعائیں کرنی چھوڑ دیں۔

وہ جان گئے کہ۔

کوئی فرشتہ مدد کے لئے نہ آئے گا
تو اپنے ذہن سے یہ واہمہ نکال ہی دے

(بادشمال: بخش لائلپوری)

انہوں نے اپنی زندگی گزارنے کے لئے آسمانی قوانین کی بجائے زمینی قوانین اور مذہبی اصولوں کی بجائے انسانی اصولوں کا سراغ لگایا اور اپنے ذہنوں میں انسان دوستی کا نیا نقشہ تخلیق کیا۔ ایسا نقشہ جو ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈال سکے گا جس میں انسان مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو کر عدل و انصاف، محبت و اخوت اور امن و سکون کی بنیادوں پر ایک معاشرہ تعمیر کر سکیں گے۔ ایسا معاشرہ جو سیکولر ہوگا اور اس میں انسانیت کے احترام کو بنیادی قدر تسلیم کیا جائے گا۔

جو خدا پر نہیں انسان پہ رکھتا ہو یقیں
دل کو اچھا لگا اس شخص کا کافر ہونا

(غزال: افتخار نسیم)

کسی کے دین و مذہب سے نہیں ہے واسطہ مجھ کو
عقائد کا نہیں میں آدمیت کا پجاری ہوں

(بادشمال: بخش لائلپوری)

مغرب میں آبسے مشرقی مہاجروں کو اپنے نظریات، اعتقادات اور فلسفوں کا تنقیدی اور معروضی انداز میں محاسبہ کرنے کے بعد اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہوئی کہ ان کا ایمان کہ وہ اشرف المخلوقات ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے کرہ ارض کی دیگر مخلوقات کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھنے کی بجائے حاکمانہ رویہ برتا ہے۔ خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ انہیں احساس ہوا کہ کرہ ارض پر زمین پر، جانوروں، ہوا میں پرندوں اور پانی میں مچھلیوں کو زندہ رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ انسانوں کو۔

بیسویں صدی کے انسانوں کو دھیرے دھیرے یہ شعور حاصل ہو رہا ہے کہ انسانیت کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف وہ اپنی ذات اور دوسرے انسانوں کے ساتھ بلکہ جانوروں پرندوں، پودوں، ہواؤں، سمندروں اور مچھلیوں

کے ساتھ بھی دوستانہ انداز میں رہنا سیکھیں اور انسانی ارتقا کے لئے اہم ہے کہ وہ انسان دوستی کے ساتھ ساتھ فطرت دوستی کا بھی رویہ اپنائیں ورنہ فطرت کے نظام (Ecosystem) میں اتنا بحران پیدا ہو جائے گا کہ ہر ذی روح کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور انسان خود اپنی اگلی نسلوں کی خودکشی یا قتل کا ذمہ دار ٹھہرے گا۔

مغربی مفکرین نے انسانوں کے تنگ نظر فلسفوں کے خلاف واشگاف الفاظ میں احتجاج کیا ہے۔ سٹین رو (Stan Rowe) اپنے مضمون Ecodiversity the key to Biodiversity میں لکھتے ہیں:

"Humanity has been Molesting Planet Earth in recent times taking its cue from a couple of thousand years of misconcieved religions and philosophies that beguilingly reinforced our natural species.selfishness, telling us what we wanted to hear (for we wrote the Holy Texts, the scriptures and then found them miraculously inscribed on stone or gold tablets or penned on paper). The not-surprising divine message is that people are the greatest the non-pareil, the summit of creation, made in the image of the deity, put here to own, use and manage the entire world and everything that is in it: The water, the land, the air and 30 million other species. In short, the cross anthropocentric (Greek) or homocentric (Latin) myth is widely popular, expressing the conviction that all creation is our birthright, our heritage, and we its intelligent and deserving stewards."

باشعور مہاجرین نے جانوروں، پرندوں، درختوں، مچھلیوں اور اپنے ماحول کی دیگر مخلوقات کے ساتھ غیر ہمدردانہ اور بعض دفعہ ظالمانہ رویوں کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی اور ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دی۔

میں شیر دیکھ کے پنجرے میں خوش نہیں ہوتا
کہاں گنوادی ہے بچپن کی سادگی میں نے

(غزال: افتخار نسیم)

یہ کس نے زہر گھولا پانیوں میں
کسے ان مچھلیوں سے دشمنی ہے

(خالد سہیل)

جھیلیں، پھول، پرندے، بادل اور آکاش
پوچھتے ہیں کب ان کا حق مجھ پر ہوگا

(ندائے امن: نزہت صدیقی)

مغرب میں آکر بس جانے والے مشرقی مہاجروں کو احساس ہوا کہ بیسویں صدی کے انسانوں کے لئے ماضی کی فرسودہ روایات سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ان کے لئے نئے خوابوں، نئے فلسفوں اور نئے آدرشوں کا سراغ لگانا بھی ضروری ہے۔ تاکہ اکیسویں صدی کے انسانوں کے لئے ایسا منشور تیار ہوسکے جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے اور انسانیت کے مستقبل کے لئے تخریب کی بجائے تعمیر کے پہلو اجاگر کرسکے۔

انہیں احساس ہوا کہ انسانوں کے لئے اپنی ذات، دوسرے انسانوں اور اپنی فطرت سے ایک ہم آہنگی (Harmony) پیدا کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ بھی اس کرہ ارض پر باقی مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں اور اگر انہوں نے دوسری قوموں اور باقی مخلوقات کے ساتھ امن اور آشتی کے ساتھ زندگی گزارنا نہ سیکھا تو ان کا ارتقا ہی نہیں ان کی بقا بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ مغربی دنیا میں ان مشرقی مہاجرین کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے جن کے دو زبانوں، دو تہذیبوں، دو ثقافتوں اور دو معاشروں میں رہنے کے تجربے نے (جن میں

سائنسدان، فلسفی، ادیب اور شاعر بھی شامل ہیں) ان کے داخل کی تیسری آنکھ کھول دی ہے۔ یہ تیسری آنکھ نہ صرف انہیں انسانی روح کی گہرائیوں میں اترنے میں مدد دیتی ہے بلکہ ایسی بصیرتیں بھی بخشتی ہے جن کے اعتماد پر وہ کہہ سکتے ہیں ۔

بخش ہمارا حرف صداقت
انسانی منشور بنے گا

(بادشمال: بخش لائل پوری)

سوچو تو وہ دن کتنا سندر ہوگا
جس دن سارا عالم اپنا گھر ہوگا

(ندائے امن: نزہت صدیقی)

ایسے مہاجرین نہ صرف انسان دوستی کی روشنی میں اپنی ساری عمر گزارنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ جہان فانی سے کوچ کرتے وقت یہ وصیت بھی کرجاتے ہیں

وصیت

میں جانتا ہوں
میں وہ شجر ہوں جس کو اک دن
کاٹ کے نیچے گرایا جائے گا......اور پھر
میرے جسم کو ٹکرے ٹکرے کر کے جلایا جائے گا
بے شک مجھے کوئی کاٹ دے میں ڈرتا نہیں
البتہ میری آخری خواہش پوری کی جانی چاہئے
مجھے جلانے کی بجائے...... میرے جسم سے
مشرق و مغرب کے بیچ بہنے والے

عداوت و کینہ کے گہرے دریا پہ
ایسا پل بنایا جائے، جہاں سے گزر کر
انسانیت، انسانیت کو گلے لگائے

(قطبین: نصر ملک)

نوٹ: اس مضمون میں شامل سب اشعار اور نظمیں مغرب میں بسنے والے اردو شاعروں کی تخلیق کردہ ہیں۔ خالد سہیل

☆
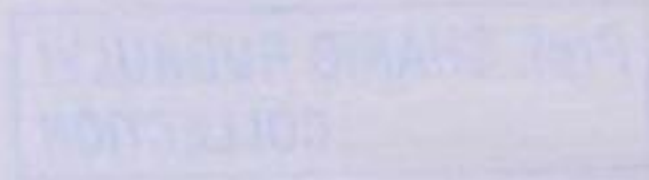
- ☆ ورثہ : (لوک کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ)
- ☆ امن کی دیوی: (مشرق وسطیٰ / خلیج ۹۰/۹۱ کی جنگ)
- ☆ پگڈنڈیوں پہ چلنے والے مسافر
  (ادبی مضامین تراجم، انٹرویوز وغیرہ)
- ☆ دھرتی ماں اداس ہے (افسانے)
- ☆ دریا کے اس پار (ناولٹ)
- ☆ میرے قبیلے کے لوگ (مضامین / انٹرویوز
- ☆ شائزوفرینیا (نفسیات)
- ☆ مذہب، سائنس اور نفسیات (تراجم اور مضامین)
- ☆ دو کشتیوں میں سوار (افسانے)
- ☆ ہر دور میں مصلوب : (LESBIAN اور گے ادب و زندگی)
- ☆ کالے جسموں کی ریاضت : (افریقی ادب)
- ☆ ایک باپ کی اولاد : (عرب / یہودی مسائل)

ڈاکٹر خالد سہیل کی تصانیف

☆ تلاش: (شاعری)

☆ زندگی میں خلا: (افسانے)

☆ بریکنگ دی چینز: (افسانوں کا انگریزی ترجمہ)

☆ اک پیر وچ زنجیر: (افسانوں کا پنجابی ترجمہ)

☆ سوغات: (بین الاقوامی کہانیوں کا اردو ترجمہ)

☆ بھگوان، ایمان، انسان: (فلسفیانہ مضامین کا اردو ترجمہ)

☆ مغربی عورت، ادب اور زندگی:
(مغربی خواتین ادیبوں کے افسانوں اور مضامین کا اردو ترجمہ)

☆ چنگاریاں: (افسانوں کا کیسیٹ)

☆ تاہ ہوا کا جھونکا: (شاعری کا کیسیٹ)

☆ ایک کلچر سے دوسرے کلچر تک: (مقالے کا کیسیٹ)

☆ ٹوٹا ہوا آدمی: (دوناولٹ)

☆ انفرادی اور معاشرتی نفسیات: (مضامین)